وَهُدُوٓا۟ إِلَى ٱلطَّيِّبِ مِنَ ٱلْقَوْلِ وَهُدُوٓا۟ إِلَىٰ صِرَٰطِ ٱلْحَمِيدِ (۱۷)

تعلیمات تصوف

قولِ طیّب

یعنی

ملفوظات مرشدی و مولائی حضرت الحاج صلاح الدین محمد الیاس برنی

ایم۔اے، ایل، ایل، بی (علیگ) چشتی قادری نقشبندی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ حیدرآباد دکن

مؤلفہ: الحاج محمد عبدالحلیم الیاسی چشتی قادری نقشبندی

ایم اے۔ ڈپ ایڈ (عثمانیہ)، مسجد پیر پاشاہ۔ دبیرپورہ۔ حیدرآباد۔ انڈیا

حسبِ فرمائش منیزہ فاطمہ بنتِ عرفان اللہ خاں

چیف انجینئر ٹیلی کمیونیکیشن حیدرآباد

اور سید نصیر الدین محسن

مطبوعہ ۔ ڈیلکس پرنٹر مہدی پٹنم حیدرآباد

ایڈیشن سوم ۔ (جملہ حقوق محفوظ) ۔ قیمت سولہ روپیہ ۔ دو ڈالر ۔ علاوہ ڈاک و پیکنگ

فہرستِ مضامین

فصول - تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ (۲/۸)

تمہید ص۱۷ تا ص۱۹ تبصرے ص۲۰ تا ص۲۳

فصلِ اوّل (ص۲۵ تا ص۴۵)

مقدمہ

فصلِ دوم (ص۴۶ تا ص۱۱۳)

توحید و رسالت

فصلِ سوّم ص۱۱۴ تا ص۱۷۳

توحیدِ افعالی - ربوبیّت

فصلِ چہارم (ص ۱۷۴ تا ص ۲۴۲)

تعبّد۔ تعظیم شعائرُ اللہ۔ تکریمِ مُقرّبین

فصلِ پنجم (ص۲۴۳ تا ص۲۹۹)

قرآن - بیعت و ارشاد - سلوکِ علمی - سلوکِ ذکری

عنوانات (۱ تا ۱۶   ۱۷ تا ۲۸   ۲۹ تا ۴۹)

فصلِ ششم صـــ ۳۰۱ تا صـــ ۳۲۰

ارکانِ اسلام۔ صفاتِ ایمان

فصلِ ہفتم (ص ۳۲۱ تا ص ۳۴۶)

کشف و کرامات۔ جنّات و شیاطین

عنوانات ۱ تا ۱۶ ، ۱۷ تا ۳۰

فصلِ ہشتم (ص ۳۴۷ تا ص ۳۹۵)

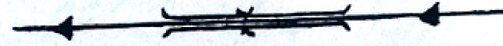
اِصلاحِ معاشرت

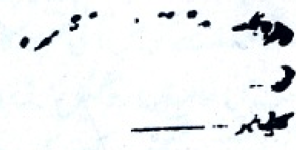
فصلِ نہم (ص ۳۹۹ تا ص ۴۱۵)

حضرت کے تعلقات

فصلِ دہم (ص ۴۱۶ تا ص ۴۲۴)

حضرت کی خصوصیات





بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

بفضلہٖ تعالیٰ "قولِ طیّب" کی طباعت پہلی دفعہ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے آخر میں عمل میں آئی۔ الحمدللہ اس کتاب کو "قبولِ حسن" عطا ہوا۔ کتاب ملک کے مختلف گوشوں میں بہت جلد پھیل گئی۔ حتیٰ کہ دیگر ممالک میں بھی اس کی اشاعت ہوئی۔ ہندوستان و پاکستان اور بعض دیگر ممالک کے علماء اور اخبار و رسائل نے اس پر تبصرے لکھے، تقریظیں لکھیں، جن کے اقتباسات، مشتے نمونے از خروارے صفحات (۲۰ تا ۲۲) پر درج ہیں۔ اِن کے ملاحظہ سے حضرت مولانا الیاس برنی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کی مقبولیت و افادیت اور عظمت کا اندازہ ہوسکے گا۔

غرض یہ کہ دین و نعمتِ اسلام و ایمان، قرب و احسان میں کتابِ مبین کی جو تعلیم و تفہیم ہے۔ معاشی، معاشرتی اور عمرانی اقدار و مسائل میں قرآن مجید نے جو ہدایت و بصیرت عطا کی ہے۔ اور معاش و معاد (دنیا و آخرت) کے مسائل میں اسلام نے فلاح و کامرانی کا جو راستہ انسانیت کو بتایا ہے۔ زندگی کے ان تمام علمی و عملی مسائل کو حضرت قبلہ برنیؒ نے قرآنِ کریم کی روشنی میں جس دلکش، مؤثر اور سہلِ ممتنع انداز میں بیان فرمایا ہے، صاحبِ ذوق، اہلِ علم، اہلِ دل حضرات نے اس کی خوب خوب داد دی۔ حتیٰ کہ مختلف حلقوں سے تقاضا ہوا کہ اسلام اور قرآنِ حکیم کی علمی و عملی تعلیمات کی اِس تشریح و تفہیم کو دیگر ممالک میں بھی استفادہ کے لئے پیش کیا جائے۔ خصوصاً یورپ اور امریکہ میں۔ اور اس غرض کے لئے دوسری زبانوں، بالخصوص انگریزی اور

عربی میں ترجمے کرائے جائیں۔ چنانچہ بفضلہ اہلِ علم، صاحبِ ذوق مخلصین کے تعاونِ عمل سے اس کے انگریزی اور عربی ترجموں کا کام شروع ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ حُسن و خوبی سے تکمیل فرمائے۔ (آمین) تراجم کی تکمیل کے بعد انشاءاللہ کتاب سے مضامین انتخاب کر کے اِن ممالک کے اندازِ فکر و بیان کے لحاظ سے ترتیب دے کر شائع کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں فرانسیسی، جرمن، روسی، فارسی، ہندی، تلنگی، مرہٹی، کنڑی اور دیگر زبانوں میں بھی ترجموں کا مرحلہ درپیش ہے۔

جو اہلِ علم اور اصحابِ خیر اس سلسلے میں ہاتھ بٹا کر پیامِ قرآنی کی اشاعت میں حصہ لینے کا ولولہ رکھتے ہوں، وہ مؤلف سے راست مراسلت فرمائیں۔ اگر قولِ طیّب یا قولِ طیّب کے ترجموں کی طباعت و اشاعت کے مرکز قائم کرنا چاہیں تو ذمہ دار ایجنسیوں کو مناسب شرائط پر اجازت دی جائے گی۔ خوب ہو کہ مالدار اہلِ خیر حضرات اس قسم کے تبلیغی لٹریچر کو دیگر ممالک میں ہدیۃً بلا قیمت تقسیم کرنے کی سعادت حاصل کرنے کا جذبہ دکھائیں اور اللہ، رسولؐ سے اجر حاصل کریں۔

طبعِ اول کے کافی نسخے ہدیۃً تقسیم ہوئے اور باقی قیمتاً ختم ہونے پر جب مانگ جاری رہی تو طباعتِ دوم کی نوبت آئی۔ طباعتِ اول خاص حالات میں بہت عجلت سے عمل میں آئی تھی۔ کافی اہتمام کے باوجود کہیں کہیں کتابت و طباعت میں خامیاں رہ گئیں۔ زود نویسی میں مسوّدے میں بھی کہیں کہیں فروگذاشتیں رہ گئیں۔ کہیں کہیں حوالے چھوٹ گئے۔ ......

...... طبعِ دوم میں ان سب امور کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ جو اصلاح و ترمیم عمل میں آئی ہے۔ اکثر و بیشتر برادرم عبدالخالق خاں صاحب کے قیمتی مشوروں کی رہینِ منّت ہے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے جزیل عطا فرمائے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر ہمیں سرفراز فرمائے۔ (آمین)۔

طبعِ اوّل میں عجلت میں چند اہم نوٹ شریک ہونے سے رہ گئے تھے۔ چنانچہ طبعِ دوم میں بعض عنوانات کے تحت حضرت کے بعض اہم ارشادات اور بعض تحریرات کے اقتباسات کا اضافہ کیا گیا۔ غرض کہ ادبیت، معنویت اور وضاحتِ مسائل کے لحاظ سے کتاب اب اور نکھر گئی گویا قطعی اور آخری شکل اختیار کر گئی۔

اس کتاب کے مضامین زندگی کے مختلف پہلوؤں کو حاوی ہیں۔ اختلافِ ذوق کے لحاظ سے کسی کو کسی پہلو سے زیادہ دلچسپی ہو سکتی ہے اور کسی پہلو سے کم۔ اس لئے کتاب کے مطالعہ میں مناسب یہ ہوگا کہ جس فصل کے مضامین سے زیادہ دلچسپی ہو پہلے اُن کا مطالعہ کر لیا جائے۔ اس طرح جن اصحاب کو تصوّف و سلوک اور قرب و احسان کے مسائل سے زیادہ واقفیت نہ ہو اُن کے لئے مناسب ہوگا کہ فصلِ اول کے مطالعہ کے بعد دسویں فصل پھر نویں فصل کا مطالعہ کریں اور اسی طرح آخر سے اوّل کی طرف آئیں۔ اس طرح انشاءاللہ اس تعلیم سے ذہن و قلب کو تدریجی مناسبت حاصل ہو سکے گی اور کتاب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ انشاءاللہ قرآنی دقائق و معارف سے ربط بڑھتا جائے گا۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ۔ (یٰسٓ)

اللہ کا فضل و کرم ہے کہ یہ کتاب عوام اور خواص میں اس درجے مقبول ہوئی کہ تین چار سال میں اِسکے دونوں ایڈیشن ختم ہو گئے۔ مانگ کا یہ عالم کہ نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ بیرونی ممالک سے بھی مسلسل آرڈروں کا سلسلہ جاری ہے۔ قرآن مجید رومن اور قرآنی عربی لٹریچر کے تراجم و طباعت کی مصروفیات ایڈیشن سوم میں مانع رہے جس کے لئے طالبین سے معذرت خواہ ہوں۔

اس لٹریچر کی طباعت کے سلسلے میں، میاں شاہد حسین، محبی عرفان اللہ خان، میاں سید نصیرالدین تحسین، میاں تاج احمد خاں وغیرہ نے جس جذبۂ اخلاص و سعی سے حصہ لیا، اُن کے لئے دُعا ہے اللہ تعالیٰ جزائے جزیل عطا فرمائے۔ آمین

38/ مسجد پیر پاشا۔ دروازہ دبیر پورہ حیدرآباد 23۔ شبِ معراج ۱۴۰۳ھ۔ محمد عبدالحلیم الیاسی غفر لہٗ و لوالدیہ

قولِ طیّب

(یعنی)

ملفوظاتِ مولٰنا الیاس برنی رحمۃ اللہ علیہ

مُؤلّفہ

عبدالحلیم الیاسی ایم۔اے کے متعلق مشاہیرِ عالم کے تبصروں کے اقتباسات

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں — صدر جمہوریۂ ہند، نئی دہلی

میں صاحبِ ملفوظات مولٰنا الیاس برنیؒ کا شاگرد رہا ہوں۔ آپ نے خوب کیا کہ ان کے ملفوظات مرتّب فرمادیئے۔ یہ کتاب نہایت اہم مطالب پر حاوی ہے۔ اور یقین ہے کہ پڑھنے والوں کے لئے تقویتِ ایمان اور ہدایت کا باعث ہوگی۔ اس تالیف پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

(۲) مولٰنا عبدالماجد دریابادی — مدیرِ صدق لکھنؤ

شاہ الیاس برنی (علیگ) ایم۔اے۔ ال۔ال۔بی ماضی قریب کی ایک عجیب جامع الجہات شخصیت تھے۔ مناظرہ، کلام، تجوید، شاعری، معاشیات وغیرہ خدا معلوم کتنے علوم میں صاحبِ تصنیف۔ اور تصوّف وسلوک میں تو ایک بڑی معقول تعداد کے مَرجَع (قولِ طیّب) اُن کے ایک مُرید با اخلاص کی مرتّب کی ہوئی ان کی ملفوظات پر بڑی جامع اور بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ اور حیرت پر حیرت یہ کہ الفاظ کی نشست، فقروں کی ساخت وترکیب غرض عبارت وانشا عین مین خود برنی صاحب مرحوم ومغفور کی! بہر حال اس کتاب کے افادی پہلو

اتنے ہیں کہ معتقدین کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس سے پورا نفع اُٹھا سکتے ہیں۔

(۳) حضرت ابوالحسنات سید عبداللہ شاہ قبلہ نقشبندی قادری محدّثِ دکنؒ

اس کے مضامین اہم ہیں۔ زبان سادہ ہے اور پیرائیہ بیان دلچسپ ہے اللہ تعالیٰ اس تالیف کو حُسنِ قبول عطا فرمائے۔

(۴) شیخ الاسلام حضرت سید بادشاہ حسینیؒ — معتمد مجلس علمائے دکن حیدرآباد

عہدِ حاضر چونکہ صحافت کی ترقی کا ہے۔ اس لئے غالباً علم سینہ کو سفینہ میں سمایا گیا ہے۔ فی الواقع یہ کتاب اسم بامسمّٰی قولِ طیّب ہے۔

(۵) حضرت پیر سید یوسف گیلانیؒ — کلید بردارِ بغداد شریف۔ پیر آف وانا۔ وزیرستان

اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم بخشے۔ قولِ طیّب کے مطالعہ سے مولٰنا الیاس برنیؒ کی یاد تازہ ہوگئی۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ممالکِ غیر کے لئے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔

(۶) جناب لکشمی کانت راؤ بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی (ایڈوکیٹ) رکن سینیٹ یونیورسٹی عثمانیہ حیدرآباد

یہ کتاب موجودہ زمانہ میں اردو ادب پر ایک احسانِ عظیم ہے۔ یہ ایک فلسفۂ حیات یا نظام العمل حیات ہے جس پر اصولی اعتبار سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں اس کتاب کا بزبانِ انگریزی ترجمہ ہوجائے تو دیگر زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ کرنے میں سہولت ہوگی اور انسانیت کا درس ہر شخص کو حاصل ہوسکے گا۔

(۷) ماہنامہ معارف۔ اعظم گڑھ (یو۔پی)

مولٰنا کی کوئی بات حکمت وموعظت سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ آسمانِ شہرت ووجاہت کی بلندیوں پر ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی عملی زندگی میں ایک فقیر منش تھے یہ کتاب ہر مسلمان اور نامسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے۔

(۸) اَلجمیعتہ ۔ دہلی ۔ (جمیعتہ العلماء کا اخبار)

مولنا الیاس برنیؒ معاشیات کے ماہر اور امام تھے ۔ اپنے دور کے ہر فن مولا گذرے ہیں ۔ (قولِ طیب) ان کے ملفوظات پر بڑی دلکش اور معلوماتی کتاب ہے ۔ اس قدر دلچسپ ہے کہ جس صفحہ پر نظر ڈالئے اُسے ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔

(۹) مولنا ماہر القادری ۔ مدیر فاران ۔ کراچی ۔ پاکستان

مولانا الیاس برنیؒ کے تصوف اور بیعت و ارشاد کا سلسلہ اس نوبت تک پہنچا ہے کہ ان سے رفاعی، نظامی، صابری سلسلوں کی طرح الیاسی سلسلہ منسوب کیا جاتا ہے ۔ قولِ طیب میں دین و اخلاق اور تزکیہ نفس کے بڑے مفید نکتے بیان کئے گئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے قلب میں سُوز و گداز پیدا ہوتا ہے ۔

(۱۰) مولنا عامر عثمانی، مدیر تجلی ۔ دیوبند (یو ۔ پی)

بلا شبہ علوم و معارف کے قیمتی موتی اس میں بکھرے ہوئے ہیں ۔

(۱۱) مُنادی ۔ دہلی

کتاب کی عمدگی کی ضمانت کے لئے مولنا الیاس برنیؒ کا نام ہی کافی ہے

(۱۲) ماہنامہ القدیر ۔ حیدر آباد (انڈیا)

یہ کتاب اصلاحِ نفس اور تزکیۂ قلب کے لئے اکسیر ہے ۔ ایک صحیح العقیدہ مسلمان بننے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ہی مفید اور ضروری ہے جس سے اسلامی معاشرت اور مذہبی احساسات میں تازہ جان پڑجاتی ہے ۔

(۱۳) روزنامہ رہنمائے دکن ۔ حیدر آباد ۔ انڈیا

اس میں کوئی شبہ نہیں، بہتوں نے بزرگوں کے ملفوظات جمع کئے ہیں لیکن قولِ طیب اپنی نوعیت و ترتیب کے لحاظ سے پہلی کتاب ہے ۔ طرز بیان عام فہم، سلیس، شگفتہ اور ادب و عقیدت سے معمور ہے ۔

۱۴ ۔ روزنامہ سیاست ۔ حیدر آباد دکن ۔

اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کے بنیادی اُصول ہر عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں ۔ یہ کتاب نئی نسلوں کے لئے بھی مشعل راہ بنے گی

۱۵ ۔ ڈاکٹر شاہ فضل الرحمن انصاری سرپرست مسلم ڈائجسٹ ڈربن ۔ جنوبی افریقہ ۔

یہ کام نہایت ضروری ہے اور عمدہ طریقہ پر ہوا ہے جو قابلِ تعریف ہے ۔

۱۶ ۔ مسٹر حسن الدین ام ۔ اے، ایل ایل بی ۔ اسکالر ۔ ویسٹ برلن ۔ جرمنی

یہ کتاب مُقتضائے وقت کے مطابق ہے اور مفید ہے ۔ یہ میرے لئے ایسا قیمتی خزینہ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ میری زندگی میں ہدایت کا باعث بنا رہیگا

۱۷ ۔ جناب عارف خاں بی ۔ اے ۔ ال ال بی ۔ ممبر لجسلیٹیو کونسل آندھرا ۔

یہ کتاب زندگی کے ایمانی، روحانی، اخلاقی، تعلیمی، معاشی، سماجی اقدار و مسائل سے معمور ہے ۔ جن کا علم و عمل بنی نوع انسان کی کامیاب پُرسکون زندگی کا ضامن ہوسکتا ہے ۔ (ترجمہ)

۱۸ مراسلہ یف ۔/63 مورخہ ۹ جنوری ۱۹۶۳ء کے ذریعہ ناظم تعلیمات حیدرآباد نے کتاب قولِ طیب کالجوں ہائی اسکولوں اور عام کتب خانوں میں اس کی خریدی کی سفارش کی ہے ۔

۱۹ ۔ ڈائرکٹر آف پبلک لائبریریز ۔ آندھرا پردیش نشان ۵۲۳ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۶۳ء آندھرا اسٹیٹ کے جملہ عام کتب خانوں میں قولِ طیب مؤلفہ عبد الحلیم صاحب کے استعمال کی سفارش کی جاتی ہے ۔

کے استعمال کی سفارش کی جاتی ہے ۔

۲۱ - چیرمن ضلع پریشد عادل آباد اور ورنگل نے بذریعہ مراسلہ ۸۵۷ ۱ مورخہ ۲۵ مارچ ۶۳ئہ و مراسلہ نشان ورنگل (۸۵۰) مورخہ ۳۰ اپریل ۶۳ئہ ضلع پریشد کے جملہ مدارس میں قولِ طیب کی خریدی و استعمال کے احکام جاری فرمائے مؤلف سب کا دل سے ممنون ہے ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

فصلِ اوّل

مُقدّمہ

زباں پہ بارِ خُدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نُطق نے بوسے مِری زباں کے لیے

(۱) حضرت کا حُلیہ مُرشِدی و مولائیٔ الحاج مولٰنا محمد الیاس برنی چشتی قادری نقشبندی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ سے مجھے ۱۳۴۴ ہجری میں نیاز حاصل ہوا۔ میں اُس زمانے میں میٹرک کامیاب کرکے نیا نیا عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں شریک ہوا تھا۔ حضرت اُس زمانے میں معاشیات کے صدر تھے۔ گو آپ کی ظاہری حیثیت علمِ معاشیات کے ماہر اور یونیورسٹی میں عمرانی علوم کے پروفیسر کی تھی لیکن آپ کی دوسری حیثیت بھی تھی۔ شعبۂ معاشیات ہو یا کوئی دوسرا شعبہ۔ کیا طلبہ کیا پروفیسر سب پر آپ کا اخلاقی اثر تھا۔ میں نے ذکر سُنا تو کشش محسوس ہوئی۔ چہرۂ مبارک دیکھا تو قلب نے گواہی دی کہ یہ ایک صِدّیق کا چہرہ ہو سکتا ہے۔ قامت بلند و بالا۔ سڈول ورزشی جسم۔ گورا نورانی رنگ۔ کتابی چہرہ۔ بال گھنے۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ دندانِ مبارک باریک اور پیوستہ۔ چہرہ پر متانت کے ساتھ بشاشت۔ چال ایسی کہ معلوم ہوتا اُوپر سے نیچے کو اتر

رہے ہیں بغرض مردانہ حُسن کا بہترین نمونہ۔ مجھے تو عجب کشش محسوس ہوئی۔ کالج میں سر راہے گاہے گاہے دید حاصل ہوتی تو اشتیاق اور بڑھ جاتا۔ بالآخر سالِ اوّل کے آخری زمانے میں برادرم ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کے ساتھ حضرت کے دولت خانے پر شرفِ باریابی حاصل ہوا۔ اس کے بعد سے حاضری کا سلسلہ برابر جاری رہا طالبِ علمی کے زمانے میں ابتداءً ہفتہ میں ایک دو دفعہ حاضری ہوتی اور کئی کئی گھنٹے نشست رہتی۔ بعد میں زیادہ آمد و رفت رہنے لگی۔ سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کے بعد بھی جب کبھی موقع ملتا حاضر ہوتا۔ بعض دفعہ مسلسل کئی کئی روز دن رات خدمت میں حضوری کا شرف حاصل رہتا۔

(۲) تصانیف و تالیفات یوں تو حضرت کو طالبِ علمی کے دور سے ہی تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ زمانۂ طالبِ علمی میں آپ نے اپنے حُسنِ انتخاب سے اُردو اشعار کا بے نظیر مجموعہ مرتّب فرمایا۔ جو بعد کو معارفِ ملّت، جذباتِ فطرت اور مناظرِ قدرت کی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ اور ملک میں خوب مقبول ہوا۔ یہ اُردو زبان کی گولڈن ٹریژری سمجھا جاتا ہے۔ جب آپ علی گڈھ میں ام۔ اے کے طالب علم تھے تو بی۔ اے فائنل کو معاشیات پڑھاتے تھے۔ اسی زمانے میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم کی فرمائش بلکہ تاکید پر علم المعیشت تصنیف فرمائی۔ جس کے متعلق ڈاکٹر اقبال جو خود بھی عالمِ معاشیات تھے، فرماتے ہیں۔ "آپ کی علم المعیشت اُردو زبان پر ایک احسانِ عظیم ہے۔ اکنامکس پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے اور ہر لحاظ سے مکمّل"۔ جب ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سلسلے میں دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا تو آپ کو علی گڑھ سے بطورِ خاص تار دے کر حیدرآباد گورنمنٹ نے بلایا اور شعبۂ معاشیات کی تالیفات و تراجم کا اہم کام آپ کے سپرد ہوا۔ کئی کتابیں تالیف ہوئیں۔ دو سال بعد یونیورسٹی کالج

میں آپ پروفیسر معاشیات بنائے گئے۔ اور پھر صدرِ شعبۂ معاشیات۔ اس کے بعد آپ ناظم دارالترجمہ مقرر ہوئے اور پھر یونیورسٹی میں رجسٹرار ہو گئے۔ بعد میں ناظم دائرۃُ المعارف اور اسپشل افسر بنے۔ اس کل زمانے میں حضرت کی تصنیف و تالیف کا مشغلہ برابر جاری رہا۔ حضرت نے مختلف فنون پر پچاس کتابیں اُردو، فارسی، عربی، انگریزی زبانوں میں تصنیف و تالیف فرمائیں۔ آپ نے شعبۂ اسلامیات میں بارہ، شعبۂ قادیانیات میں سات، شعبۂ ادبیات میں سولہ، شعبۂ معاشیات میں چھ، شعبۂ ذاتیات میں دو اور شعبۂ اردو ہندی سنسکرت میں دو اور متفرق چھ کتابیں تحریر فرمائیں۔

(۳) ظاہری کمالات اس علمی اور دینی ذوق کے ساتھ ساتھ حضرت کی طبیعت نہایت شگفتہ اور ظریفانہ تھی لیکن ظرافت کا معیار بہت بلند۔ بذلہ سنجی کا یہ عالم کہ سننے والے کے دل کی کلی کھل جائے۔ دوسروں کی بذلہ سنجی سے بھی خوب لطف اندوز ہوتے۔ بے اختیار ہنس پڑتے۔ اور خوب دل کھول کر داد دیتے۔ آپ کی گفتگو اور تقریر کا خاص انداز تھا۔ جس سے پتہ چلتا کہ نفسیاتِ انسانی پر کیسی باریک اور گہری نظر ہے۔ بعض ممتاز یوروپین مثلاً ڈاکٹر سیاڈلر صدر یونیورسٹی کمیشن تک نے متاثر ہو کر آپ کی گفتگو کے نوٹس لئے۔ مثال دینے میں کمال حاصل تھا۔ حاضر جوابی میں بے مثال تھے۔ آپ کی خوبیٔ تقریر کا یہ عالم کہ سامعین مسحور ہو جاتے اور محسوس کرتے۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شاعری اور موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ اور بڑی ناقدانہ نظر تھی۔ اشعار میں ایسے نکات بیان فرماتے کہ شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ طبیعت بے حد لطافت پسند اور

کسی حد تک نازک تھی۔ مزاج میں سادگی کے ساتھ بے حد نفاست پسندی اور پاکیزگی تھی۔ عطریات کا خاص شوق تھا۔ بہت اہتمام تھا۔ آپ حلم و ضبط اور حیا و مروّت کی غیر معمولی مثال تھے۔ ہر کام سے نظم و ضبط نمایاں تھا۔ جسمانی ورزشوں کے شوق کا یہ عالم کہ بانک، بنوٹ، خنجر، تلوار، نشانہ بازی، کشتی، باکسنگ، پیراکی، اسپ سواری، موٹر رانی۔ ہر ایک میں اُستادانہ مہارت حاصل تھی۔ طالب علمی سے فٹ بال، ہاکی، کرکٹ وغیرہ مردانہ کھیلوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

یوں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے امارت کے لوازم، شاندار کوٹھی، موٹر، ملازمین وغیرہ سبھی عطا فرمائے تھے لیکن اس امیری میں فقیری کی شان نظر آتی تھی۔ آپ کی اہلیۂ محترمہ کا بھی یہی حال تھا کہ ان کو حضرت سیدہ زینبؓ کی توجہات حاصل تھیں۔ غرض سارے گھر پر یہ فضا چھائی ہوئی تھی۔ ذاتی کمال و فضیلت کے سوا خاندانی شرافت و وجاہت بھی اللہ کا فضل ہے۔ آپ کے خاندان کی شانِ فاروقی اور تاریخی، علمی، دینی، سیاسی خدمات غازی شہاب الدین غوری فاتحِ ہندوستان کے عہد ۵۸۸ھ سے تاریخ میں محفوظ ہیں، اور اب تک جاری۔

اہلی زندگی کی اہمیت

حضرت کی عملی زندگی میں توازن کا کمال تھا۔ اہلی زندگی اور خاندانی حقوق کی ادائی کی اہمیت پر حضرت بہت زور دیتے تھے۔ سرکاری ملازمت کی مصروفیات کے بعد حضرت اپنا بڑا وقت گھر پر صرف فرماتے۔ تصنیف و تالیف کی مصروفیات کے باوجود، اپنی صاحبزادیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وقت نکال لیتے۔ حتیٰ کہ بعض وقت اُن کے ساتھ کھیلتے بھی تھے

حضرت کے برادر نسبتی جناب کمال احمد فاروقی تو بچپن ہی سے آپ کے زیر تربیت رہے

حضرت اُنھیں اپنے بچہ کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ آپ کے بھانجے جناب ناظم صدیقی اور ایک بھتیجے جناب جمیل احمد برنی (نائب ناظم تعلیمات) بھی عرصہ تک بیت السلام میں مقیم اور آپ کے زیر تربیت رہے۔ چھوٹے بھانجے جناب آلِ حسن برنی سے آپ کو خاص محبت تھی۔ موصوف بھی کئی دفعہ آپ کی خدمت میں حیدر آباد حاضر ہوئے اور آپ کی توجہات سے مستفید ہوتے رہے۔ آپ کی تعلیم و تربیت سے استفادہ کی خاطر آپ کے پیر و مرشد مولنا محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولنا عبد القدیر صدیقی حسرتؔ نے اپنے صاحبزادوں جناب مسعود الحسن صاحب اور جناب موسیٰ عبد الرحمٰن صاحب کو بچپن ہی سے آپ کے سپرد فرما دیا تھا۔ وقتاً فوقتاً بعض خاص احباب جسمانی و ذہنی تربیت سے متعلق مشوروں کے لئے اپنے بچوں کو آپ کی خدمت میں لاتے اور مستفید ہوتے۔ غرض کہ بیت السلام میں ایک چمن کھلا معلوم ہوتا تھا۔

(۴) باطنی کمالات

یہ تو حضرت کا ظاہر تھا۔ جس کا ایک ایک پہلو حُسن و جمال سے آراستہ، فضل و کمال سے مُرصّع۔ کیسی جامعیت تھی۔ جس میں نہ کوئی تصنّع تھا نہ بناوٹ۔ سادگی اور پُرکاری کا مُرقع۔ لیکن اس ظاہر کے سوا آپ کا ایک باطن بھی تھا جو ظاہر بینوں سے مخفی تھا۔ وہ تھا حضرت کا ایمان و اعتصام۔ اور قرب و احسان میں حضرت کا مقام، اور اس کا حال و قال۔ اور یہ سب فیضان نتیجہ تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ سے شیفتگی و وابستگی اور عشق و محبت کا۔ جس کی مستی ہر لحظہ حضرت پر طاری رہتی تھی۔ فرماتے ہیں۔

برنی اُن کا غلام کیا کہنا کیسی مستی ہے دل ہی جانے ہے

(۵) قرآنِ ناطق کی شان

سیف آباد شہر حیدر آباد کا مشہور محلہ ہے۔ وہیں بیت السلام حضرت کا آستانۂ معلّٰی ہے۔ حال حال تک یہاں قرآنِ کریم کے حقائق شب و روز بیان ہوتے تھے آپ پر قرآن کا اِنفتاح ایسا تھا کہ گویا نَحْنُ فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (۱۷) کھلا ہوا ہے۔

قرب واحسان کے مسائل کے سوا معاشیات، سیاسیات، عمرانیات بلکہ روزمرہ کی زندگی کے اکثر مسائل کو قرآنی علم کی روشنی میں ایسا واضح فرمادیتے کہ معلوم ہوتا آپ قرآنِ ناطق کا ایک زندہ نمونہ اور قرآنِ مبین کی ایک خاص تجلی ہیں۔ گو آپ حافظ نہ تھے۔ لیکن تحریر و تقریر میں ہر محل کے مناسب و موزوں قرآنی آیتوں کا حوالہ اس کثرت و خوبی سے پیش فرماتے کہ گویا جزوِ کلام ہے۔

(۶) طالبانِ حقیقت کے تین گروہ

اکثر فرماتے کہ حقیقت کی تلاش کے تعلق سے اہلِ علم کے تین بڑے گروہ بن گئے۔ ایک وہ جو عقل و استدلال سے حقیقت کا پتہ چلانا چاہتے ہیں۔ یہ گروہ فلسفیوں کا ہے۔ دوسرے وہ جو روحانی مجاہدے ریاضتیں اور مشقیں کرکے کشفِ روحانی کے ذریعے حقیقت تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گروہ اشراقیوں اور جوگیوں کا ہے۔ تیسرے وہ جو نورِ عقل کے لئے نورِ حق (وحی) کو رہبر مانتے ہیں۔ اور حقیقت تک رسائی کے لئے رسالت کو

واحد ذریعہ جانتے ہیں۔ یہ گروہ مومنین کا ہے۔ اس طرح ایک جماعت عقل کے تابع اور دوسری کا مکاشفاتِ روحانی پر مدار ہے لیکن اسلام نورِ عقل کو نورِ وحی کے تابع کرکے نورٌ علیٰ نور بنا دیتا ہے۔

(۷) سلوکِ علمی

سلوکِ علمی (سلوکِ مطلق) یعنی علمِ قرآنی کی راہ سے وصول الی اللہ کے طریق پر آپ بہت زور دیتے تھے۔ آپ کی فہم قرآنی اور تعلیم ایمانی کا انداز بالکل نفسیاتی اور فطری تھا کہ باتوں باتوں میں علم دل میں اتر جائے۔ قالِ صحیح حال بن جائے۔ اللہ رسول سے ربط ذہنی، خیالی، استدلالی نہ رہے، بلکہ قلبی، وجدانی اور ایمانی بن جائے۔ خلوت کے اشغال و اذکار اور دینداری و تقدس کے ظاہری رکھ رکھاؤ میں دین و ایمان محصور نہ رہے۔ بلکہ وہ بلا تکلّف و تصنع روزمرہ کی ظاہری و باطنی، انفسی و آفاقی، اہلی و معاشرتی، انفرادی و اجتماعی، معاشی و روحانی زندگی میں نکھر کر ظاہر ہو۔ چنانچہ حضرت فرماتے۔ اصل سلوک یہ ہے کہ قرآن کے مطابق اپنے علم و عمل کی تصحیح ہو جائے اور قرآنی علم حال بن جائے۔ یہی اصل نعمت ہے۔ قرآن کے مطابق، تصحیحِ علم کے بعد اس علم پر قیام اور اس کو اپنا حال بنا لینا شغلِ مطلق کا حکم رکھتا ہے۔ شغلِ مطلق مقام بن جائے تو ہر حال، حالی ہو جاتا ہے۔ اس سے عمل میں قوت آتی ہے علم عینِ ذکر اور ذکر عینِ علم ہو جائے تو کمال ہے۔

یہ عالَم عالَمِ شہادت اور عالَمِ ظہور ہے۔ یہاں اسماء و صفات کی تجلیات پر نظر لازمی ہے۔ بلا تعینات و آثار ذات کی یافت کا خیال محض خیال کا چکر ہے۔ بہت سے لوگ توحیدِ ذہنی اور تجریدِ خیالی کو ذات کی یافت کہتے ہیں۔ جو محض دھوکا ہے۔ نفس، دل، روح کی تجرید کے کمالات مومن اور کافر میں مشترک ہیں۔ مومن کی امتیازی خصوصیت ایمان و علمِ صحیح ہے

جو رسالت کے ربط سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی مسلک اکابرِ دین کا رہا ہے۔

۸۔ قادری تعلیم

حضرت کا طریقہ تھا کہ اہل پاتے تو قرب و احسان کا علم بیان فرماتے اور بیان کے دریا بہا دیتے۔ معلوم ہوتا منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں، حقائق و معارف کے موتی بکھر رہے ہیں۔ قادری فیضان کا دریا موجزن رہتا تھا۔ فرماتے۔ قادری لوگ تمام تر قرآن ہی قرآن ہے۔ اِس کا خلاصہ ایمان و اعتصام ہے۔ عبدیت اس کا مقام ہے کہ علم و عمل تصرّفِ نفسانی سے آزاد ہوکر رسالت سے وابستہ ہوجائیں۔ امرِ الٰہی کے تابع ہوجائیں کہ رسالت ہی میں امرِ الٰہی مُندرج ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ (۱۳/۱۲) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۵/۸)

۹۔ حضرت مجدِّدؒ کے علم کی روشنی میں حضرت برنیؒ کے سلوکِ علمی کی شان

یہ سب کچھ تھا لیکن احوال کے اِستتار کا یہ عالم کہ اچھے اچھے حضرت کی ظاہری حالت سے دھوکا کھا جاتے اور کہتے کہ ان کے پاس قال ہی قال ہے۔ حال نہیں۔ علم ہی علم ہے، اذکار و اشغال نہیں۔ فلسفیوں کی سی ذہانت کی باتیں تو خوب کر لیتے ہیں لیکن کشف و کمال نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ صوفیہ اور فلاسفہ کے علم و بیان میں بظاہر جو مُشابہت معلوم ہوتی ہے۔ اس سے مغالطہ ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ اس مُشابہت سے اکثر لوگ ہمیشہ سے دھوکا کھاتے رہے ہیں اور اولیاء اللہ کے قرب و احسان کے علوم و معارف کو سن کر اُن کو صرف زبانی باتوں یا فلسفیانہ استدلال سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ نے

بھی اپنے زمانہ میں اس اِلتباس و اشتباہ کو دور کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی اور اُسے یوں صاف فرمایا ہے۔

اِن دونو گروہوں کے علم میں اثر کا شہود لازم ہے تاکہ اس سے مؤثِّر کا پتہ حاصل ہوسکے جو غیر مشہود ہے۔ لیکن دونو میں فرق یہ ہے کہ صوفیہ (عارفین) کے علمُ الیقین میں وہ ارتباط جو اثر و مؤثّر کے درمیان حاصل ہے۔ اور اثر کے وجود سے مؤثّر کی طرف منتقل ہونے کا سبب ہے مکشوف و مشہود ہے۔ اور اہلِ فلسفہ کے علم میں وہ ارتباط نظری و ذہنی ہے جو فکر و استدلال کا محتاج ہے۔ (مکتوب ۹۴ جلد سوم)

اذکار و اشغال کے متعلق حضرت مجدّد الف ثانیؒ فرماتے ہیں۔ ذکر کا تلقین کرنا بچوں کو الف بے پڑھانے کی طرح ہے۔ (مکتوب ۲۶ جلد دوم)

احوال کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ احوال جو طالبوں پر ابتدا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسے ہیں جیسے بچوں کو الف بے سکھاتے ہیں (مکتوب ۱۳ جلد سوم)

کشف و کرامات کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ :—

مثالی ظہور تمام ظہورات میں کمتر اور ضعیف ہے۔ اس راہ کے طالب مثال میں اپنے آپ کو بڑے مقامات پر پاتے ہیں۔ اگر یہ معنیٰ عالمِ شہادت میں ظہور پیدا کریں تو بڑی دولت ہے۔ ورنہ ظہورِ مثالی ہی پر اکتفا کریں تو لاحاصل ہے۔ ہر جولاہا اور حجام خواب میں اپنے آپ کو بادشاہ دیکھتا ہے لیکن کچھ حاصل نہیں۔ پس صرف خواب و مثال کی باتوں پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ شہادت میں جو کچھ حاصل ہوجائے اُسے حاصل سمجھنا چاہیئے۔

چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

کرامات کی عدم ضرورت کی یوں تشریح فرماتے ہیں :-

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے کشف سالک زیادہ قرب کے باعث جو اُسے حاصل ہوتا ہے کشف والے سے افضل و پیش قدم ہوتا ہے۔ کرامات یقین کی تقویت کیلئے عطا ہوتی ہیں۔ جب کسی کو یقین حاصل ہو چکا تو اُسے کرامات کی کیا حاجت ہے (مکتوب ۹۲ جلد دوم)

ذکر کے حقیقی معنی کے متعلق جو عام غلط فہمی ہے اُسے حضرت مجددؒ یوں صاف فرماتے ہیں۔

ذکر سے مراد یہ ہے کہ غفلت دور ہو جائے (یعنی علم حاضر رہے) خواہ کسی طرح ہو۔ نہ یہ کہ ذکر کو نفی و اثبات یا اسمِ ذات کی تکرار پر منحصر سمجھا جائے جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے (مکتوب ۴۶ جلد دوم)

سلوکِ علمی کے متعلق حضرت مجددؒ نے اسی مکتوب میں ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا زین الدین تائبادیؒ کو وصول الی اللہ علم کی راہ سے حاصل ہوا۔

جذب و محبت اور سلوک کے مقصود کے متعلق حضرت مجددؒ تحریر فرماتے ہیں۔

ابتدا اور وسط میں کسی کو عشق و محبت دی جائے تو اس سے مقصود ماسوی اللہ سے اس کا قطعِ تعلق کرنا ہے کیونکہ عشق و محبت بھی مقصودِ ذاتی نہیں بلکہ مقامِ عبدیت کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اسی واسطے مراتبِ ولایت میں سے نہایت کا مرتبہ (انتہائی مقام) مقامِ عبدیت ہے۔ اور ولایت کے درجوں میں سے مقامِ عبدیت سے اوپر کوئی مقام نہیں۔ (مکتوب ۳۰ - جلد اول)

(۱۰) رسالت سے زندہ ربط

حضرت اکثر فرماتے۔ اصل دین قرآن و رسالت سے زندہ ربط کا نام ہے حقیقی توحید وہی ہے۔

جو نبی کریم صلعم کی محبت و تعظیم کا ثمرہ ہو۔ زمانۂ حال میں توحید سارے عالم میں فلسفہ بن چکی ہے۔ نہ ماننے والے بھی اسے ماننے لگے ہیں۔ بلکہ رسالت کو بھی قبول کرنے پر تیار ہیں کہ واقعی انبیا اخلاق وغیرہ کے لحاظ سے اچھے لوگ تھے۔ لیکن ان کیساتھ ربط ایمان و اطاعت ضروری نہیں سمجھتے۔

واضح رہے کہ رسول اللہ صلعم کی ذاتِ بابرکات محض ایک قصۂ ماضی نہیں بلکہ ایک زندہ جاوید حقیقت ہے۔ جسکے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ آپ

(مکتوب ۲۶۵ جلد دوم)

رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ ہیں۔ تمام کائنات کے لئے ہر وقت فیضانِ رحمانیت کا واسطہ ہیں۔ اور دوسرا پہلو یہ کہ آپ کی ذات مبارک اللہ تعالیٰ کے اسمِ رحیم اور اسمِ ہادی کا مظہرِ اعظم ہے۔ پس حکمِ ربانی کے تحت ہمارا مقام و منزل محمد رسول اللہ ہونا چاہیئے۔

اے مقام و منزلِ ہر راہ رَو جذبِ تو اندر دلِ ہر راہ رَو

المختصر دین و ایمان نبوّت سے ربط ہی کا نام ہے۔ یہی ربط اصلِ حیات ہے، جس میں محبت سے جان پڑتی ہے۔ حُبِ نبوی کے بغیر، دین و ایمان سے ربط پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور نہ حقیقی توحید ملتی ہے۔ اسلام میں رسالت ناگزیر چیز ہے۔ ترقی کے لئے ہر آن اس سے ربط اور عقیدت و وابستگی لازم ہے۔ اسی پر تمام اولیاء اللہ اور اکابرِ دین کا اصرار ہے۔ سب کا محور و مرکز رسالت ہی رہا۔ سب کہہ گئے۔ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ۔ اور صحابۂ کرام کی زندگی کا تو ایک ایک واقعہ اس کا شاہد ہے۔ رسالت سے کیسا ربط تھا۔ کیسی شیفتگی تھی۔ کیسا عشق تھا کیسی جان نثاری تھی کیسی وفا شعاری تھی۔ سُبْحَانَ اللہ۔

(۱۱) فسادِ قلبی کے دو باعث

پس رسالت ہی حِزْبُ اللہ کا حِصنِ حَصِین اور ملجا و ماویٰ ہے۔ جس پر شیطان کی ہمیشہ یورش رہتی ہے کہ اس سے لوگوں کو نکال نکال کر باہر لے آئے۔ اور یہ ہو سکے تو رسالت کے ربط کو توڑ دے، یا کم سے کم مضمحل اور کمزور تو ضرور کر دے کہ صورۃً تعلق معلوم ہو اور معناً تعلق ٹوٹ جائے۔

اس قسم کے فسادِ قلبی کا باعث بنیادی طور پر دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی شخص اپنے آپ کو بڑھا کر، منصبِ رسالت کا شریک و سہیم اور

دعوے دار بن جائے کہ گویا وہ خود حضورؐ کا مِثل و مَثیل ہے، نبی ہے، رسول ہے۔ دوسری چیز یہ کہ آپ کی مثلیت پر تو نظر ہو، اُس کا اقرار ہو بلکہ اس پر اصرار ہو۔ لیکن اس مثلیت میں آپ کی جو افضلیت پنہاں ہے۔ اُس سے اِعراض ہو، انکار ہو۔ جہل کی وجہ سے حضورؐ کی بشریت کو اپنی بشریت پر قیاس کرے اور حضور کا مرتبہ گھٹا کر، حضورؐ کو اپنا مثل یا مثیل سمجھے کہ وہ اپنی مادہ پرستانہ ذہنیت کی وجہ سے خود کو بھی محض گوشت پوست کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ اور حضورؐ کی عبدیت میں جو رفعت ہے اور انسانی مرتبت کا جو انتہائی عُلو ہے اِس سے اِغماض و اِعراض کرے

١٢ عہدِ نبویؐ کے فتنے

اس زمانے میں اِن فتنوں نے نہایت قوت اور تنظیم کے ساتھ سر اُٹھایا ہے لیکن ان کی ابتدا خود عہدِ نبویؐ سے ہو چکی تھی۔ اور مُتنبّی مُسیلمہ کذّاب نے آپ کی رسالت سے اِستِناد لے کر نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد مُسیلمہ کذّاب، اسودِ عنسی اور سجاح وغیرہ نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ بہت سے لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہو کر مُرتد ہو گئے۔ ان کے خلاف حضرت صدّیقِ اکبرؓ نے جہاد فرمایا۔

اِسی طرح مقامِ نبوت کی شان و عظمت گھٹانے میں ذُوالخُوَیصِرہ اور اُس کے ہم مشرب لوگوں کی مثال ہے۔ جو بظاہر بات تو ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن اُن کا مقصود کچھ اور ہوتا ہے، یعنی اِہانتِ رسولؐ۔ یہ شخص نجد کے قبیلۂ بنو تمیم سے تھا۔ بخاری اور مسلم میں اس شخص کے متعلق روایت ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا۔ ایک موقعہ پر جب حضور کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے اتنے میں ایک شخص آیا اور کہا۔ یا رسول اللہ۔ عدل کیجئے۔ حضرت نے فرمایا۔ تیرا بُرا ہو۔ جب میں ہی عدل نہ کروں تو کون کریگا۔ حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ نے عرض،

کیا۔ اجازت ہو تو اس کی گردن اُڑا دوں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اِسے چھوڑ دو۔ اس کے رُفقاء ایسے لوگ ہونگے کہ ان کی نمازوں روزوں کے مقابل ہیں، تم لوگ اپنی نمازوں، روزوں کو حقیر سمجھو گے۔ وہ قرآن پڑھیں گے لیکن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔ وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے صاف گذر جاتا ہے۔

پس یہ فتنے ایسے ہیں کہ ان میں مبتلا ہونے والا شخص ایمان و اسلام بلکہ زُہد و تقویٰ کا مدّعی رہتا ہے۔ اور اکثروں کو اس پر ایمان کا دعویٰ ہوتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت دامنِ رسالت ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور وہ محض بازیچۂ شیطان بن کر رہ جاتا ہے۔ غرض یہ دونوں فتنے قدیم ہیں۔

١٣- زمانۂ حال کے چار بڑے فتنے

غرض یہ کہ زمانۂ حال کے چار بڑے فتنے ہیں

(١) فتنۂ مادّیین (٢) فتنۂ اشراقیین (٣) فتنۂ مُتنبّیین (٤) فتنۂ مُعرقین

(١) پہلا فتنہ مادّیت کا ہے کہ یورپ میں عیسائیت کی مسخ شدہ تعلیم اور پادریوں کی اجارہ داری سے نفرت کی وجہ سے جب مذہب سے بے اعتنائی بلکہ بیزاری پھیلی۔ مادیت کا زور بڑھا۔ روحانیت گھٹی اور عقلیت کا اثر چھایا تو عالمِ اسلام میں بھی بہت سے ذہن اس سے مسموم ہو گئے۔ اور اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ سائنس اور علومِ طبعی کی ترقیوں کا مادہ پرستانہ فلسفے سے گویا لازمی تعلق ہے۔ اور یہ کہ اب مذہب کو عقلیت اور مادیت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔ یہ استدلال ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسے غروبِ آفتاب کے وقت ابر آنا اور پانی برستا دیکھ کر کوئی کہے کہ غروبِ آفتاب کی وجہ سے ابر آیا اور پانی برسا۔ توہّم پرستی کی حد ہے۔ اس توہّم پرستی کا نتیجہ بہر حال یہ ہوا کہ یورپ کے عقلیت پسند

اور مادہ پرست فلسفیوں کی عظمت لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگی اور رسالت سے اُن کا ربط کمزور پڑ گیا۔ ستم ظریفی یہ کہ مذہبی ذہنیت رکھنے والے بعض علماء تک، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، مالکیت، امانت وخلافت کی ایسی تعبیریں کرنے لگے جو بظاہر قرآن سے مُستند علوم ہوں لیکن باطن ومعنی کے لحاظ سے وہ تعبیریں فلسفۂ مادّیت سے اثر پذیر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مادّی تصوّرات بھی کیا کیا روپ اختیار کر سکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مادیت کی علمبردار حکومتیں اور ادارے طرح طرح سے بے دینی پھیلا رہے ہیں۔ نوجوانوں کو دین کے خلاف ورغلا رہے ہیں، عورت کی بے حجابی کو حربہ، ذریعہ اور آلۂ کار بنا رہے ہیں۔ رقص وسرود اور ناچ رنگ کی مخلوط پارٹیاں بنا بنا کر ملک ملک بھجوا رہے ہیں۔ اور اُن کو کلچرل مشن کا سنہرا اور خوبصورت نام دے رہے ہیں کہ گویا اس طرح تہذیب وثقافت کی ترقی کے گُل کھلا رہے ہیں۔ حالانکہ اندرونی مدّعا یہ کہ اس طرح نوجوانوں کے جذبۂ شہوانیت وجنسیت کو اُبھارا جائے۔ اور لہو ولعب اور تماش بینی کے راستہ پر لگایا جائے، نتیجہ یہ ہو کہ ان میں حیا وعفت کا جذبہ افسردہ بلکہ مردہ ہو جائے۔ دین سے غفلت، بے رغبتی، بے گانگی بلکہ بغاوت پیدا ہو جائے۔ اور اُن کا مدّعا بر آئے۔

ع خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد

(۲) دوسرا فتنہ اشراقیت کا ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید کی تعلیم قُرب واحسان، وحقائق ومعارف کو اشراقیت وجوگیت کے مشاغلِ رُوحانی کے ساتھ مخلوط و ملتبس کر دیا جا رہا ہے اور رسالت کی تعلیم عبدیت کو چھوڑ کر، توحید کے نام سے تجرید رُوحانی اور کشف وکمالات کے چکر میں لوگ مبتلا ہو رہے ہیں۔

زمانۂ حال میں ان دو فتنوں کا مسلمانوں پر جو اثر ہوا اور جو ردِّ عمل ہوا اُسے

اُسرارِ حق میں حضرت برنیؒ یوں تحریر فرماتے ہیں۔

اللہ اللہ زمانہ کے شعبدوں نے مسلمانوں کو اسلام سے کس قدر غافل بلکہ بیگانہ بنا دیا۔ نوجوان کیسے کچھ حیران نظر آتے ہیں۔ خدا ہی جانے کیا کیا وسوسے اور خطرات دلوں کو بہکاتے اور ستاتے ہیں۔ گرچہ شکوک سے ایمان ڈگمگاتے ہیں۔ تاہم غنیمت ہے کہ عقیدۃً اور ادباً اسلام ہی کی خیر مناتے ہیں۔ زمانہ نے پلٹا کھایا۔ اور دنیا رنگ بدلا چاہتی ہے۔ تن پروری سے دل اُکتا چلے۔ مادیت کی قید سے پھر خلاص چاہتے ہیں۔ دبی زبان سے روحانیت کے چرچے سننے میں آتے ہیں۔ باطنی کرشمے اچھے اچھوں کے دل لبھاتے ہیں۔ حالانکہ کاملین ان کو بھی محض لہو ولعب بتاتے ہیں۔ حقیقت تو کہیں ارفع واعلیٰ ہے۔ وجوب میں اَحدیت، امکان میں عبدیت، مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (۲۲/۱۱) (نکالے دو دریا جو مل کر بہتے ہیں۔ پھر بھی درمیان میں پردہ رہتا ہے۔ خلط ملط نہیں ہوتے) اگر اس کی طلب ہو تو اسلام کا بول بالا ہے۔ قرآن مجید کے ہوتے حیرانی کیسے۔

(۳) تیسرا فتنہ مُتنبّیوں کا ہے یعنی نبوّت کے دعوے داروں کا، یا اُن مُصلحین کا ہے جنھوں نے بظاہر نبوّت کا دعویٰ تو نہیں کیا۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو اِسی رنگ میں پیش کیا۔

(۴) چوتھا بڑا فتنہ مُعرضین کا ہے جو دوست نما دشمنِ اسلام ہیں۔ اور خوش نما اصلاحی ناموں کی آڑ لے کر اپنا کام ملک ملک پھیلا رہے ہیں۔ اور عقائد میں فساد ڈال رہے ہیں۔ یہ مارِ آستین ہیں۔

(۱۴) رسالت پر زور اور حضرت کا جہاد

حضرت فرمایا کرتے تھے۔ ان سب فتنوں کا معرکہ

رسالت سے ہے۔ لہٰذا دورِ جدید کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر سب سے زیادہ زور دیا جائے۔ اسی کے اظہار اور اسی پر اصرار کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ حضرت نے تمام عالم میں نسبتِ رسالت کو زندہ کرنے کی کوشش میں زندگی کا چین آرام، تن، من، دھن سب قربان فرما دیا۔ اور رسالت کے مقام اور اس کی عظمت و اہمیت کو واضح کرنے اور حُبِّ رسولؐ پھیلانے کے لئے پے در پے کتابیں لکھیں۔ اور ہزارہا کی تعداد میں سارے عالم میں اپنی طرف سے مفت تقسیم فرمائیں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنْهُ۔

آپ نے استیصالِ قادیانیت اور ردِّ قادیانیت کے سلسلے میں جو زرّیں خدمات انجام دیں، وہ تاریخِ اسلام کا مایہ ناز یادگار کارنامہ سمجھا جائے گا۔ آپ کی مشہور تالیف 'قادیانی مذہب' قادیانیت کی قاموس (انسائیکلوپیڈیا) تسلیم کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں انگریزی میں 'کتابِ اسلام'، اور عربی میں درود شریف کی کتاب 'مشکوٰۃ الصلوات' اور 'حزب اللہ'، اور اردو میں 'صراط الحمید'، 'اسرارِ حق'، 'تحفۂ محمدیہ' وغیرہ تالیف فرمائیں جو اسلام کی تعمیری خدمات کے لحاظ سے خاص امتیازی آثار رکھتی ہیں۔ آپ کی ذات نسبتِ رسالت کے لئے سپر اور دشمنانِ عظمتِ رسالت کے لئے شمشیرِ بے نیام تھی۔ چنانچہ سلاح الدین کے لقب سے آپ کی سرفرازی ہوئی۔ ماشاء اللہ۔

(۱۵) اُخوّت کی سرفرازیاں

یوں تو یہ ناچیز اس در کا ادنیٰ غلام ہے جو خود بڑی سرفرازی ہے لیکن کالج کی طالب علمی ہی کے زمانے میں رؤیا میں بشارت ہوئی کہ اس ناچیز کو حضرت سے اُخوّت کی نسبت بطفیل نبی کریم صلعم حاصل ہے۔ اس بناء پر ناچیز نے حضرت کو 'بھائی جان' کہنا شروع کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت پیر سید یوسف گیلانی بغدادی

مدظلہ العالی پہلی دفعہ ۱۳۵۱ھ میں بغداد سے حیدر آباد تشریف لائے اور حضرت کے دولت خانے پر چند مہینے قیام فرمایا۔ پیر صاحب ممدوح خاندانِ عالیہ قادریہ بغداد کے خاص چشم و چراغ ہیں۔ بے حد اولوالعزم ہیں۔ حضرت بھائی جان قبلہ رح سے حضرت پیر صاحب کی ایسی مؤانست و مجانست بڑھی کہ بھائی جان قبلہ کو پیر صاحب بڑے بھائی فرماتے۔ شبِ عرفہ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ کو پیر صاحب نے ایک غیر معمولی نورانی قرآنی خواب دیکھا اور اس ناچیز پر یہ سرفرازی ہوئی کہ مجھے چھوٹا بھائی فرمایا۔ اور فرمایا کہ مجھے 'بھائی' کہا کرو۔ اس ارشاد کی بناء پر اس ناچیز کو حضرت پیر صاحب کو بھی 'بھائی جان' کہنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ یہ سب حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی ذرّہ نوازیوں کا صدقہ ہے۔ "هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ" (سورۂ نمل ع ۴)۔

ع مور بن جائے سلیماں ترے کوچے میں۔ بندہ نوازی کی حد ہو گئی۔ اے خدا قربانِ احسانت شوم۔ لیکن ایاز قدرِ خود بشناس۔ آقا آقا ہے اور خادم خادم۔ اور خادم بھی ادنیٰ خادم۔ اظہارِ نعمت مقصود ہے کہ واجب ہے اور شکر کی مقبول صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اخلاص نصیب کرے اور خود ستائی سے محفوظ رکھے (آمین)

(۱۶) ملّت کی امانت ملفوظات کا خیال

۱۳۴۴ھ میں حضرت سے پہلی دفعہ شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ حضرت کا وصال دوشنبہ ۱۶ رجب ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء کو ہوا۔ تقریباً چونتیس ۳۴ سال تک حضرت کے قدموں پر اس ناچیز کو سرفرازیاں نصیب رہیں۔ حضرت کی ہر صحبت میں قرآنی معارف کے جواہر پاروں کی بارش ہوتی تھی۔ ۱۳۶۱ھ تک حضرت کے ارشادات قلمبند کرنے کی صورت پیدا نہیں ہوئی لیکن قلب کا مسلسل تقاضا رہا کہ اگر یہ ارشادات ضبطِ تحریر میں آجائیں تو ان کا فیض ملّت کے لئے خاص سے عام اور نسلاً بعد نسلٍ متعدّی ہو سکتا ہے اور جن حضرات کو حضرت سے فیضِ

صحبت حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ شنید سے دید کا لطف حاصل کرسکیں گے

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

۱۳۶۴ھ میں ایک رات حضرت سے اپنے اس قلبی تقاضے کا اظہار کیا۔ اور اس ناچیز کو اجازت مِل گئی لیکن دِقّت یہ کہ حاضری توجّہ چاہتی تھی۔ اِس لئے ارشادات کو ساتھ ساتھ بروقت ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہ تھا اور نہ اِس کی اجازت تھی۔ اس لئے کبھی دوسرے تیسرے دن، بعض دفعہ ایک ایک ہفتہ بعد، اور بعض دفعہ دو دو تین تین ماہ بعد حافظہ کی مدد سے نوٹ مرتب کر لینا۔ اس کا سلسلہ اخیر زمانے تک جاری رہا۔

(۱۷) ترتیب و تہذیب

۱۳۷۹ھ میں جب اس ناچیز نے بفضلہٖ حج کا عزم کیا تو حج کے متعلق ہدایات کے لئے اِن تحریروں کی بھی ورق گردانی کی۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ حضرت کے ارشادات کا کتنا قیمتی خزینہ جمع ہو گیا ہے۔ چنانچہ ارادہ ہوا کہ حج سے واپسی کے بعد اِس کی ترتیب و تہذیب کا کام انجام دیا جائے۔ واپسی کے بعد مصروفیات کا وہ سلسلہ رہا کہ ایک سال تک اس طرف توجہ کی نوبت نہ آئی۔ گو دل اس میں لگا رہا۔ بالآخر ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ م مئی ۱۹۶۱ء میں بسم اللہ کہہ کر اس کام کو شروع کیا۔ ملفوظات کی قسم کی تالیف کی دِقتوں کا وہی اصحاب اندازہ کر سکتے ہیں جنھوں نے کبھی ایسا کام انجام دیا ہو۔ پندرہ سال کے ارشادات کے ہزاروں نوِشتوں میں سے جو مختلف تواریخ و اوقات میں لکھے گئے تھے۔ اقتباسات نقل کرکے، مختلف فصلیں قائم کرنا، اور مکرّرات کو چھانٹنا اور تقریباً چار سو عنوانات کے تحت مناسبتِ معنوی کے لحاظ سے مربوط طریقے پر انھیں درج کرنا ایک مشکل کام تھا۔ اس کتاب کا کوئی ایک موضوع نہیں۔ بلکہ مختلف موضوعات پر چھوٹے بڑے

مختلف بیانات کو موزوں عنوانات کے تحت اس کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ اس میں خاص طور پر عملی تعلیم کے وہ اعتبارات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں حضرت کی قرآنی تعلیم کی امتیازی شان نمایاں ہے۔ یہ بھی مُشتے نمونہ از خروارے ہے۔ ورنہ تفصیلی تحریروں کا حال یہ ہے کہ نہ صرف ہر فصل پر بلکہ بعض بہت سے عنوانات پر ایک ایک کتاب مُرتّب کی جا سکتی ہے۔

(۱۸) ضروری عرض

ملفوظات کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھا، کانوں سے سُنا، ایمان سے سمجھا، بقدرِ گنجائش دیانت سے قلمبند کر دیا تاہم غلطی سے مُبرّا ہونے کا کون دعویٰ کر سکتا ہے۔ البتہ تحسینِ نیت تک اہتمام ممکن اور لازم ہے۔ بہر حال استغفار واجب ہے۔ تاہم کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان اِس میں وہی علم، وہی الفاظ ہیں جو بیان میں آئے۔ جہاں الفاظ تمام کے تمام مُستحضر نہ رہے۔ اپنے الفاظ میں حضرت کے مفہوم کو ادا کیا گیا ہے۔ گویا شرابِ طہور کو جامِ زمرّدین کی جگہ جامِ سفالین میں پیش کیا گیا ہے۔ بہر حال بیان میں اصل و نقل کا فرق نمایاں ہے اور ضرورتاً حضرت کی بعض تحریریں بجنسہٖ جہاں ملفوظات کے ساتھ شریک کی گئی ہیں اُن سے مقابلہ کیا جائے تو یہ فرق واضح طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں کثرت سے لطیف نکات اور نازک اعلیٰ مقامات کی تشریح و توضیح آگئی ہے۔ اس پر جتنا زیادہ غور کیا جائے انشاء اللہ انفتاح بڑھیگا اور فیضانِ کثیر حاصل ہوگا۔ جہاں کہیں قرآنی آیات آگئی ہیں۔ آیات کے ساتھ پارہ/رکوع لکھ دیا گیا ہے تاکہ تحقیق میں سہولت ہو۔

(۱۹) برادرم عبدالخالق خان صاحب

جب اپنی مصروفیات کے باوجود مسوّدہ پانچ ماہ میں بفضلہٖ مکمل ہو گیا تو محسوس

ہوا کہ اس اہم نازک کام میں شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (۱۵۹) کی تعمیل میں ایسے
دوستوں سے مشورہ کیا جائے جو نہ صرف حضرت کے صحبت یافتہ ہوں۔ بلکہ حضرت
کے قرآنی نقطۂ نظر کی صحیح یافت بھی رکھتے ہوں۔ چنانچہ اس ناچیز نے برادرِ
مکرم مولوی عبدالخالق خانصاحب سے اس کی خواہش کی۔ صاحبِ موصوف
تقریباً بتیس سال حضرت کے فیضِ صحبت سے سرفراز رہے۔ نہ صرف یہی بلکہ
بعض علمی کاموں میں ایک حد تک حضرت کے ساتھ شرکت کی آپ کو سعادت
حاصل رہی۔ آپ کی باریک نظر اور ذہانت و ذکاوت کی حضرت قبلہ تعریف
فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اکتوبر ۱۹۶۱ء تا ختم مئی ۱۹۶۲ء ہمارے مدارس
کی موسمی تعطیلات میں اپنا قیمتی وقت دیا۔ اور میں نے تفصیلی نظرِ ثانی کی غرض
سے موصوف کی فرصت کے لحاظ سے وقفہ وقفہ سے ملفوظات کے پورے
مسودے کو دو دفعہ سنایا۔ آپ کی توجہ، دقتِ نظر اور مخلصانہ قیمتی مشوروں
کا شکریہ واجب ہے۔ جَزَاهُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔ اس مکمل نظرِ ثانی
کے بعد برادرم ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے بھی ایک ہفتہ تک پہلی آٹھ فصلیں
دیکھیں اور ضروری مشورے دیئے۔ بعض اور احباب نے بھی ہمت افزائی فرمائی
اور مخلصانہ دعائیں دیں اور بعض نے کتابت و طباعت کے مراحل میں مدد فرمائی
جس کے لئے مؤلف ان سب کا تہہ دل سے شکر گذار ہے۔ برادرم احمد حسین
خاں صاحب لکچرار عربی نے پریس کی کاپی کی تصحیح میں حصّہ لیا۔ دورانِ کتابت
میں برادرم عبدالسلیم لکچرار اردو کو اکثر مقامات سنانے کی مسرت حاصل کرتا۔
اور زبان کی حد تک کبھی کبھی مشورے رہتے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو
دارین میں صحیح معنی میں جزائے خیر عطا فرمائے (آمین)

(۲۰) فرمائشِ احباب | دوست احباب کی ہر چہار طرف سے فرمائش تھی

تاکید تھی کہ ملفوظات جلد لکھیئے، شائع کیجیئے۔ خدا کا شکر ہے اُن کی خوشی
پوری ہوگئی۔ جو لوگ حیاتِ ایمانی کے قائل ہیں۔ دل میں اولیاء اللہ سے
عقیدت و محبت کا ولولہ رکھتے ہیں اور حضرت کی صحبت سے فیض یاب نہ
ہو سکے۔ اُن کے لئے یہ ملفوظات نہ صرف ایمان افروز ہونگے بلکہ انشاءاللہ
حضوری کا فائدہ بخشیں گے۔ بفضلہ اس میں حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں
سے متعلق ہدایات پیش ہیں۔ جو ہر طبقۂ خیال کے لئے علماً و عملاً مفید ثابت
ہونگی۔ انشاءاللہ

حضرت کے ملفوظات بفضلہ ترتیب پاکر تیار ہوگئے۔ اور

(۲۱) قرآنی سند | قرآن کریم سے سند چاہی تو یہ ارشاد ملا۔
وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ (۲۲:۲۴)
سبحان اللہ، قولِ طیّب، بڑا انعام ہے۔ اور صراط الحمید کا عالی مقام ہے۔
سچ پوچھیئے تو صراط الحمید (صراطِ مستقیم) کے سفر میں قولِ طیّب ہی زادِ راہ
ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس کے برکات نصیب کرے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا۔
اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ بحقِّ نبیٍّ کریمٍ۔ بِالْمُؤْمِنِيْنَ
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ وَمَا تَوْفِيْقُنَآ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيْمِ۔

اَحْقَرُ الْعِبَادِ
خادمِ محمد عبدالحلیم الیاسی
محرم الحرام ۱۳۸۲ھ م جون ۱۹۶۲ء

مسجد پیر پاشاہ قرآن منزل
۱۳۸ - بیرون دروازہ دبیر پورہ
حیدرآباد - ۲۳ - انڈیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
صلِّ وسلّم علیٰ رسولہ الکریم

فصلِ دوّم

توحید و رسالت

(۱) مؤلف کے نام حضرت کے آخری مکتوب کا اقتباس

بیت السلام۔ سیف آباد۔ حیدر آباد۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۵۸ء
حلیم میاں سلّمکم اللہ تعالیٰ

تمھارے پچھلے خط کا جواب روانہ کر چکا ہوں۔ وصول ہوا ہوگا۔ آج تمھارا دوسرا خط مورخہ ۱۲ ستمبر پہنچا کہ تمھارا تبادلہ ہو گیا۔ اطمینان ہوا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (پ۱۸) اللہ تعالیٰ نئی جگہ مبارک کرے۔ اور ماحول کو موافق رکھے۔ تم بھی تجربہ سے کام لو۔ اسباب کے ظاہری ملحوظات کا بھی خیال رکھو۔ انھیں نظر انداز نہ کرو کہ وہ بھی کچھ حقیقت رکھتے ہیں۔ البتہ دین و ایمان کے معیار پر، حق و باطل کا امتیاز تنبیہت کے محل پر واجب ہے۔ مقدم ہے۔ جہاں یہ محل متحقق اور واضح نہ ہو۔ بلکہ نفسانیت یا غفلت کی آمیزش کا احتمال ہو وہاں برکت اور نصرت کی گنجائش بھی نسبتاً کمتر رہے گی۔ یوں بعد کو توبہ و استغفار سے تلافی ہو کر گنجائش بڑھ جائے تو دوسری بات ہے۔ جیسا کہ اس موقع پر نسبت کا ظہور ہوا۔ مگر اپنی غفلت و کوتاہی سے 'ھُوَ الظَّاھِرُ' کو نظر انداز کر کے 'ھُوَ الْبَاطِنُ' سے غیر معمولی مطالبہ کرنا درست نہیں ہے۔ 'اَلرَّحْمٰن' کی عمومی حکومت بھی 'اَلرَّحِیْم' کی خصوصی حکومت کی طرح واجب الاطاعت ہے۔ دونوں کی اطاعت عبدیت میں لازم ہے۔ مجذوبیت کی دوسری بات ہے۔

مگر وہ بھی ایک خامی ہے تکمیل طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ حسبِ حیثیت عبدیت میں کمال عطا فرمائے۔ بطفیل عبدہٗ و رسولہٗ صلی اللہ علیہ وسلم۔ توفیق و استقامت کا جس قدر شکر ادا ہو کم ہے۔ اور کیسا فضل ہے کہ بچے بھی اس سرفرازی میں شریک رہے۔ فالحمد للہ۔

مگر تا آنکہ شکر میں فخر کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ پوری احتیاط رہے۔ یہ غفلت بہت نازک مگر بہت خطرناک ہے۔ . . . . . اللہ کے فضل سے اسم عفوّ نے کئی بار بچا لیا۔ . . . متانت کی ضرورت ہے۔ اور شکر و استغفار اپنا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ قایم رکھے۔ فالحمد للہ فقط

وَالدّعا

الیاس برنی

(۲) اِسلام کی امتیازی خصوصیات (عنوان ۱ تا ۱۶)

(خلاصہ تقریر جلسہ میلاد النبیؐ منعقدہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد انڈیا جمعرات ۲۸ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ)

فرمایا۔ میں نے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اِسی نقطۂ نظر سے میں آپ حضرات کو دینِ اسلام کے مطالعے کا مشورہ دوں گا۔ اس مجلس میں تفصیلات پیش کرنے کا موقع نہیں۔ اس لیے میں بنیادی اُصولِ اِسلام کو پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

(۱) قرآن کے امتیازی خصوصیات
قرآن۔ اصلی متن

اس وقت اِسلام، عیسائیت، یہودیت، ہندو دھرم، بُدھ مت، زرتشتیت اور کنفیوشیت دُنیا کے بڑے مذاہب سمجھے جاتے ہیں۔

اِن مذاہب کی بنیادی کتابیں اپنے اپنے مذہب کے نظامِ تعلیم کے لیے اصلی سند بھی

جاتی ہیں۔ ان سب کتابوں میں قرآن ہی وہ واحد آسمانی کتاب ہے جس کا قطعی، قوی دعویٰ ہے کہ وہ مکمل کلامِ الٰہی ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوا۔ اور یہ امر اہلِ تحقیق کے نزدیک بھی مسلّم ہے کہ قرآن ہی دنیا میں وہ کتاب ہے جس کا اصلی متن تواتر کے ساتھ محفوظ و محقق ہے۔ دوسری کتابیں یا تو ایسا دعویٰ نہیں کرتیں۔ یا کم و بیش اپنے کلامِ الٰہی ہونے کی تعبیر و تاویل کرتی ہیں۔ یا اگر وہ ابتدا میں کلامِ الٰہی رہی بھی ہوں تو سمجھا جاتا ہے کہ امتدادِ زمانہ کی وجہ سے ان کے اصلی متن میں متعدد تغیرات واقع ہو گئے ہیں۔ یا بعض حالات میں ان کی اصلی شکل غائب ہو گئی۔ اور اُس کی جگہ ان کے پیروؤں کے اقوال و تحریرات نے لے لی۔ اس سے منشائے ربانی یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بعد کسی اور کتابِ آسمانی کی تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اور اب یہ حقیقت ناقابلِ انکار بن گئی ہے۔ کہ قرآن کی توحید کی تعلیم دوسرے اہلِ مذاہب پر قوت سے اثر انداز ہو رہی ہے۔

(۲) عربی زندہ زبان

متن کے بعد دوسری اہم چیز زبان کا مسئلہ ہے کہ قرآن اپنی اصلی مکمل حالت میں ایک زندہ ترقی پذیر زبان عربی میں پایا جاتا ہے۔ جو کم و بیش تمام دنیا میں رائج ہے۔ بہت سے ممالک میں بولی جاتی ہے۔ اس زبان میں تہذیب، علوم و ادب کے خزانے ہیں۔ اخبار و رسائل ہیں۔ اس کے برخلاف دیگر مذہبی کتابیں انتہائی قدیم زبانوں میں پائی جاتی ہیں جن کا اب چلن نہیں یا وہ تقریباً مفقود ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان میں سے بعض کتابوں کو کھینچ تان کر ترجموں میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن ہی وہ اصلی بنیادی کتاب ہے جس کا اصلی متن دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے (دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ طبع نہم و یازدہم) اس کے برخلاف دیگر

مذاہب کی کتابوں کو اپنی تحدیدات کی بنا پر یہ بات نصیب نہیں۔ قرآن ہی کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ دنیا میں لاکھوں اشخاص پورے قرآن کے حافظ ہیں۔

(۳) مقابلے کا بہترین طریق

مذاہب کے باہمی تقابل اور جانچ کا بہترین طریق یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سب مل کر اب بھی ہر مذہبی کتاب کی سطر سطر، لفظ لفظ، حرف حرف پڑھ کر اہم مذہبی ٹکنیکل (فنی) مسائل کی علیٰحدہ علیٰحدہ فہرستِ اصطلاحات تیار کریں اور فریزیالوجی (مجموعۂ محاورات) بنائیں۔ اور دیکھیں کہ ہر مذہب کیا کیا تصورات پیش کرتا ہے۔ جس طرح کیمیا، طبعیات، معاشیات وغیرہ کے ٹکنیکل مسائل کی فہرستیں بنائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ان کی بھی فہرست بنائی جائے۔ مثلاً معاشیات کا ماضی اور حال میں مقابلہ کیا جائے تو اگر بینک کا لفظ کسی قوم کی تاریخ میں نہ ملے تو فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس قوم میں بینک کا علم و رواج نہ تھا۔ اسی طرح ہر مذہبی کتاب کی فہرستِ اصطلاحات تیار کی جائے اور تقابل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہبِ اسلام قرآن کے ذریعے انسان کے لیے ایک کامل نظامِ حیات پیش کرتا ہے جو انتہائی جامع، مربوط و منظم ہے۔ انسانی زندگی کے متعلق قرآن کے تصورات انتہائی وسعت، رفعت، کثرت و وضاحت رکھتے ہیں۔ یعنی اس کے تصورات بے حد وسیع، نہایت ارفع و اعلیٰ، بہت کثیر اور انتہائی واضح اور روشن ہیں۔ اور مجھے یہ سب چیزیں اکٹھی جیسے دینِ اسلام میں ملی ہیں، کہیں نہ پا سکا۔

(۴) دینِ کامل

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے سابقہ سب پیغمبروں اور اُن کی کتابوں کی تصدیق کو جزوِ ایمان بنایا۔ اسلام کے نزدیک مذاہب میں تفریق نہیں اور نہ رسولوں میں تفریق ہے۔ آیت: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۳/۸) اس پر دال ہے۔ بلکہ قرآن کہتا ہے۔

سب مذاہب حق ہیں۔ ایک ہی پیام لائے ہیں۔ البتہ ایک میں تھوڑے بھول ہیں تو دوسرے میں زیادہ۔ قانونِ قدرت کے تحت، ہر چیز کو ترقی کرتے کرتے کامل ہونا ضروری ہے لهذا مذاہب نے ترقی کرکے عروج کی آخری کامل شکل یعنی اسلام میں ظہور کیا۔ گویا ستارے مل کر آفتاب بن گئے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵/۳) (ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل مکمل کردیا۔ اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی۔ اور تمہارے لیے اسلام ہی کو بلحاظِ دین پسند کیا۔)

(۵) خاتم النبیینؐ اور تکمیلِ علمِ نبوت

رسول اللہ صلعم سے قبل، اس عالم میں ہر ملک کی ضروریات اور خاص حالات کے تحت رسول آیا کرتے تھے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سحر کا زور تھا تو عصائے موسوی کا معجزہ عطا فرمایا گیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فنِ طب بہت عروج پر تھا تو آپ کو مسیحائی کے معجزات عطا ہوئے۔ گویا مثلیت میں فوقیت عطا ہوئی۔ اس طرح مقام و وقت کی حد تک اُن کے کام ختم ہوگئے۔ لیکن اب دنیا کے حالات بدلنے والے تھے۔ حمل و نقل کی سہولتوں اور سائنس کی ایجادات ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعے تمام دنیا ایک شہر ایک محلہ بلکہ ایک گھر بننے والی تھی۔ اس لیے سارے عالم کو ایک ہی پیام کی ضرورت داعی ہوئی۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم کو (رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۲۱/۱۰۷) اور کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا (۳۴/۲۸)) سارے عالموں اور ساری انسانیت کے لیے رحمت اور بشیر و نذیر بنا کر قرآن کا پیام دے کر بھیجا گیا۔ اور آپؐ جلال و جمال کا مظہر بن کر تشریف لائے۔ جس طرح ہر چیز ترقی کرتے کرتے

کمال کو پہنچتی ہے، اسی طرح پیامِ کتبِ سماوی ترقی کرتے کرتے قرآن بن گئے۔ اور نبی ترقی کرتے کرتے محمدؐ خاتم النبیین تشریف لائے۔ لهذا اسلام ہی دنیا کے لیے جدید ترین مذہب ہے۔

(۶) سیرتِ نبویؐ کی بے نظیر تاریخی تفصیلات

رسول اللہ صلعم کی امتیازی خصوصیات پر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ آپ کی زندگی کی ہر حرکت وسکنت کو اس دنیا میں اپنے اور پرائے دونو نے تحقیقات سے محفوظ کردیا ہے۔ مسلمانوں نے حضورؐ کے تفصیلی حالات کو روایت و درایت کے معیارِ صحت کے مطابق، اتنی صحت و خوبی و اہتمام سے محفوظ کردیا کہ تاریخ میں اس کا جواب ملنا دشوار ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے تقریباً ایک لاکھ روایت کرنے والوں کے متعلق رجال کا فن بنا جس میں ان کی فہم دیانت، صداقت، امانت اور زندگی کی دیگر جزئیات تک محفوظ کردی گئی ہیں جب صحابہ اور راویوں کے حالات کے بیان میں یہ اہتمام ہے تو خود اپنے آقا رسول اللہؐ کے متعلق انھوں نے کیا کچھ اہتمام نہ کیا ہوگا۔ دنیا میں یہ ایک زندہ معجزہ ہے کہ کسی اور پیغمبر کی سیرت و زندگی کے حالات آج تک رسول اللہؐ کے حالات کی طرح صحت و تفصیل، حزم و احتیاط و تحقیق کے ساتھ، اتنے مسلسل ثقہ راویوں کے ذریعے مرتب و محفوظ نہیں کئے گئے اور نہ اس کی کوئی نظیر مل سکتی ہے۔ تاریخ میں کوئی اور اتنا مشہور اور بنی نوعِ انسان سے اس قدر بے تکلف مجانست رکھنے والا یا انسانیت سے اتنی موانست رکھنے والا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ جملہ معاملاتِ زندگی میں آپ کی اتباع کا علم، جس انتہائی یقین کے ساتھ آسان ہے کسی اور کا ممکن نہیں۔ آپ تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ دیگر مذاہب کے پیروؤں نے متضاد بیانات کی وجہ سے اپنے پیغمبروں کو افسانوی شخصیتیں بنا دیا تھا اور سچ پوچھئے تو قرآن

ہی کے طفیل میں بہت سے پیغمبروں کے نام اور کام اور اُن کی پاکیزہ سیرتیں بے لوث رنگ میں دُنیا کے سامنے ظاہر ہوئیں۔ بنظرِ انصاف سے دیکھئے تو یہ بھی قرآن کا بڑا احسان ہے۔

(۷) کامل عُروج۔ کامل نُزول دوسری خاص نکتہ کی بات حضورِ انورؐ کی شخصیت کے متعلق یہ ہے کہ عُروج کی بھی حد نہیں، اور نزول کی بھی حد نہیں۔ یعنی عُروج کامل، نزول کامل۔ یہ ایک ایسا اعجاز و کمال ہے جو سارے عالم میں حضورؐ کا امتیاز ہے۔ اسی عروج و نزول پر نظر کر کے دو طبقے بن گئے۔ ایک ایسے مشائخ جنھوں نے صرف عروج پر نظر کی تو رسولؐ اللہ کو اللہ بنا دیا۔ دوسرے وہ وہابی جنھوں نے صرف نزول پر نظر رکھی تو مِثلُنا کہہ دیا۔ یعنی رسولؐ اللہ ہماری طرح معمولی آدمی ہیں یا زیادہ سے زیادہ بڑے بھائی ہیں۔ دونوں صریح غلطی پر ہیں۔ رسولؐ اللہ کے عروج کا کیا کہنا کہ اس کی تفصیل سے قرآن بھرا ہوا ہے کہ دَنٰی فَتَدَلّٰی (نزدیک ہوا پس اُتر آیا) بلکہ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (۲۷) (پس تھا قدر دو کمان کے یا زیادہ نزدیک ہوا)۔

لیکن نزول خود بھی اس ذاتِ مُبارک کا کمال ہے۔ کسی بڑے آدمی کا عروج ہی قابلِ تعریف نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے نزول میں کمال کی وجہ سے اس کی شان ظاہر ہوتی ہے اور محبوبیت بڑھتی ہے۔ جو جتنا بلند ہوتا ہے اُسے اتنا نیچے اُترنا بھی طبعًا اور فطرۃً پسندیدہ ہے۔ مثلاً اگر ہُما یا باز جو آسمان کی بلندیوں پر اُڑتا ہے اور اُڑا کرتا ہے جب شکار کو دیکھتا ہے تو غوطہ لگا کر زمین تک آکر شکار کو لے اُڑتا ہے۔ اگر اتنا نزول نہ ہو تو اس کا کمال نہ رہا۔ اسی طرح پیراک کا اس وقت تک کمال نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ بلندی سے غوطہ زن ہو کر پانی میں گھس کر تہ کی مٹی نہ نکال لائے۔ اسی طرح جسمانی صحت کی خوبی یہ ہے کہ کھڑا ہو کر اتنا جُھک سکے

کہ زمین کو ہتھیلیاں یا اُنگلیاں لگ جائیں۔ اور اس کے بعد پھر اُسی طرح پستی سے بلند ہو کر کھڑا ہو سکے۔ نہ صرف یہی بلکہ فطرت کا مقتضا ہے کہ اگر کسی بڑے آدمی سے ایک چھوٹا آدمی ملے اور بڑا آدمی چھوٹے آدمی کی سطح پر آ کر اگر بے تکلف ہو جائے اور خوشی سے باتیں کرے تو وہ اپنے آدمیوں میں کہے گا میں تو بہت بڑا آدمی سمجھا تھا لیکن ان سے ملنے پر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا اپنے بھائی سے بے تکلف ملا۔ مطلب یہ کہ فطرت کہتی ہے۔ نزول کامل ہونا چاہئے۔ اس کے برخلاف کوئی شخص کسی بڑے سے ملا لیکن اس نے شان کی، تو وہ مغائرت اور اجنبیت محسوس کرے گا اور کہے گا۔ ملا تو تھا لیکن آخر وہ بڑے آدمی ہیں۔ یعنی نزول کامل نہ تھا۔ اسی اُصولِ فطرت کے تحت، یورپ میں چھوٹی جماعتوں کو بُوڑھے قابل پروفیسر پڑھاتے ہیں جو اعلیٰ علمیت کے باوجود بچوں کے معیار پر نزول کرتے ہیں۔ اور ایسی مجانست و محبت دِکھاتے ہیں کہ بچوں کی طرح ہنستے ہیں، کھیلتے ہیں اور اسی میں بڑا کلچر اور علم بچوں کو دیتے ہیں۔ ورنہ بلند ہی بلند رہیں اور تقدس اور افضلیت دکھاتے رہیں تو بچے اُن سے کچھ نہ سیکھ سکیں۔

مختصر یہ کہ یہ اُصولِ فطرت یعنی نزول کا کمال رسولؐ اللہ میں بدرجۂ اکمل واتم تھا۔ اتنا زیادہ کہ جن کی نظر افضلیت پر نہ ہوئی کہنے لگے یہ تو ہماری طرح ہیں۔ آپ اس درجہ مجانست و ہم آہنگی برتتے کہ بچے آپ سے بے تکلف ہو جاتے اور آپ اُن کے ساتھ کھیلتے۔ اور بڑے بُوڑھے، عورت مرد، بدوی حضری سب آپ سے مجانست محسوس کرتے۔ وہ تو بلند تھے اور ہیں، لیکن نیچے اُتر کر پستی میں گرے ہوؤں کو ہاتھ پکڑ کر پہاڑ کی بلندیوں پر لے جانا وہ کمال ہے، جو حضورؐ نے انجام دیا۔

(۸) انسان کا عروج و نزول خود انسان جسمانی لحاظ سے اتنا کمزور ہے کہ

گدھے کے برابر بوجھ نہ اُٹھا سکے۔ سانپ بلکہ مچھر تک سے ڈرے۔ اور کتّے بلّی کے برابر دوڑ نہ سکے۔ لیکن روحانیات کے قطعِ نظر، اس کے مادّی عروج کا بھی یہ حال ہے کہ جوہری بم کے ذریعے ایک منٹ میں ایک برِ اعظم کو ختم کر سکتا ہے پس اس کے عروج کو نظر انداز کرکے، اس کے نزول کی بنا پر اس کے مرتبہ کا تعین کرنا سراسر جہل ہے۔

(۹) اسلام کی نعمتوں کی کثرت

اسلام کی نعمتیں اس قدر بداہت، وضاحت و کثرت کے ساتھ ہیں کہ مسلمانوں کو خبر نہیں کہ وہ کتنی بے شمار نعمتوں سے مستفید ہو رہے ہیں جو چیزیں ہمارے پاس روزمرّہ معمولی ہیں وہ اوروں کے پاس غیر معمولی اہمیت پاتی ہیں، کیا بلحاظِ کیفیت اور کیا بلحاظِ کمیت۔ لیکن انسان اکثر ندرت پسند واقع ہوا ہے۔ اگر دُمدار ستارہ کبھی نکلے تو لوگ ضروری کام کاج بھی چھوڑ کر دیکھنے لگتے ہیں۔ اور روزانہ اتنا بڑا آفتاب نکلتا ہے، اگر کوئی اسے دیکھنے کو کہے تو اس پر تعجب کریں گے۔ غرض کسی چیز کی کثرت احساسِ قدردانی کو کم کر دیتی ہے گویا وہ ہے ہی نہیں۔ ہم خود ہیں۔ دُنیا جہان کو ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن خود کا پتہ نہیں۔

(۱۰) توحید و رسالت

اسلام امن و سلامتی، آزادی، حق و انصاف، حُسن و خوبی کا مذہب ہے۔ فطری عملی مذہب ہے۔ محبت، رحمت، طہارت، شرم و حیا اس کے خمیر میں داخل ہیں۔ یہ دینِ یُسر ہے۔ اس میں شدائد پسندی نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلام کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ توحید ہے۔ اس میں وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کی تاکید ہے۔ قرآن نے اللہ کی ذات،

صفات، افعال، آثار پر بالتفصیل، بالتکرار بحث کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مقصود کچھ اپنے کو منوانا نہیں، بلکہ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ اللہ تو اپنی ذات کی حد تک غنی، حمید ہے، اور خلق کی حد تک: اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (۳/۲) (تحقیق اللہ البتہ بے پرواہ ہے سارے عالموں سے) اسلام کی دوسری خصوصیت رسالت ہے جس سے عبد و رب کے مابین تعلق کا علم ملتا ہے۔ اسلام نے عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ کو خوب صاف کیا۔ اتنا صاف کیا کہ اسلام کا معجزہ ہے کہ رسولؐ کے قرب میں، قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (۲۷/۵)، صفات میں رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۱/۵)، افعال میں مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ (۹/۱۹) اور آثار میں يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (۲۶/۹) کی شان نظر آئے۔ لیکن مجال نہیں کہ کسی محل پر عبدیت اُلوہیت سے ٹکرا جائے۔ عبد عبد ہے۔ رب رب ہے۔ اس کو اس خوبی سے اسلام نے صاف کیا کہ کوئی شک باقی نہ رہے۔ دوسرے مذاہب میں کسی پیغمبر، رِشی، بادشاہ میں عظمت و کمالات کی ذرا سی الٰہی تجلیات نظر آنے لگتی ہیں تو اُلوہیت سے ٹکر ہو جاتی ہے اور اُسے خدا یا اس کا اوتار، بیٹا یا بیوی بنا دیتے ہیں۔ لیکن اسلام کا کمال یہ ہے کہ اس سے لاکھوں گُنا زیادہ عظمتِ انسانی کا علم دینے کے باوجود، رسول اللہؐ کی عبدیت کو اتنا واضح کر دیا کہ شک کی گنجائش نہ رہی۔ بلکہ عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ ہمارا ایمان ہے۔ ہمارے عقیدے کی جان ہے۔ قرآن میں رسول اللہؐ کو سراجِ مُنیر (روشن سُورج) کہا گیا ہے۔ سُورج گو نُور کا مخزن ہے لیکن آخر وہ ایک تعیّن ہے۔ سراجِ منیر ہی سہی۔ اسی تعیّنِ محمدیؐ میں اللہ کے فیضانِ نور و وجود کا کمال نظر آتا ہے۔

(۱۱) عبدیت و رسالت

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رسول کی عبدیت کا تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔ اور رسالت کا

تعلق مخلوق سے ہے۔ ان دونوں کو غلط ملط نہ کرنا چاہیے۔ لیکن عبدیت مقدم ہے، ربوبیت سے مکر نہیں۔ ارشاد ہے: مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (۲۷/۱۱) (چلادیا دو دریا کو ایک دوسرے سے لگ رہے ہیں۔ درمیان ان کے پردہ ہے۔ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتے) عبد کے پاس جو کچھ ہے وہ مالک (رب) کا ہے۔ پھر وہ امانت کا حق ادا کرتا ہے کہ امانت اُسی کی جاتا ہے۔ پھر اللہ کے امر کے تحت خلیفہ (نائب) بنتا ہے تو سارے عالم پر حکومت کرتا ہے اور پورا عالم اُس کے سامنے سر جھکاتا ہے۔

(۱۲) انسانیت کی ترقیاں

اسلام انسانیت کی ترقیوں کے لیے آیا ہے اور بڑا پیام لایا ہے۔ انسان بڑی حقیقت ہے۔ یہ عروج و نزول دونوں کا جامع ہے۔ یہ مٹی سے بنا ہے جس میں کامل نزول ہے اور نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (۲۷/۱۱) کا حامل ہے جس میں عروج ہے۔ انسانی تخلیق پر فرشتوں نے اعتراض کیا اور کہا۔ یہ فساد مچائے گا۔ ہم تقدیس کرتے ہیں۔ اُن کی نظر انسانی عروج کی طرف نہیں گئی۔ اللہ نے فرمایا۔ تم عروج و نزول کی جامعیت کو نہیں جانتے یعنی تم بلندی (عروج) پر ہو۔ تم میں نزول کی صلاحیت نہیں۔ قرآنی تعلیم بتاتی ہے۔ اللہ کیا۔ رسول کیا۔ انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ بذریعہ عبادات کیسا ہونا چاہیے۔ اور انسان کا ربط انسان سے معاملات کے تعلق سے کیسا ہو۔ نیز انسان کا کائنات اور ارواح سے کیسا ربط ہو۔ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ الخ (۲۵/۴) اس کی شاہد ہے اور سائنس کی ترقیات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔

(۱۳) مساوات و اُخوّت

اسلام میں دو اور خاص امتیازی نعمتیں مساوات اور اُخوّت ہیں جو دیگر ادیان میں نہیں۔ یوں کہنے کو

دوسرے لوگ یہ الفاظ بولتے ہیں لیکن معنی کا پتہ نہیں۔ ہمارے پاس یہ نعمت عام ہے دوسری جگہ خاص بھی نہیں کہی جا سکتی۔ مثلاً کسی مسجد میں جائیے ایک غریب سے غریب مسلمان کو حق حاصل ہے کہ امیر کے برابر کھڑا ہو کر نماز پڑھے، معانقہ کرے، ساتھ بیٹھ کر کھائے، بھائی سمجھے۔ اس کے برخلاف عیسائی ممالک میں عبادات تک کے لیے گوروں کا چرچ الگ، کالوں کا چرچ الگ بلکہ ہوٹل مدرسے تک الگ۔ یورپ کے پاس قلب نہیں، دماغ ہے۔ دماغ میں بھی نفسانیت ہے۔ وہ جمہوریت کا لفظ بولتے ہیں حالانکہ منافقت ہوتی ہے۔ عرب بدو آج بھی ایک روٹی ملے تو دو چار بدوؤں کو بلا کر کھاتے ہیں۔ اسلام کے احکام کے مطابق بانٹ کر کھاؤ تو کمیونزم، بالشیویزم پیدا نہیں ہو سکتے۔ اپنی تعلیمات، اُخوّت و مساوات وسیع نظامِ وراثت اور زکوٰۃ صدقات خیرات کے ذریعے اسلام ہی سب مصیبتوں کا حل ہے۔ چار غریب بھوکے ہیں۔ ایک امیر بریانی کھاتا ہے اور دِکھا دِکھا کر کھاتا ہے۔ آگ نہ بڑھے تو کیا ہو۔

(۱۴) اسلام ہی حل

کہتے ہیں آج کل سارے عالم میں فساد ہے۔ لڑائی ہے۔ ان کا سدھارنا مشکل ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا عرب سے بڑھ کر مفسد، جاہل، جھگڑالو، بہادر، سات پشت کا بدلہ لینے والی کوئی قوم دنیا میں تھی یا ہے۔ لیکن اسلام نے چند برسوں میں کس طرح انھیں منظم کر کے انقلاب برپا کر دیا کہ انھوں نے اتفاق کے کرشموں سے ساری دنیا کو حیران کر دیا۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ انھیں اسلامی تعلیمات پر اگر دنیا عمل کرے تو آج بھی تمام انفرادی اجتماعی اور بین الاقوامی خرابیوں کی اصلاح نہ ہو سکے۔

(۱۵) حقوق اللہ، حقوق العباد

قرآن میں عبادات و معاملات کا خوب ذکر ہے۔ لیکن معاملات پر خصوصیت سے زور ہے جو

حقوقُ العباد ہیں۔ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ انسان کی تکریم و مرتبت کا مدار تقویٰ پر ہے۔ اور تقویٰ کا مدار معاملات کے بہ حُسن و خوبی انجام دہی پر ہے آیات :- اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۲۶/۱۴) اور لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا الخ (۲/۱) پڑھ لیجئے۔ حقوق اللہ (عبادات) معاف ہو سکتے ہیں لیکن حقوقُ العباد میں کوتاہی ناقابلِ معافی ہے۔ اِس لیئے ہمیں معاملات میں امانت، دیانت، صداقت سے کام لینا چاہیئے۔

(۱۶) غیر مسلموں کے ساتھ حُسنِ ربط

آخیر میں آپ حضرات کو بتاؤں گا کہ قرآن غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کے ربط کی تعلیم دیتا ہے۔ مُنافرت کی یا محبت کی۔ باہمی منافرت اسلامی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے۔ اسلام ہی کا یہ ایک امتیاز ہے کہ اس نے دیگر مذاہب اور اُن کی کتابوں اور پیغمبروں کی تصدیق کو جُزوِ ایمان بنا کر دیگر قوموں سے مُجانست و مُوانست کی تعلیم دی تاکہ باہم اجنبیت نہ رہے۔ ہم اُن کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ توحید اور اسلام کا پیام کوئی نیا پیام نہیں ہے۔ البتہ یہاں ایک نازک فرق ہے وہ یہ کہ ہم قرآن کے لحاظ سے ان سب انبیاء کو مانتے ہیں جن کا ذِکر قرآن میں ہے اور نہیں بھی ہے۔ لیکن ہم نام سے خاص طور پر اُن کو مانتے ہیں جن کا قرآن میں نام سے صاف ذِکر ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام وغیرہ۔ لیکن سری کرشن جی اور گوتم بُدھ وغیرہ کے متعلق اُن کی مذہبی کتابوں اور اچھی باتوں کی وجہ سے حُسنِ ظن رکھتے ہیں ہم انھیں صدیق، نیک، مقرب بندے کہنے کے مجاز ہیں۔ لیکن نبی اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک ہمارے پاس قرآن میں ان کے متعلق کوئی حُکم موجود نہ ہو۔

غیر مسلموں کے ساتھ ربط کی خاص آیات ہیں :- اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ

بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۱۴/۲۲) (اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بُلائے اور اُن کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے)۔ مزید حُکم ہے :- وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ (۷/۱۹) (مت بُرا کہو اُن کو جن کو یہ لوگ اللہ کے سوائے پُکارتے ہیں (حالانکہ وہ باطل ہیں) پس وہ بُرا کہیں گے اللہ کو حد سے گزر کر جہالت سے (جس سے تم پر ذمہ داری آئے گی)۔ لہٰذا حُسن و خوبی سے معاملت کریں ان کو اور اُن کے معبودوں تک کو بُرا نہ کہیں۔ اُن کے پیغمبروں اور کتابوں سے حُسنِ ظن رکھیں۔ مُنافرت کے بجائے موانست و مجانست بڑھائیں تاکہ تبلیغ کی راہ نکلے۔ البتہ اُن کو حُسن و خوبی سے یہ بتانا چاہیئے کہ توحید کا پیام نیا نہیں۔ امتدادِ زمانہ سے کتابوں، ترجموں وغیرہ میں تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ ان اِن اہم مسائل میں تمھاری کتابوں سے تمھارا علم اتنا ہے۔ اور ہمارے پاس اس قدر زیادہ ہے۔ اتنا بہتر ہے۔ اگر تم پسند کرو تو اِن اچھی باتوں کو اختیار کرو۔ لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (۲/۲) (دین میں جبر نہیں۔ اختیار ہے) لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (۲۲/۲۲) (تمھارے لیے تمھارا دین، میرے لئے میرا دین) اسلام کا اُصول ہے۔ پس باہمی منافرت دینِ حق کی تبلیغ کے بجائے رکاوٹ کا باعث ہو سکتی ہے۔ پہلے کے اولیاء اللہ نے مجانست کے ذریعے رام کیا۔ اس مُلک میں خواجۂ اعظم اجمیریؒ نے محبت سے قلوب کو مُسخّر کیا اور لاکھوں کو مُسلمان کیا۔ اگر کافر کافر کہہ کر دُور کیا ہوتا تو ایک بھی مسلمان نہ ہوتا۔ یاد رکھو فقیر قلوب کا فاتح ہوتا ہے۔ (ختم تقریر پر دُعا فرمائی)

(۳) کلمۂ طیبہ کا عُروجی و نُزولی رُخ

فرمایا۔ مدینۂ طیبہ کی حاضری کے زمانے میں ایک خاص صحبت میں گفتگو چلی تو میں نے کہا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ نزولی رُخ ہے یعنی شانِ ظہور۔

اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ عروجی رُخ ہے یعنی شانِ ہدایت۔ نزولی رُخ میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اجمال ہے اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ تفصیل۔ اور عروجی رُخ میں مُحَمَّد رسول اللّٰہ اجمال ہے اور لا الٰہ الا اللّٰہ تفصیل۔ مُحَمَّدٌ رسولُ اللّٰہ کے توسّل سے اللّٰہ ملتا ہے۔ اور اسی اجمال کی تفصیل میں لَا اِلٰہ اِلا اللّٰہ کی گوناگوں تجلیات ظاہر و باہر ہیں۔ مُحَمَّدٌ رسولُ اللّٰہ ہی کے عرفان میں اللّٰہ کا عرفان ہے۔ ع اللّٰہ کا عرفان ہے عرفانِ مُحَمَّد۔ ہم رسولُ اللّٰہ کے ساتھ ہیں جن کے ساتھ اللّٰہ ہے۔ نبی کے تعلق کے بیک وقت دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک وجہ اِلَی الْحَق دوسرا وجہ اِلَی الْخَلْق۔ وہ مخلوق کو خالق سے ملاتا ہے جسے برزخ کہتے ہیں۔ سلوک میں شیخ سے جو فیض ہوتا ہے اس میں اوّل سے آخر تک رسول اللّٰہ صلعم کا برزخ دستگیری فرماتا ہے۔

توحید میں 'سُبْحَانَ اللّٰہ' عروجی ربط ہے جو اعلیٰ ترین مقام توحید ہے اور توحید میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہ نزولی اعتبار ہے۔ الحمد للّٰہ کا تعلق اِس عالم سے ہے جو حق تعالیٰ کے نزول و تجلّی کا محل ہے۔

حقایق و معارف کی تفہیم کے لیے بعض صوفیائے کرام نے اپنے وقت کے مروّجہ اندازِ بیان کے لحاظ سے مختلف اصطلاحات استعمال فرمائی ہیں جن سے بعض صورتوں میں لوگوں کو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ لہٰذا حقایق کے بیان کے لیے قرآنی کلمات و اصطلاحات کا استعمال اَسْلَم طریق ہے جس میں حفاظت اور نور ہے۔

(۴) کلمۂ طیّبہ کے فیوض مسلمانوں میں لاکھ اختلاف ہوں۔ لیکن لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ میں کوئی چون و چرا نہیں کرتا۔ اِس کلمہ ہی کو توحید کہتے ہیں۔ اپنے تو کیا غیر بھی اپنے اپنے اندازِ فکر میں اس سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔ اسلام میں توحید انتہا درجے روشن اور درخشاں ہے۔ لَقَدْ

مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا الخ (پ۴) رسالت کتنی بڑی نعمت ہوگی کہ اللّٰہ نے احسان جتایا۔ اس لیے مومن کا بھی بڑا مرتبہ ہے کہ رسول پر ایمان لایا۔ کلمۂ طیبہ کے اقرار و تصدیق سے انسان مسلمان بن جاتا ہے۔ کلمہ کے معنی معلوم نہ ہوں تو بھی کلمہ اثر رکھتا ہے۔ البتہ مدارج کا فرق ہے۔

کلمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللّٰہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ لیکن معبود کے لیے عبد بھی ہے اور رسول بھی ہے۔ عبد وہ ہے جس کے پاس اپنا کچھ نہیں۔ لیکن جب وہ خلعتِ شاہانہ پہن کر آیا۔ اور اس خلعت کو انعامِ شاہی بتایا تو شرک کیسے ہوا کیونکہ سب اللّٰہ کی عطا ہے جس پر عبدیت نہیں کھلی توحید نہیں کھلی۔ اِدھر سے پانی آیا تو کہہ دیا، اِس بادل کا ہے اُدھر سے پانی آیا تو کہہ دیا اُس بادل کا ہے اُس پر سمندر نہیں کھلا۔

کلمۂ طیبہ کے ورد سے بے حد فیوض و آثار آتے ہیں۔ اس کے علم کی جان توحید و عبدیت ہے۔ جس توحید میں عبدیت و رسالت نہ ہو نرا فلسفہ ہے۔ عبدیت نہ ہو تو شرک، رسالت نہ ہو تو کفر۔

(۵) رسالت ناگزیر قرآن بِالتکرار رسالت پر زور دیتا ہے۔ لہٰذا حکمِ ربانی کے تحت ہمارا مقام و منزل، مطلوب و محبوب مُحَمَّدٌ رسولُ اللّٰہ ہونا چاہیے۔ اور مُحَمَّد رسول اللّٰہ کی منزل لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے۔ ہمارا مقصودِ رسالت حاصل ہونے کے بعد، حضورِ انور جتنی چاہیں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی سیر کرا دیں۔ عام طور پر یہ غلط فہمی ہے کہ ابتدا میں مُبتدی و متوسط کے لیے تو رسالت کی ضرورت ہے۔ لیکن منتہی ہونے کے بعد استفاضہ کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ درحقیقت ہر مقام پر جہاں ہدایت ہے، اس کے مقابل اس مقام کی ضلالت بھی ہے۔ لہٰذا ہر محقق

حضورؐ کی رہبری ناگزیر ہے۔ لیکن ایک کج فہم طبقہ کو رسالت کا صرف اِقرار ہے۔ حالانکہ اکابر کو اسی پر اصرار ہے کہ حضورؐ کے بغیر کسی منزل کا صحیح راستہ اور کسی محل کا صحیح حال نہیں مل سکتا۔ ہر محل پر رسالت کا قطب نما موجود ہے جو لازم ہے۔

اس پر ناچیز نے عرض کیا۔ اکابر نے اپنی تعلیمات میں آپ کی طرح اصرار کیوں نہیں فرمایا، تو فرمایا۔ اکابرِ دین کے ماحول میں یہ چیز مُسلّمات میں داخل تھی، جس پر افسوس ہے کہ آج زور دینا پڑ رہا ہے۔ اکابر نے جس طریقے پر بھی تعلیم دی، سب کا محور و کُلیہ رسالت ہی رہا۔ سب کہہ گئے۔ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ۔ اور توحید اسی رسالت کی کنجی سے کھلتی رہی۔ البتہ بار بار یہ کہنے کی ضرورت داعی نہیں ہوئی کہ یہ رسالت سے مل رہی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی ہمیں باغ (توحید) کی سیر کرائے تو ہم لطف اُٹھاتے ہیں لیکن ہر پھول، پھل پر یہ نہیں کہتے کہ آپ نے یہ دکھایا اور یہ دیا، بلکہ دل سے اس محسن کے ممنون رہتے ہیں۔ اللہ کے بعد رسول اللہ کی انتہائی عظمت و اہمیت سمجھ میں نہ آئے۔ اور اُس پر ایمان نہ آئے تو نہ صرف یہ کہ ایمان کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ عظمتِ الٰہی اور توحیدِ اُلوہیت کے یقینی علم کا ایک ذرہ بھی نصیب نہیں ہوسکتا۔ رسالت کے واسطے کے بغیر، توحید کا کوئی پہلو بھی قیاس و وہم سے بڑھ کر اہمیت نہیں رکھتا۔

(۶) رسالت پر قرآن کا اصرار محض توحید کا دعویٰ کرنے سے کوئی مُسلمان نہیں ہوتا جب تک رسالت پر ایمان نہ ہو۔ ارشادِ باری ہے: قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ . . . قُلْ فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ (۱۸/۵) ان آیات میں

اللہ کی مالکیت، رُبوبیت، اور ملکوت پر کافروں کے صریح اقرار کے باوجود اُن کے کاذب ہونے کی آیت آ گئی کہ وہ حق (یعنی رسالت) پر ایمان نہیں لائے اور حیاتِ اُخروی اور توحیدِ اُلوہیت پر ایمان نہیں رکھتے جو توحیدِ رُبوبیت و مالکیت کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ فیصلہ ملاحظہ ہو:- بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۸/۵) (بلکہ لائے ہم اُن کے پاس حق (یعنی رسالت) اور تحقیق وہ البتہ جھوٹے ہیں) کیونکہ رسالت سے انکار ہے، گو توحید کے بعض پہلوؤں کا سطحی اقرار ہے)۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱/۸) (بے شک مُسلمان اور یہودی اور عیسائی اور صابی اِن میں سے جو لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے تو اُن کو اُن کے کئے کا اجر اُن کے پروردگار کے ہاں ملے گا۔ اُن پر نہ (کسی قسم کا) خوف طاری ہوگا اور نہ وہ (کسی طرح) آزردہ خاطر ہوں گے۔

اِس ناچیز نے عرض کیا کہ بعض مادّیت زدہ حضرات اِس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ عمل کی مقبولیت اور نجات کے لیے رسالتِ محمدیؐ پر ایمان ضروری نہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ یہ صحیح نہیں۔ رسالتِ محمدیؐ کا انکار تو بڑی چیز ہے قرآن نے تو رسالت پر ایمان لانے والوں تک کو اِس ادب اور احتیاط کا علم دیا ہے کہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز کو بلند نہ کرو ورنہ تم بے خبری میں رہو گے اور تمہارے سب اعمال حبط ہو جائیں گے۔ یہی نہیں بلکہ سورہ عمران میں آیاتِ میثاق (۳) آئی ہیں اُن کی رُو سے تو تمام

انبیا کو اِس عہد کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ مُحمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت و تائید کریں یعنی اپنی اُمتوں کو مُحمّد رسولؐ اللہ پر ایمان لانے اور آپ کی نُصرت و تائید کرنے کی ہدایت و تاکید فرمائیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سابقہ اُمتوں کا ایمان بھی رسُولؐ اللہ پر ایمان کے ساتھ مشروط تھا۔ پس عملِ صالح مُحمّد رسول اللہ صلعم کی اتباع اور نصرت و تائید ہی کا دوسرا نام ہے۔ اِس سے ہٹ کر عملِ صالح کوئی اور چیز نہیں۔

(۷) ربطِ رسالت دین کی جان

آج کل بہت سے علما اور مُرشدین کثرتِ معلومات پر فخر کرتے ہیں جو از روئے قرآن صحیح نہیں۔ کثرتِ معلومات اصلِ دین نہیں۔ دین کے متعلق کثیر معلومات ہونے سے لازم نہیں آتا کہ اُنھیں ایمان بھی حاصل ہو۔ اگر یہی نظریہ ہو تو مستشرقینِ یورپ کے معلومات تفسیر، حدیث، فقہ کے متعلق اتنے زیادہ رہتے ہیں کہ اکثر مولوی مشائخ اُن سے پانچ منٹ بات نہیں کر سکتے۔ کیا اسی بنا پر اُنھیں مومن کہا جا سکتا ہے؟

دراصل دین و ایمان نبوت سے ربط کا نام ہے۔ ربط اصلِ حیات ہے جس میں محبت سے جان پڑتی ہے۔ حُبِ نبویؐ کے بغیر دین، ایمان کا ربط پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ حقیقی توحید مل سکتی ہے۔ اس کے بغیر دینی معلومات جسدِ بے رُوح ہیں۔ جلانے کی لکڑی ہیں۔ ثمر دار درخت نہیں۔ لہٰذا محبت لازمی ہے۔ زمانۂ حال کے شرور و فتن کا اقتضا یہ ہے کہ تبلیغ میں مُحمّد رسُولؐ اللہ پر بہت زیادہ زور دیا جائے ع بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔

آج کل توحید سارے عالم میں فلسفہ بن چکی ہے۔ نہ ماننے والے بھی اسے ماننے لگے ہیں۔ بلکہ رسالت کو بھی قبول کرنے پر تیار ہیں کہ واقعی انبیاء اخلاق وغیرہ کے لحاظ سے اچھے لوگ تھے۔ لیکن اُن کے ساتھ ایمان و اطاعت کا رابطہ

ضروری نہیں سمجھتے۔ افسوس کہ اب یہی بات بعض کج فہم مولوی بھی پھیلانے لگے ہیں۔ حالانکہ حکم ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴ع۹) (نہیں بھیجا ہم نے کوئی پیغمبر مگر اس واسطے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے)۔ پس اسلام میں رسالت ناگزیر چیز ہے۔ ترقی کے لئے ہر آن اس کا ربط اور اس سے عقیدت و وابستگی لازمی ہے۔ اس پر اولیا اللہ کا اصرار ہے۔ اِسی لئے نامعلوم طور پر محبت و عقیدتِ نبویؐ کے انجکشن دینے ضروری ہیں۔ آج کل راست تخاطب و موعظت سے لوگ بھڑک جاتے ہیں۔ وہ سسٹم اب مؤثر نہیں۔ لہٰذا نفسیات کا لحاظ ضروری ہے۔

(۸) واسطۂ رسالت اور قرآن

انسانیت کی تکمیل حضورؐ کی صورت میں ہوئی۔ آپ سارے اسماء و صفات و کمالاتِ الٰہی کے مظہر بنے۔ لوگ رسولؐ اللہ کی عظمت اور مقام کو نہیں سمجھتے اور نہ یافت ہے۔ اور ذات کی یافت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر توحید کی معمولی ہوا لگ جاتی ہے تو برداشت نہ کر سکیں۔ یہ تو رسالت ہی کا صدقہ ہے کہ اس کے سایہ اور واسطے سے انسان توحید کو برداشت کر لیتا ہے۔ رسالت کی ٹھنڈک میں توحید کی حرارت برداشت کی جاتی ہے، ورنہ بھسم ہو کر رہ جائے۔ اللہ تو لامحدود ہے۔ یافت و شہود سے بالا ہے۔ مقامِ ھُوْ ہے۔ نایافت ہے۔

رسولؐ اللہ کا اقتضائے ذات قرآن ہے۔ اللہ نے سارا علم قرآن کے ذریعے ظاہر کیا۔ کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۱۲/۱) انبیاءؑ تک کو قرآن ہی سے حصّہ ملا۔ رسولؐ اللہ ہی کے واسطے سے انھیں یافت ہوئی۔ ساری یافت علم کی ہوتی ہے۔ اور علم قرآن ہے۔ حضورؐ علم مجسّم ہیں۔ اس لئے جو کچھ یافت ہوتی ہے بفضلہ رسولؐ اللہ کی ہے۔ چنانچہ اولیاء اللہ کا اتفاق ہے کہ رسولؐ اللہ کے

معنیٰ علماً و عملاً قرآن کے ہیں۔ ایمان کے بعد جو شخص جس قدر قرآنی علم و عمل میں لگا ہوا ہے۔ یا جس قدر آیات کے ساتھ لپٹا ہوا ہے اُسی قدر وہ رسول اللہ کے ساتھ لپٹا ہوا ہے، اور اُسے حضورؐ کی معیت و رفاقت حاصل ہے۔

محمدؐ ہی کو برزخ، واسطہ، ذریعہ، توسط، توسّل کہتے ہیں۔ آپ ہر محل پر واسطہ ہیں۔ واسطہ کا یہ مطلب نہیں کہ اُستاد نے کچھ پڑھا دیا باقی ہم خود پڑھ لیں گے۔ یا سفرِ حج کے لیے کسی ایجنسی سے ٹکٹ لے لیا۔ بعد کو ایجنٹ کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہر محل پر رسالت کی ضرورت اسی مناسبت سے بڑھتی جاتی ہے۔ غوث، اقطاب ہر اعلیٰ سے اعلیٰ محل پر انھیں قدموں کے ذریعے ترقی کرتے ہیں۔ ہماری رسائی محمدؐ تک ہے۔ اور محمدؐ کی رسائی اللہ تک ہے۔ وہ چاہیں تو بفضلہ ہمیں رسائی عطا کریں۔

فقیری کا نکتہ یہی ہے کہ جو ملا سو رسول اللہ۔ جو نہ ملا سو اللہ۔ جو کچھ یافت و شہود میں ہے وہی محمدؐ ہے۔ ظہور ہی کو محمدؐ کہتے ہیں۔

؎ جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ (جامیؔ)

(۹) تصدیقِ رسالت کا انعام وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ. لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ (۲۴) (اور وہ جو آیا سچ کے ساتھ اور جس نے اس کو مان لیا۔ یہ لوگ ہی پرہیزگار ہیں وہ جو چاہیں ان کے لیے ہے نزدیک اُن کے پروردگار کے۔ یہ صلہ ہے احسان کرنے والوں کے لیے۔)

ادب کا کام ہر شعبۂ زندگی کے قیام و ترقی اور بقا میں مدد دینا ہے۔

ربوبیت کے علم کو جڑ پکڑتے میں دیر بھی لگتی ہے تاہم بعض جلد ہی سمجھ جاتے

ہیں اور عمل جاری ہو جاتا ہے۔ تصدیقِ رسالت کے ساتھ ہی متقی کی ڈگری ملتی ہے۔ اور اس ربط سے رُبوبیت کے علم کے بعد لَهُم مَّا يَشَاءُونَ کا فیضان جاری ہوتا ہے۔ جب ہم اللہ کو رب بنا لیں تو لَا خَوْفٌ وَلَا حُزْنٌ کا مقام عطا ہوتا ہے۔ خوف کا تعلق مستقبل سے اور حزن و غم کا تعلق ماضی سے ہے۔ اس مقامِ صدق کے بعد نہ ماضی کے متعلق حزن و غم باقی رہتا ہے اور نہ مستقبل کے بارے میں خوف۔

(۱۰) مقامِ حق حضورؐ مقامِ حق پر ہیں۔ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ (۲۷) (تحقیق تو اوپر حق ظاہر کے ہے) غلام وہیں رہے گا جہاں آقا رہے گا۔ جو اس مقام کو دیکھیں گے پہچان لیں گے کہ نسبتِ غلامی کی وجہ سے یہ سرفرازی ہے۔ حضورؐ اعلیٰ ترین مقامِ حق پر رہنے کے باوجود ہم غلاموں کے حق میں رؤف و رحیم ہیں جس کی وجہ سے اعلیٰ مقامِ حق تک ہمیں سرفرازی نصیب ہوتی ہے۔

(۱۱) انسان کے احتیاجات کافر و مومن کے تصورِ کائنات میں بہت فرق ہے۔ کافر چاند، سورج وغیرہ کو مخدوم بلکہ معبود سمجھتا ہے، اور مومن خادم۔ اللہ نے انسان کو مخدوم بنایا ہے اور کائنات کو اس کا خادم و تابع۔

یوں تو کائنات میں ہر چیز محتاج ہے، لیکن سب سے زیادہ محتاج انسان ہے۔ یہ ہر چیز کا محتاج ہے۔ کبھی کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں کسی کا محتاج نہیں رہوں گا چاہے وہ چھوٹی چیز ہی کیوں نہ ہو۔ ورنہ اُسی کا محتاج بنا دیا جاتا ہے۔ انسان کا بال بال محتاج ہے۔ میں نے عرض کیا۔ یوں تو بندہ اللہ کا ہر طرح محتاج ہے لیکن مخلوق کا بھی محتاج ہے۔

فرمایا۔ دراصل انسان اللہ ہی کا محتاج و فقیر ہے۔ اور اللہ کے ظہور کے

مرتبہ میں مخلوق کا محتاج ہے۔ لہٰذا وہ اللہ ہی کا محتاج ہوا۔ علم صحیح ہونا چاہیے۔

عبدیت۔ فقر و احتیاج کا نام ہے۔ احتیاجات بڑھائے جاؤ اور خدا کی خدائی لیتے جاؤ۔ یَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۲۷/۱۲) (آسمان زمین والے اسی سے اپنی اپنی حاجتیں مانگتے ہیں۔ ہر روز وہ بیچ ایک شان کے ہے) جتنا فقر بڑھے گا اسمِ غنی کی تجلی اُسی شان سے ظاہر ہوگی۔ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (۲۲/۱۵) (تم اللہ کے محتاج ہو۔ اللہ ہی بے احتیاج، خوبیوں والا ہے)

(۱۲) عبدیتِ محمدیؐ

ذاتُ اللہ یافت و شہود سے بالا ہے۔ وَرَاءُ الْوَرَاءِ، ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاءِ۔ اللہ تعالیٰ کی کیا شان ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا (۲۵/۵) وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ (۳/۱۱) اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (۷/۱۹) درست۔ لَنْ تَرَانِي (۹/۱) بجا۔ تاہم اللہ دکھائے تو بہت کچھ نظر آئے۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۲۵/۱) (یعنی آفاق و انفس میں ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ حق اُن پر ظاہر ہو جائے گا) خلاصہ یہ کہ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۷/۱۴) (وہی اوّل آخر ظاہر باطن ہے۔ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے)

اُس کے سوا موجود ہے کون جو ہونے کا دعویٰ کرے۔ یہ جو کائنات موجود نظر آتی ہے۔ یہ اُسی وجود کا فیضان ہے۔ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (۳/۲) البتہ کل شئی کو علمِ الٰہی میں ایک ثبوتِ علمی ضرور حاصل ہے اور یہی اُن کی اصل ہے۔ یہ جو عالمین مربوبات سے معمور ہیں فیضانِ ربوبیت کا ظہور ہیں۔ اور پھر مربوب

مربوب ہیں کہ ان کو ثبوتِ علمی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ اور رب رب ہے کہ وہ حضرتِ وجود ہے اور حمد کا مرجع ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۹/۱۹) البتہ ربوبیت کے فیضان میں اللہ سے اقرب اسمِ رحمٰن ہے۔ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ (۱۶/۱۲) اور سب پر حاوی صفتِ رَحْمَتْ۔ (وجود بخشی) وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (۹/۴) پس ربُّ العالمین کی طرف سے جو رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ کا ظہور ہوا یہ عبدیتِ محمدیؐ کا مقام ہے۔ اور یہاں ہمہ اللہ رے استغنا۔ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ پھر محمد کیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ حمد تمام اللہ کی ہے۔ هُوَ الظَّاهِرُ کے عوالم حمد سے معمور ہیں۔ البتہ هُوَ الْبَاطِنُ کی هُوِيَّتْ سُبُّوحِيَّت میں مستور ہے۔ تو پھر حمد ہی گویا رسول اللہ نکلی کہ ہر دم اور ہر قدم اس کی خبر دیتی ہے۔

(اقتباس از مراۃ الحمید للبرنی حصہ اول)

(۱۳) حُبُّ العالمین۔ حُبِّ رَبُّ العالمین

عبدیت کا شغل سب شغلوں میں اعلیٰ ہے اِسی عبدیت کے صدقے میں، عبد انبیاءؑ، اولیا کے مقامات کو پاتا ہے، دیکھتا ہے۔ حضورؐ علمِ الٰہی کا ظہور ہیں۔ جامعیتِ ظہور کی بنا پر حضورؐ محبوبِ حق ہیں۔ گویا محبت ہی نے عالمین میں ظہور کیا ہے۔ بقول میرؔ:

نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور　　محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور

حُبُّ العالمین اور حُبِّ ربُّ العالمین کے درمیان حُبِّ نبیؐ ہی سہارا ہے۔ حُبِّ نبیؐ ہی دونوں نسبتوں کو سنبھالتا ہے۔ کائنات کی محبت جو دراصل حُبِّ نبی کا مظاہرہ ہے اس میں بھی خوبی پیدا کرنے والی اور توازن برقرار رکھنے والی چیز حُبِّ نبیؐ ہی ہے۔

محبت کی تجلی ہوئی تو عالمین میں ہر ایک کو اس سے حصہ ملا اور ہر شخص اپنی اقتضا کے لحاظ سے اسے استعمال کر رہا ہے۔ بلند فطرتی کی وجہ سے پروانہ شمع کے حسن پر فدا ہو رہا ہے تو پست فطرتی کی وجہ سے گبریلا گوبر پر فدا ہو رہا ہے اسی طرح انسانوں میں کوئی زر، زمین، زن پر فدا ہو رہا ہے تو کوئی اللہ، رسول اور اولیاء اللہ پر نثار ہو رہا ہے۔ یہ سب فرق محل و نسبت کی وجہ سے پیدا ہو رہا ہے۔ شعر

بال بازاں را سوئے شاہان برند　　بال زاغاں را بہ گورستاں برد

(۱۴) حقیقتِ محمدی ﷺ

فرمایا۔ ابھی نمازِ جمعہ میں رسول اللہ کی شان اور حقیقتِ محمدی اس آیت سے کھل گئی: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۵/۲) (ان میں سے ہر ایک کو ہم مدد دیتے ہیں۔ اور اُن کو تیرے رب کی بخشش ہے۔ اور تیرے رب کی عطا (دنیوی) بند نہیں کی گئی) مطلب یہ کہ سارے عالمین میں جو فیضانِ ربوبیت ہے وہ صرف تیرے رب کی عطا ہے۔ یعنی اصل میں ربِ محمد کا ہے۔ ایک ہی رب ہے تو ایک ہی مربوب (عبد۔ محمد) ہے اجمالاً دراصل محمد ہی ایک ذاتِ مربوب ہے۔ باقی سب عالمین محمد کی تفصیل ہیں۔ ان سب میں ربِ محمد ہی کا فیضان ہے اسی لئے بعض اولیاء اللہ نے فرمایا۔ ربِ محمد اسمِ اعظم ہے۔ علم (قرآن) حقیقتِ محمدی ہے، اور سارے معلومات (عوالم) حقیقتِ محمدی کی تفصیلات ہیں۔ چار چیزیں اصل ہیں۔ محمد۔ حمد۔ احمد۔ احد۔ اِس عالم کے تعلق سے دو۔ اُس عالم کے تعلق سے دو۔ اِس عالم میں حمد کے ذریعے سے فیض ہے۔ اس عالمِ خلق میں جس ذات کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہے وہ اِس عالم کی نسبت سے محمد کہلاتی ہے۔

اُس عالمِ امر میں جس ذاتِ محمدی کی طرف اللہ کی توجہ ہے وہ اُس عالم کی نسبت سے احمد کہلاتی ہے۔ اور احمد کی توجہ جس ذات کی طرف ہے اُسے احد کہتے ہیں۔ وہاں کسی کا کوئی اعتبار نہیں۔

اللہ کا فرمان ہے۔ ہم محمد کے رب ہیں۔ عالمین میں ربوبیت کا فیضان مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ہے۔ یعنی ربِ محمد کی عطا کے طور پر حضور کے صدقے میں اور وسیلے سے فیضانِ ربوبیت سب کو مل رہا ہے۔ انبیاء تک حضور کے واسطے سے فیض لے رہے ہیں۔ سوائے حضور کے کوئی ربوبیت کا مظہر نہیں۔ حضرت موسیٰ کے مریدین نے کہا تھا۔ آمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى (۲۰/۱۲) لیکن یہاں خود اللہ فرماتا ہے۔ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۔ یعنی ربِ محمد! اس کی مثال ایسی ہے۔ ایک باپ بیٹے سے کہتا ہے۔ میں تیرے دوستوں وغیرہ کی جو کچھ خاطر مدارات کر رہا ہوں وہ محض تیری خاطر ہے، تیرے واسطے ہے۔ اسی لئے کہا گیا۔ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ ۔ اگر محمد کی ذات نہ ہوتی تو ربوبیت کا فیضان ہی نہ ہوتا۔ اور نہ آسمان، زمین پیدا کئے جاتے۔ اگر ہم قُلْ يٰعِبَادِیْ (۲۴/۳) میں آجائیں تو کامل فیضان حاصل ہوتا ہے۔

(۱۵) حقیقتِ محمدی ﷺ اور قرآن

رسول علم کو کہتے ہیں۔ ہماری رسائی بحسبِ اقتضاءِ علم کی حد تک ہے کہ ہم صُوَرِ علمیہ ہیں۔ علم سے ہٹ کر ہمارا کہیں قیام و قرار نہیں۔ البتہ علم عیم سے راست ربط رکھتا ہے۔ جیسے قرآن کلام اللہ ہے، اس کے حروف و کلمات بھی کلام اللہ ہیں۔ حروف وغیرہ کا ایک ربط قرآن سے ہے تو دوسرا ربط اللہ کے کلام سے ہے۔ یہ ایک دوسرے کے مغائر نہیں بلکہ لازم و ملزوم ہیں اور رسول کے تعلق سے اللہ کے تعلق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اللہ کے تعلق سے رسول

کے تعلق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی لیے توحید اُسی کی پکی ہے جس کا رسالت سے ربط پکا ہے۔ مُحَمَّدٌ رسولُ اللہ کے بغیر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔ ہم نے رسول ہی سے اللہ کو پایا اور پاتے رہیں گے۔

(۱۶) حقیقتِ مُحَمَّدیؐ۔ عالمین اور خاص صورتِ مبارک

حقیقتِ محمدیؐ اور آپ کی خاص شکل وصورت کی مثال یوں سمجھو جیسے لفظِ قرآن۔ کہ قرآن کہتے ہی قرآن کا وہ لفظ معیّن بھی ذہن میں آجاتا ہے جو اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ (۲۷/۱۶) ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اِسی لفظِ قرآن میں، قرآن کا ہر ہر کلمہ بلکہ ہر ہر حرف شامل ہے۔ گویا یہ لفظ پورے قرآن کو حاوی ہے جس میں جنّت، دوزخ، ابولہب، شیطان اور ہر رطب و یابس داخل ہے اور اس میں لفظِ شیطان و دوزخ وغیرہ ہونے سے، قرآن کی تطہیر و تقدیس میں کوئی فرق نہیں پڑتا اِسی طرح محمدؐ کہنے میں آپ کی خاص صورتِ مُبارک اور آپ کا سارے عالم پر حاوی ہونا شامل ہے۔ اس لیے حضورؐ سے ہمارا زندہ ربط ہر آن رہنا چاہیے حضورؐ اور قرآن ایک ہیں لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآن کا علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کو حضورؐ کی معیّت و رفاقت نہیں سمجھتے۔

مزید برآں عالم کے ساتھ اللہ اور رسولؐ اللہ کے تعلق کو اس طرح سمجھو کہ ایک تو عموداً راست تعلق ہے۔ اُوپر سے نیچے۔ اور ایک اُفقاً تعلق ہے، سطح پر سطح کے لحاظ سے۔ اس طرح ایک بالائی تعلق ہے اور ایک ذیلی تعلق۔ ایک اوپر کا۔ ایک نیچے کا۔ ایک تخلیقی اعتبار خالق کا اُوپر سے عموداً ہے۔ دوسرے رسولؐ اللہ کا اعتبار عالم سے اُفقاً ہے کہ اُن سے ہٹ کر کوئی شے نہیں۔ رسولؐ اللہ برزخ ہیں۔ واسطہ ہیں۔ رحمۃٌ لِّلعالمین ہیں۔ پس ہر چیز

کو رسولؐ اللہ ہی سے فیض مِل رہا ہے۔ وہی رُوحُ الْاَرْوَاح، قلبُ الْقُلُوب، اور جَسَدُ الْاَجْساد ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اَللّٰہُ مُعْطِیْ وَاَنَا قَاسِمٌ۔ یعنی اللہ اصل میں خالق ہے اور رسولؐ اللہ کو نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ اور حضورؐ اِن نعمتوں کو سارے عالم میں بانٹ رہے ہیں۔ یا، عالمین کے ساتھ اللہ اور رسولؐ کے ربط کو سمندر اور بادل کی مثال سمجھو کہ پانی کا تعلق سمندر اور بادل دونوں سے ہے۔

(۱۷) حقیقتِ مُحَمَّدیؐ اور علم

حضورِ انورؐ کا خاص امتیاز آپ کا علم ہے۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (۵/۱۴) علم حیات پر حاکم ہے۔ بعض عیسائی مصنفین کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو یہ معجزات حاصل تھے کہ مُردوں کو زندہ کرتے تھے اور اندھوں، جذامیوں کو اچھا کرتے تھے اور یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو سمندر نے راستہ دیا۔ اور یہ کہ حضرت سلیمانؑ کی حکومت ہواؤں اور جِنوں پر تھی۔ اس کے برخلاف وہ کہتے ہیں کہ حضورِ انورؐ کے معجزات زیادہ نظر نہیں آتے۔ اس کو سمجھنے کے لئے بصیرت کی ضرورت ہے۔ علم اور معجزات کے فرق کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص سائنس اور علمِ ادویہ کا ماہرِ کامل ہے۔ اس کے علم کے چند اصول معلوم کر کے بڑے بڑے ڈاکٹر علاج کرتے ہیں، لاکھوں کو شفا بخشتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ میں نے تو اس محقق کو آپریشن کرتے اور دوا دیتے نہیں دیکھا تو وہ نرا جاہل ہے۔ صاحبِ نظر تو جانتا ہے کہ اصل شفا بخشی تو اُس ماہرِ کامل کے علم کی ہے۔ اسی طرح بجلی کا ایک بڑا ماہر انجنیر ہے۔ شہر بھر میں نیچے کے فوراً اپنے بجلی کے کارناموں سے سب کو حیران کئے ہوئے ہیں حالانکہ انجنیر کا پوزیشن بہت اعلیٰ ہے۔ جب ضرورت ہوگی اُسی کے علم سے بجلی کی ساری خرابیاں دُور ہوں گی یہی

علم جو سب کائنات پر حاوی ہے حضورِ انورؐ کا خاص امتیازی کمال ہے اور یہی سب سے بڑا اکرام ہے۔ یہ وحدت کا مقام ہے۔ کلام کا مقام نہیں۔ اس لیے فرمایا۔ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِہٖ مَاۤ اَوْحٰی (۵/۲۷)

(۱۸) خُلقِ عظیم

فرمایا۔ وَمَاۤ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (۲۶/۱) (میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ تمہارے ساتھ) کہنے والا ہی اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ (۱۵/۱) کا سزاوار ہے۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۲۹/۴) (آپ اخلاق کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں) اور بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر، اُسی کی شان ہے۔ لیکن بے بصیرتوں کو اِسی وَمَاۤ اَدْرِیْ میں مثلیت، معذوری، مجبوری نظر آتی ہے۔ اور جو حضورؐ کی عظمت کی بلند چوٹی ہے اور انتہائی قرب کا مقام ہے وہی اِن منکروں کو وادیوں کی پستی نظر آتی ہے۔ حالانکہ اسی میں انتہائی عُلو، عظمت، امانت، ولایت، خلافت مضمر ہیں کہ یہ سب عبدیت کے لوازم ہیں۔ سارے عالم پر تصرف عطا کئے جانے کا راز اسی عبدیت میں ہے۔ بفضلہ آپ کی صفت رحمۃٌ للعالمین ہے۔ لیکن عبدیت کا اقتضا ہے کہ اپنی حقیقت اور بے بسی کا یوں اظہار فرماتے ہیں اور محض فضل کے امید وار ہیں۔

جو بی بی زیور، لباس، مکان، ملازمین پر پوری متصرف ہو مالک ہو۔ اور یہ سمجھے کہ یہ سب میاں کا عطیہ ہے اپنا کچھ نہیں، تو وہی میاں کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب بن کر رہے گی۔ اور اُسے امانت کی صلاحیت کی وجہ سے کمال تصرف عطا کیا جائے گا۔

جب خلافت کی حکومت کے باوجود، اطاعت و عبدیت ظاہر ہوتی ہے تو اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ سے سرفرازی ہوتی ہے۔ اور مرضیِ الٰہی جب

صورت میں مقید ہو کر آتی ہے تو رسولؐ اللہ کہلاتی ہے۔ وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (۵/۸) (یعنی رسولؐ کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے)

(۱۹) عبدٌ کا عبد

فرمایا۔ ہمارا مسلک قرآنی ہے۔ یعنی قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (۲۴/۳) (کہہ۔ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے نا اُمید مت ہو) یہی مسلک حضرت عمرؓ کا رہا۔ مستدرک میں حاکم نے روایت کی ہے کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے منبر پر خطبہ میں فرمایا: اِنِّیْ کُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَکُنْتُ عَبْدَہٗ وَ خَادِمَہٗ (یعنی میں رسولؐ اللہ کا عبد (غلام) اور خادم تھا) حضرت علیؓ نے بھی یہی فرمایا۔ اَنَا عَبْدٌ مِّنْ عَبِیْدِ مُحَمَّدٍ (تفسیر سورہ فاتحہ از حضرت علامہ عبد القدیر حسرتؒ) اللہ کے عبد رسولؐ اللہ ہیں۔ اور ہم عبد اللہ کے عبد ہیں۔ بعض مرشدین عبد بننے کے بجائے اللہ بنتے ہیں۔ عبدیت اور عبدؐ کے عبد بننے کی تعلیم کو نقص سمجھتے ہیں۔ لیکن جب وقت پڑے تو یہ خدا بننے والے عبادُ الدُّنیا کے سامنے جھکنے میں تامل نہیں کرتے۔ معترضین کہتے ہیں۔ ہم عبدُ اللہ ہیں۔ اور اللہ سے ربط کے لیے ہماری عبادات و اعمالِ صالحہ کافی ہیں۔ وہ آیت 'قُلْ یٰعِبَادِیْ' کی ایسی تعبیر کرتے ہیں کہ عبدُ الرّسُول کہنے کو شرک سمجھتے ہیں۔ حکمت کا اقتضا تھا کہ اللہ نے اپنی طرف توجہ اور محبت کے لیے حضورؐ کا توسط لازمی قرار دیا۔ چنانچہ حکم ہے: فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (۳/۱۱) بڑے بڑے انبیاء آپ کا دامن تھامتے ہیں، آپ کو وسیلہ بناتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کے طفیل میں متوجہ ہوتا ہے۔ ورنہ غنی سے توجہ کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ لَا تَقْنَطُوْا کی بشارت یٰعِبَادِیْ کے بعد ہی ہے۔ یعنی حضورؐ کے عِباد (غلاموں) کے لیے مایوسی نہیں۔

یہی فقراء کا مسلک ہے۔ مولانا رومؒ بضمنِ سببِ حرمانِ اشقیاء، دفتر اول مثنوی میں فرماتے ہیں:

بندہ خود خوند احمد در رشاد

جملہ عالم رابخواں قُل یاعباد

(۲۰) (ا) نبی کی مثلیت و فضیلت اللہ۔ رسول اللہ۔ اولیاء اللہ۔ یہ مقامات ہیں جہاں قلبِ مومن کو عروج عطا ہوتا ہے۔ دل کو جمع اور فرق کی تمیز حاصل ہو تو کیا کہنا۔ اس مقام کے احوال بھی عجیب ہیں۔ عروج و نزول کا دَور بندھا رہتا ہے۔ اور یہی جامعیت انسان کا کمال ہے۔ عروج و نزول کا ربط اور محل نہ سمجھنے سے ناواقف مغالطوں میں پھنستے ہیں تو افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے کلام اللہ ہونے کی ایک بڑی دلیل قرآن میں یہ بیان ہوئی ہے کہ اس میں کہیں کوئی اختلاف نہیں۔ ارشاد ہے: وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۵؍۸) (اگر یہ (قرآن) اللہ کے سوا کسی اور کے پاس سے آتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے) لیکن اگر اس دلیل کے باوجود کسی کو قرآنِ کریم میں اختلافات نظر آئیں کہ مختلف اعتبارات اس کے نزدیک تطبیق نہ پائیں۔ بلکہ متعارض ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ یہ اس کی فہم اور اس کے علم کا قصور ہے ورنہ قرآنِ کریم اپنے دعوے میں سچا ہے۔

(ب) عبدیت خلاصہ یہ کہ عبدیت میں دیکھو تو معلوم کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن امانت میں دیکھو تو سب کچھ موجود۔ پھر خلافت کا کیا کہنا کہ اُس کے حق میں ملائکہ پر سجدہ واجب ہُوا۔ تب ہی تو انسان کے سوا کائنات امانت کی برداشت سے معذور رہی۔ اور لطف یہ کہ خود عبدیت

ہی امانت کی حامل ہے۔ خلافت اسی کی شان ہے۔ اس لیے عبدیت بہر صورت مقدم ہے۔ اور عبدیت حضرت خاتم النبیینؐ کا خاص الخاص مقام ہے۔ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ پھر رسالت کی شان دیکھئے۔

اِدھر مخلوق میں شامل اُدھر اللہ سے واصل

خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مُشدّد کا

(ج) عُروج کے لوازم توحید کے تحت حکمت کا ظہور ہوتا ہے۔ اور ظہور میں انسان بہت جامع ظہور ہے۔ کہ اس کے عروج و نزول میں بہت وسعت ہے۔ انسانیت کا انتہائی عروج نبوت ہے۔ اور نبوت کا کمال رسالت ہے۔ اس عروج کے لوازم عبدیت (معلومیت) امانت، ولایت، خلافت ہیں۔ وحی۔ علمِ لدنی۔ معراج۔ معجزہ۔ دعا۔ استغفار۔ شفاعت۔ صلوٰۃ و سلام۔ ایسے تعلقات بھی نبوت کی تفصیل ہیں، جو علیٰ قدرِ مراتب اُمت میں بطور فیضان تقسیم ہوتے ہیں۔ محدثین صدیقین و مقربین جو قرآن میں اولیاء اللہ بھی کہلاتے ہیں، اُن کے علم و عمل سے نبوت کے تحت حق و صدق کے انوار و برکات، حکمت کی راہ اُمت میں پھیلتے رہتے ہیں۔

(د) نبوت کی جہتیں نبوت میں دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک مثلیت۔ دوسری فضیلت (فوقیت)۔ مثلیت کیا ہے، نزولِ تامّہ اِلَی الْخَلْق۔ فضیلت کیا ہے، عروجِ تامّہ اِلَی الْحَق۔ نبی کی زندگی جو انتہائی عروج و نزول کے درمیان ہوتی ہے وہی اس کا مقام کہلاتی ہے۔ اس میں جس قدر وسعت ہوگی اسی قدر نبی کی شخصیت میں امانت و خلافت کا ظہور کامل ہوگا۔ چنانچہ حضورِ اکرمؐ کا مقام مقامًا

مَحْمُوْدًا (۱۵/۹) ہے۔ جو انسان کا اعلیٰ ترین مقامِ حمد و عظمت ہے۔ مثلیت میں مجانست قایم ہو کر تعلیم و تبلیغ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ فضیلت میں ادب و اتباع اور تعظیم و محبت سے عروج کی راہ ملتی ہے۔ مشرک مثلیت فراموش کر دیتے ہیں فضیلت میں عبداللہ کو اللہ یا اللہ کا اوتار، بیٹا یا بی بی کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ حضرت عزیرؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ اسی کی ایک صورت اوتار کا عقیدہ ہے۔ اس کے برعکس کافر نبی کی فضیلت سے انکار کرتے ہیں۔ اور مثلیت میں نبی (عبداللہ) کو اپنا جیسا قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (۲۷/۱۲) مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۳۳/۱۸) یعنی یہ تو تمھاری طرح معمولی آدمی ہیں۔

لیکن نبی تحتِ امر اپنے حق میں مثلیت و فضیلت دونوں کا اعلان کرتے ہیں۔ البتہ مثلیت کا اعلان سادہ، عام فہم ہوتا ہے۔ اور فضیلت کا اعلان بلحاظِ رفعت و جامعیت عالمانہ ہوتا ہے۔ اور یہ فرق ہر دو محل کے اقتضا کا جزوِ لاینفک ہے۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۱۶/۱۳) (کہہ میں تمھاری طرح ایک بشر ہوں کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود معبودِ واحد ہے) جو مسلم ہیں وہ مثلیت و فضیلت دونوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر بھی فرق رہتا ہے کہ صدیقین مثلیت کا اقرار کر کے فضیلت پر اصرار کرتے ہیں کہ وہ عروج کی صورت ہے لیکن معترضین دبی زبان سے فضیلت کا اقرار کریں بھی تو مثلیت پر حد درجے اصرار کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ عروج سے غافل ہو کر نزول میں پھنس جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ نبوت کے یہی دو جہات مشرک و کافریں اور صدیقین و معترضین میں فرق پیدا کرتے ہیں۔

(ہ) فضیلت خصوصیت

غور کیجئے تو مثلیت کے پہلو بہ پہلو فضیلت خلقت کی عام خصوصیت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۱۵/۲) (دیکھو ہم نے ایک کو دوسرے پر کیسی فوقیت دی ہے) انبیاء و رسل میں بھی ایک دوسرے کے مقابل فضیلت رہتی ہے۔ نبی یا رسول کو دوسروں کے مقابل کس درجہ فضیلت حاصل رہے گی۔ اور پھر خاتم النبیین، رسولِ کریمؐ کو سب کے مقابل کس درجہ فضیلت حاصل ہوگی، قیاس سے باہر ہے۔ حکمت میں شرحِ صدر ہو تو ربوبیت کے نور سے عبدیت منکشف ہو جاتی ہے، عبدیت ربوبیت کے تابع رہتی ہے اور رسالت توحید کی تعلیم بن جاتی ہے۔ اصل توحید وہی ہے جو عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کی اتباع و تعظیم سے حاصل ہوتی ہے۔

(و) مثلیت کی حکمت

جب نبوت کے ذیل میں صدیقین کو فضیلت کا عروج نصیب ہوتا ہے تو انتہائے عروج میں مثلیت توازن برقرار رکھتی ہے۔ مثلیت کی سب سے اعلیٰ یہی حکمت ہے کہ مانعِ شرک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ مثلیت سے پاک ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۲۵/۱۱) (کوئی چیز اس کے مانند نہیں) لیکن جب مبتدی اور متوسط مثلیت سے اکتائیں تو فضیلت پر توجہ لازم ہے کہ دل میں عروج کی تحریک پیدا ہو۔ ایک جماعت کا مقام فضیلت رہتا ہے۔ بقدرِ ضرورت وہ مثلیت کی طرف التفات کرتے ہیں۔ دوسری جماعت کا مقام مثلیت رہتا ہے کہ گویا اس سے بالاتر کوئی مقام نہیں۔ چنانچہ وہ فضیلت سے چکراتے ہیں۔ بدرجۂ مجبوری ایماناً مانیں بھی تو عدمِ علم کے سبب وسوسۂ شرک سے گھبراتے ہیں۔ البتہ ان کا مرتبہ بڑا ہے جو مثلیت و فضیلت دونوں کو اپنے اپنے محل پر علیٰ قدرِ مراتب ایک ساتھ ملحوظ رکھتے ہیں۔

(۱ تا و اقتباس از مقدمہ معروضہ البرنی)

(۲۱) ختمِ نبوّت کی خاص تشریح

(خلاصۂ تقریر جلسۂ میلادُ النبیؐ منعقدہ جمعہ ۳۰ ربیع الاوّل ۱۳۵۲ھ - بمقام بادشاہی عاشور خانہ - حیدرآباد - انڈیا - زیرِ صدارت نواب ضیا یار جنگ مرحوم)

فرمایا - مجھے اچانک کل رات میرے مفوّضہ عنوان فضائلِ نبویؐ کے خلاف "ختمِ نبوّت" کا عنوان چھپا دیکھ کر تعجب ہُوا - جی چاہا کہ عذر کر دوں لیکن دل شکنی کا خیال کر کے حاضر ہُوا - ختمِ نبوت اسلام کا معرکۃ الآراء امتیازی مسئلہ ہے - میں قرآن ہی سے بتاؤں گا - آیتیں پڑھتا جاؤں گا اور اس کا سیدھا سادہ ترجمہ پڑھوں گا - آپ خود تصفیہ فرماسکیں گے -

(ا) ہر نبی کی دُعائے اولاد قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اولاد کی دُعا مانگی - منشا یہ کہ اُن کی اولاد میں نبوّت کی سعادت رہے - اور علمِ الٰہی ان کی اولاد کے ذریعے پھیلے - چنانچہ اُن کی دُعائیں مقبول ہوئیں - اور اُن کی اولاد میں نبوت جاری رہی - تعمیرِ کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی دعا تھی: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ الخ (۱/۱۵) مقبولیت یہ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں حضورِ انورؐ تشریف لائے - حضرت ابراہیمؑ کو دوسری بشارت یہ ملی: وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ (۷/۱۶) حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ عطا ہوئے پھر اُن کو حضرتِ یعقوبؑ ملے - اسی طرح حضرت زکریاؑ نے دعا مانگی: فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ (۱۶/۴) چنانچہ حضرت یحییٰؑ نبی عطا ہوئے -

(ب) نبی - رسول قرآن شریف میں انتہائی انعام کے لیے دو لفظ مستعمل ہیں - ایک نبی دوسرا رسول - قرآن نے بعض کو صرف

نبی کہا - اور بعض کو نبی اور رسول دونوں کہہ دیا - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا لفظ خاص ہے اور نبی کا لفظ عام ہے - سب جانتے ہیں - عام وہ ہے جس میں خاص داخل ہے - لیکن خاص میں عام داخل نہیں ہُوا کرتا - مثلاً اگر کہیں کہ عام دعوت ہے تو بادشاہ سے لے کر فقیر تک دعوت میں جاسکتا ہے - لیکن اگر کہیں کہ خاص دعوت ہے تو عام لوگ نہیں شریک ہوسکتے - خاص مدعو ہی جاسکیں گے - چنانچہ آیات ملاحظہ ہوں:

(۱) وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا (۱۵/۶) (ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی - اور داؤدؑ کو کتاب زبور دی) ارشاد ہے:

(۲) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (۳/۱) (ہم نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی) -

(۳) وَوَهَبْنَا لَهُ مِن رَّحْمَتِنَا أَخَاهُ هَارُونَ نَبِيًّا (۱۶/۷) (ہم نے موسیٰؑ کو اپنی رحمت سے اُس کا بھائی ہارون نبی دیا) .

(۴) وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ - إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا (۱۶/۷) اور کتاب میں موسیٰؑ کا ذکر کرو - وہ برگزیدہ تھا اور رسول اور نبی تھا - نمبر ۳، ۴ آیتوں سے معلوم ہوا کہ نبی کا لفظ عام ہے - رسول کا خاص ہے - یعنی حضرت ہارونؑ صرف نبی تھے - لیکن حضرت موسیٰؑ نبی اور رسول دونوں تھے یعنی نبوّت سے رسالت کا مرتبہ بڑا ہے -

(۵) وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ - وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا (۱۶/۶) ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰق اور یعقوب عطا کیا - اور اِن دونوں کو نبی بنایا -

(۶) وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ - إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ

رَسُوْلاً نَّبِیًّا (۱۶/۷) (اور کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر کرو وہ وعدہ کا سچا تھا اور رسول اور نبی تھا)۔

(۷) وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِدْرِیْسَ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (۱۶/۷) (اور کتاب میں ادریس کا ذکر کرو۔ وہ صدیق نبی تھا)۔

نمبر ۵، ۶، ۷ آیات سے مزید وضاحت ہوتی ہے کہ حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت ادریسؑ نبی تھے۔ لیکن حضرت اسمٰعیلؑ رسول اور نبی تھے۔ حضورِ انورؐ کے متعلق ارشاد ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَہُمْ فِی التَّوْرٰىۃِ (۹/۹) (جو یہود رسول نبی اُمی (محمدؐ) کی اتباع کرتے ہیں جن کا ذکر اپنے پاس تورات میں وہ پاتے ہیں)۔

(ج) ختم کی تعریف

اب صرف ختم کے معنی اور تعریف قرآن سے سمجھنے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِہِمْ غِشَاوَۃٌ۔ وَّلَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۱/۱) (اللہ نے ان کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر مہر کر دی اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے)

(۲) اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰہَہٗ ہَوٰىہُ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً (۲۵/۱۹) (کیا دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنایا ہے۔ اور اس کو اللہ نے علم کے باوجود گمراہ کیا۔ اس کے کان اور دل پہ مہر کر دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا)۔

ان دو آیتوں میں تین الفاظ مشترک ہیں۔ دل، کان، آنکھ جن کا عمل بند

ہو جاتا ہے۔ دل اور کان پر ایسی مہر کر دی کہ اس کے اندر علم صحیح داخل نہیں ہو سکتا۔ باہر سے کوئی چیز دل اور کان میں داخل نہیں ہو سکتی یعنی بند ہو گئی۔ اس میں کوئی اضافہ ہو نہیں سکتا۔ اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا یعنی آنکھ نہیں دیکھ سکتی کوئی چیز باہر سے آنکھ میں نہیں آسکتی چنانچہ سرکاری دفاتر میں بھی عام قاعدہ رہا کہ سب تحریر ختم ہونے کے بعد سرکاری مہر کی جاتی تھی تاکہ اس کے بعد کسی تحریر کا اضافہ نہ کیا جا سکے۔ چنانچہ آیت ذیل پر آپ غور فرمائیں۔

(د) مردوں کا باپ نہ ہونا

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا (۲۲/۲) (محمد صلعم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ لیکن خدا کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے)۔

(اس آیت کے پڑھتے ہی سامعین کی ذوق سے عجب حالت ہو گئی کہ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں سُبحان اللہ۔ ماشاء اللہ۔ للمؤلف حلیم)

چونکہ محمد صلعم مردوں کے باپ نہ تھے۔ بلکہ رسول اللہ اور خاتم النبیین تھے اس لئے آپ کی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی۔ بچپن ہی میں سب بچے اس عالم سے گزر گئے ورنہ نا ممکن تھا کہ آپ جیسے افضل الرُسل کی اولاد زندہ رہتی۔ رَجُل (پختہ مرد) بنتی اور رسول و نبی نہ بنتی جب کہ ہر نبی کی اولاد میں دُعا کے مطابق نبی یا رسول بن گئے تھے۔ لیکن چونکہ نبوت کو ختم ہونا تھا اس لئے آپ کی اولاد نرینہ زندہ نہ رہی۔ صرف لڑکیاں زندہ رہیں۔ رَجُل کا لفظ پختہ مرد کے لیے بولا جاتا ہے نہ کہ صبی (بچہ) کے لئے۔ اسی قرآنی تفسیر کے لحاظ سے نبوت پر آپ ایسی مُہر بن گئے کہ نبوت میں اب کسی اضافے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ یعنی آپ کے

بعد اب کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ جب کوئی نبی نہیں ہو سکتا تو رسول کا کیا ذکر ہے۔ البتہ اس نبوت کا منشا یعنی توحید و رسالت کی اشاعت کا کام آپ کی صاحبزادی حضرت خاتونِ جنت رضؓ کی اولاد سادات حسنی و حسینی کے ذریعے اس عالم میں پورا ہوا جو عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کی روشن تفسیر بنے۔ کوئی غوثِ اعظمؓ بنا تو کوئی خواجۂ اعظمؓ۔ اور عالم میں قرآنی تعلیمات کو پھیلا دیا۔ (ایک اور موقع پر فرمایا حضرت غوثِ اعظمؓ، حضرت خواجۂ اعظمؓ اور دیگر اکابر نے ختمِ نبوت کے مسئلے کو مسلمات میں جانا، مانا۔ اس لیے مسلمان اس پر بحث کی ضرورت نہیں سمجھتے)۔

صدرِ جلسہ نواب ضیا یار جنگ جو خود بھی متبحر عالم تھے انھوں نے اس تقریر کے متعلق فرمایا۔ برنی صاحب! میں نے بہت سی تفسیریں دیکھی ہیں۔ لیکن ختمِ نبوت کی ایسی نادر اور لطیف تفسیر کہیں نہیں دیکھی۔ یہ آپ پر خاص انفتاح ہے ماشاء اللہ۔

رسول رازداں نہ ہوں تو کون ہوگا۔

(۲۲) رسولؐ کا علمِ غیب

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۴/۴) عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (۷۲/۲۹) (اللہ عالم الغیب ہے نہیں خبر کرتا اپنے غیب پر کسی کو مگر جس کو پسند کرتا ہے پیغمبروں میں سے) پھر رسول کریمؐ کا علم کہ وہ اجتبٰی کے تاج اور ارتضٰی کے سرمایۂ ناز ہیں۔ معلم ہیں اور کیسے معلم: يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۲/۲) (تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم کرتے ہیں۔ تم کو وہ علم دیتے ہیں، جو تم نہیں جانتے)۔ اسی لیے شرح صدر سے سرفراز ہیں۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۳۰/۹) وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (۱۶/۶) ہر دم تازہ اُپھان ہے۔ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى (۳۰/۸) تا ابد یہی شان ہے۔ لیکن یہ سب اللہ کا فیضان ہے۔ عبد بذاتہٖ فقیر ہے اور اس کو یہی کہنا لازم ہے۔ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۷/۱۱) بلکہ غیب و شہادت کی تفریق کیا۔ یہ سب مدارج کا اعتبار ہے کہ ایک کی نظر میں جو غیب ہے دوسرے کی نظر میں وہ شہادت ہے۔ اور پھر شہادت میں کتنی ہی وسعت کیوں نہ ہو جائے غیب کی حد باقی رہتی ہے بہر حال جس درجہ کا جو علم ملتا ہے علیم سے ہی ملتا ہے۔ ورنہ علیم کے علم میں کون شریک ہو سکتا ہے۔ پس خلاصہ یہ ہے کہ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۲۸/۶) یعنی اللہ غیب و شہادت دونوں کا عالم ہے۔

(صراط الحمید حصہ اول البرنی ص ۱۶۱)

(۲۳) عربٌ بلا عین کا مغالطہ

بعض صوفیا نے رسول اللہؐ کے بارے میں عَرَبٌ بِلَا عَيْنٍ۔ اَحْمَدٌ بلا میم کہہ دیا ہے۔ جب اصولاً حدیث تک کو قرآن کے مقابل ماننا لازم نہیں۔ تو اولیاء اللہ کے اقوال کو قرآن کے خلاف قبول کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ اگر اولیاء اللہ کے یہ اقوال ہیں تو ہمارا اسلم طریق یہ ہے کہ نہ ایں کار می کنم۔ نہ انکار می کنم۔ ممکن ہے ان کی کوئی اصطلاح ہو۔ ہمارا قرآنی مسلک عبدیت ہے۔ اگر وہ لوگ الوہیت اختیار کر کے انا الحق کہنا چاہتے ہیں تو کہنے دو۔ حضرت دادا پیر فرماتے ہیں:

اَنَا الْعَبْدُ بول کر ہو نا مُحَمَّدٌ
اَنَا الْحَقُّ بول کیوں منصور ہونا

(۲۴) قربِ فرائض - قربِ نوافل

طبائع مختلف ہوتے ہیں۔ بعض
سالکین حضرات کی تمیز کے بارے
میں قربِ فرائض کے مقام پر رہتے ہیں۔ یعنی ان کا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ
مُردہ بدستِ زندہ ہوتے ہیں۔ حق فاعل (خالقِ فعل) اور وہ آلہ (کاسبِ فعل)
ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ قربِ نوافل کے مقام پر ہوتے ہیں۔ وہ ارادہ
رکھتے ہیں۔ خود فاعل (کاسبِ فعل) ہوتے ہیں اور حق کا تخلیقی فیضان بمنزلہ
آلہ ہوتا ہے۔ اور بعض دونوں حالتیں رکھتے ہیں۔ کبھی وہ قربِ فرائض
کے تحت عمل کرتے ہیں، کبھی قربِ نوافل کے تحت عمل کرتے ہیں۔ مطلب
یہ کہ ان کا مقام کوئی ایک یعنی قربِ فرائض یا قربِ نوافل ہوتا ہے۔ لیکن اپنے
مقام سے عروج و نزول کیا کرتے ہیں (یعنی اگر قربِ فرائض ان کا مقام ہے
تو کبھی قربِ نوافل میں نزول ہوتا ہے یا اگر قربِ نوافل مقام ہے تو کبھی
قربِ فرائض میں عروج ہوتا ہے) عبدیت سے متحقق ہونے کے بعد ذوق
سے یہ سب چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

ہر ایک کا ربط مختلف ہوتا ہے۔ کسی محل پر فضل و فیض کو مقید نہ سمجھیں۔
بعض کے لیئے تبدیلِ مقام کی خاطر ارادتاً دعا مناسب ہے۔ لیکن کسی کی اصلاح
و ترقی مقصود ہو تو بے ارادتی پیدا کرنے کے لیئے اس کے خلاف کیا جاتا ہے۔
مثلاً قربِ نوافل والے کو قربِ فرائض کے مقام پر ترقی دینی ہو تو ہر چیز مخالف
ہو جائے گی۔ یا تو قربِ نوافل میں حق تعالیٰ اس کے ہاتھ پیر ہو کر ہر خواہش
کو پورا کرتے ہیں۔ یا قربِ فرائض میں بندہ حق تعالیٰ کا ہاتھ پیر ہو کر يَفْعَلُوْنَ
مَا يُؤْمَرُوْنَ (پ ۱۴) (جو حکم ہو وہ تعمیل کرتے ہیں) میں آجاتا ہے۔ اپنا ارادہ
نہیں رکھتا۔ بظاہر تعطل معلوم ہوتا ہے لیکن وہ منشاء و امر الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔

اس میں مزاج شناسی، حق شناسی اور اقتضا شناسی ہے۔
یا تو بچے بنے رہیں۔ اللہ سے لاڈ، پیار کریں۔ ذمہ داری نہیں رہتی۔
کہ قربِ نوافل کے مقام پر بندہ فاعل اور حق آلہ بن جاتا ہے یعنی اللہ ہاتھ
پیر بن جاتا ہے۔ بچے تو ضد کر کے مٹھائیاں لیتے ہیں، کھلونے لیتے ہیں۔
یا بڑے بن جائیں تو ذمہ داریاں آئیں گی اور قربِ فرائض کا مقام ملے گا۔
حق فاعل اور بندہ آلہ بن جائے گا۔ یعنی بندہ مرضئ الٰہی کا مظہر بن جائے گا۔
اور اس کا فعل بمنزلۂ اللہ کے فعل و منشا کے ہو جائے گا۔ قربِ نوافل سے
مُراد صفاتِ الٰہی سے متّصف ہونا ہے۔ قربِ فرائض سے مُراد ذاتِ الٰہی سے متحقق
ہونا ہے۔ اب وہ خلیفہ بنتا ہے اور مامور ہو کر جانشینی کے فرائض ادا کرتا ہے۔
غرض مقامِ قرب کی نزاکتیں بہت ہیں۔ اپنا ارادہ کچھ نہ ہو۔ فعل تحت
ارادۂ اللہ ہو۔ مامور ہو کر سب کچھ کرے۔ ورنہ ارادت وسعی کے مقامات
جہاں انیت چلتی ہے نیچے کے ہیں۔ ہر عمل اپنے محل پر اچھا ہے۔ ایک محل پہ
کسی کا علم و عمل دُرست ہوتا ہے تو دوسرے محل والے کے لیے وہی چیز غلط ہوتی
ہے۔ آج کل جوہری توانائی کے تجربے خانوں میں کام کرنے والوں کو بعض موقعوں
پر اتنی احتیاط لازم ہے کہ وہ سانس بھی احتیاط سے لیتے ہیں کہ دھماکہ نہ ہو جائے
لیکن نیچے کے محل پر چولہا پھونکتے رہیں تو فکر نہیں۔ ایک محل پر پھونکیں مارنا
درست، تو دوسرے محل پر دم بخود رہنا لازم۔ اسی طرح اعلیٰ مقامِ قرب پر
بندے بے ارادہ دم بخود رہتے ہیں۔ اور منشائے الٰہی کو دیکھتے رہتے ہیں۔
جو لوگ قرب کے حدود میں رہتے ہیں چاہے چوبدار ہی کیوں نہ ہوں ان کے
احکام الگ ہیں۔ وہ ہر وقت بادشاہ کی دید میں لگے رہتے ہیں اور اشاروں
پر نظر رکھتے ہیں۔ قرب کے حدود کے باہر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں کے لیے وہ

نزاکتیں اور احکام نہیں رہتے۔

(۲۵) بے ارادتی۔ ارادت

ایک خطرہ من اللہ دل میں آتا ہے۔ گویا ٹیلیفون کال ہوتا ہے۔ اس کی تعمیل میں بڑی فتح اور برکت ہوتی ہے۔ اس کی قدر اور تمیز نہ ہو تو خطرہ بند ہو جاتا ہے۔ عبدیت بے ارادتی کا نام ہے۔ یہ قادری سلوک ہے۔ انبیاء تک کا یہی مقام ہے عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کہا گیا، نہ کہ رَسُوْلُهٗ وَعَبْدُهٗ۔ حضورؐ کی عبدیت کا مرتبہ رسالت سے بڑھ کر ہے۔ عبدیت ذات کی مظہر ہے اور رسالت علم کا مظہر ہے۔ عبد کے پاس ہر چیز رب کی ہوتی ہے۔ جب اس امانت میں صادق ہو جائے تو خلافت عطا ہوتی ہے۔ اللہ کا نائب بنتا ہے۔ اس کے بعد جتنے اختیارات عطا ہوتے ہیں انھیں امانت جان کر استعمال کرتا ہے۔ ہر چیز کو حق کی جانتا ہے۔ بے ارادتی دراصل سرکاری حیثیت کا نام ہے۔ اور ارادت میں خانگی حیثیت رہتی ہے جس میں ذمہ داری رہتی ہے۔ کوئی ہمیں ہاتھی دے تو یہ نعمت ہے۔ لیکن اس کی حفاظت و پرورش ایک مصیبت ہے۔ اس کے برخلاف ایک شاہی ملازم ہے جس کو جب ضرورت ہو سرکاری ہاتھی سواری کے لیے ملتا ہے۔ پالنے کی دردسری سے آزاد ہے۔ اللہ کے بنے رہو۔ بے ارادہ رہو تو ہر حال میں سکون ہے ورنہ حیرانی ہوگی۔ ایک معمولی سپاہی تحت امر رہتا ہے تو اس کے ہاتھ اٹھانے پر وزیر تک کا موٹر رک جاتا ہے، ورنہ اس کے خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر بڑا زمیندار یا جاگیردار بھی کسی کا موٹر روکے تو اس کا یہ عمل خانگی حیثیت میں ہوگا۔ اور کسی کے لیے اس کی تعمیل ضروری نہ ہوگی بلکہ وہ مجرم ہوگا۔

لوگ تحت امر اور غیر تحت امر کا راز نہیں سمجھتے۔ بے کمالی اور امانت کا اعتبار عالی ہے۔ کمالات و کرامات میں بڑے دھوکے ہیں۔ نفس پھولتا ہے۔ ان کے ذکر میں فخر آتا ہے۔ دراصل بے کمالی مقام ہونا چاہیے۔ اس کے بعد کمالات ظاہر ہوں تو اسے فضل جانے گا۔ فخر نہیں کرے گا۔ الحمد للہ کہے گا۔ اس کے بعد حکم ہو تو حضرت غوث اعظمؓ کی طرح کمالات و کرامات کا ذکر کرے گا۔ ورنہ خاموش رہے گا۔

(۲۶) عبدیت بمعنی مرضی شناسی

عبدیت کے معنی اللہ تعالیٰ کی مرضی شناسی کے ہیں۔ لوگ صبر یا شکر کے مقام کی فکر میں رہتے ہیں حالانکہ قرآن میں انبیاء کے احوال پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مقام مطلوب نہ ہو۔ بلکہ بندہ کو مرضی الٰہی کے تابع رہنا چاہیے جو سب سے بڑی ترقی اور قرب ہے۔ اگر ان کا منشا ہو کہ ہم روتے رہیں تو رویا کریں۔ ان کا منشا ہو کہ ہنسیں تو ہنسا کریں۔ ان کا ایما ہو کہ تڑپیں تو تڑپا کریں۔ ان کی مرضی ہو کہ شکوہ کریں تو شکوہ کریں۔ ان کا منشا ہو کہ صبر یا شکر کریں تو وہی کریں۔ اسی لیے رونے میں حق کی مرضی دیکھی تو حضرت یعقوبؑ نے رو رو کر آنکھیں کھو دیں۔ سلیمان علیہ السلام نے حکومت کی کیا کیا شانیں دکھائیں۔ حضرت موسیٰؑ نے تو یہ تک کہہ دیا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ (۹/۴) (یعنی یہ آپ کی طرف سے آزمائش ہے)

کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ ہم اپنے ساتھ قابل صابر شاکر آدمی نہیں چاہتے بلکہ صرف ایسا آدمی چاہتے ہیں جو ہمارے منشا، مرضی اور فطرت کے مطابق ہو۔ اور جیسا ہم چاہیں وہ کرتا رہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۲/۱) کا قانون محکم ہے۔ (اختیار کر اللہ کی فطرت جس پر لوگوں کو پیدا کیا

اللہ کے ساتھ بھی بندہ کا یہی ربط ہونا چاہیے۔

(۲۷) توحیدِ مُبین فرمایا۔ دوسرے حج کے موقع پر، عالمِ اسلام کے بڑے بڑے مشاہیر سے ملاقات ہوئی۔ مثلاً حضرت عبدالحی کتانی، فاس اور ملائے شور بازار افغانستان وغیرہ۔ اور توحید پر گفتگو رہی۔ میں نے اپنے سلسلے کی خاص تعلیم کی روشنی میں اپنے اعتباراتِ توحید کو پیش کیا تو سب نے بہ اتفاق آراء فرمایا۔ "آپ کی توحید سب سے زیادہ واضح، محکم، بیّن ہے۔ آج کل یہ خصوصیت اکثر صاحبانِ سلسلہ کو نصیب نہیں۔ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّی۔

بعض سلسلوں میں غیریت کا پلڑا کمزور رہا کرتا ہے۔ تعلیم کے لحاظ سے بھی، اور واقعیت کے لحاظ سے بھی۔ لیکن ہمارے پاس تعلیم و واقعیت ہر لحاظ سے غیریت و عینیت کا بیان واضح، یقینی، قطعی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض صاحبانِ احوال کو ملحوظیت نہ رہتی ہو۔ ورنہ واقعیت میں کلام نہیں۔

حیدرآباد میں ایک صوفی تھے۔ الحادی تعلیم دیتے تھے۔ اکثر معمول میں کہتے۔ "دیکھو۔ یہ اللہ میاں کی ڈاڑھی۔ اللہ میاں کا ہاتھ" ایک دفعہ وہ گردہ کے درد میں مبتلا ہوئے۔ میں نے اپنے دوست سے کہلایا صوفی صاحب سے پوچھنا۔ اب غیریت کا زیادہ احساس ہے یا عینیت کا۔ جواب دیا۔ غیریت زیادہ ملحوظ ہے۔ میں نے کہا۔ پھر ایسی غلط توحید کا کیا حاصل۔ وہ ایک عروجی رُخ ہے، حال ہے جس میں غیر کی ملحوظیت و مشہودیّت نہیں رہتی۔ نہ کہ غیر ہی نہیں ہے۔ یہ ایک نازک فرق ہے۔ ذرا غلطی کریں تو نہ عوام سے الحاد میں گر جائیں۔

ایک صاحب توحید کے مدعی ہیں۔ انھوں نے لکھ دیا۔ "میں نہ بندہ ہوں نہ مولا ہوں۔" یہ علم باطل ہے۔ عبدیت تو پکّی ہے اور اصلی مقام ہے جس کی قرآن نے تعلیم دی ہے۔ یاد رکھو ہماری رسائی علم کی حد تک ہے۔ اس کے اوپر کا کسی کو علم نہیں۔ ہم علمِ الٰہی میں صرف معلوم ہیں۔ معلومیت ہی عبدیت ہے یعنی علمِ الٰہی میں صرف ہمارا ثبوت ہے، وجود نہیں۔ اس کے آگے مقامِ احدیت ہے۔ وہاں علم و صفات کو جگہ نہیں۔ یعنی تفصیل نہیں۔ بعض اولیاء نے اگر اس قسم کی بات کہی ہے تو احدیت کی طرف صرف اشارہ ہے کہ وہاں عبد کا پتہ نہیں۔ نہ یہ کہ ہم عبد نہیں۔ اس قسم کی تعلیم باطل ہے۔ گمراہی ہے۔

(۲۸) عینیت، غیریت مخلوقات میں وجودِ مطلق کا اعتبار لے کر بلا لحاظِ غیریتِ ذات وجوداً عین کہنا گویا اوتار والا علم ہے جو صحیح نہیں۔ ایسے صوفی دراصل شرک میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ اللہ کی ایک مار ہے۔ مخلوقات اسماء و صفاتِ الٰہی کے مظاہر ہیں۔ البتہ انبیاء اولیاء تقویٰ کی نسبت سے مکرّم ہیں کہ ان کو نہ صرف اپنی عبدیت کا اقرار ہے بلکہ اس پر استقامت و اصرار ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء رحمٰن و رحیم دونوں کے مظاہر ہیں۔ ان کو بندہ جان کر اسماء، وصفاتِ الٰہی کا مظہر دیکھنا، مکرّم، معظم سمجھنا عین توحید ہے۔ وجود یا عینِ وجود کی اصطلاحات میں احتیاط لازم ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مخلوقات میں وجود کا ظہور ہے، فیضان ہے۔ وجود کے حصے نہیں ہوا کرتے۔ اللہ تعالیٰ کے تعلق سے وجود عینِ ذات ہے۔ صفت بھی کہنا مشکل ہے۔ ہمارے لیے یعنی بندے کے لیے وجود زاید بر ذات ہے۔ اور یہی اَسْلَم طریق

ہے۔ ورنہ اگر علم صحیح نہ ہو تو مشرک یا ملحد ہو جائے گا۔ بعض لوگ توحید کو کان کی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن توحید کو ڈنکے کی چوٹ بیان کرتا ہے۔ اصل میں توحید شرحِ صدر کی چیز ہے۔ یہ حواس اور منطق کی نہیں۔ اللہ کھولے تو کھلے۔

لوگ عینیت اپنے اوپر طاری کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چیز طاری کرنے کی نہیں۔ بلکہ اللہ کی طرف سے انعاماً عطا کی جاتی ہے۔ غیریت محبوبِ خداوندی ہے۔ اور اس غیریت میں اسمائے الٰہی کا ظہور ہے۔ اس لیے ارادتاً عینیت طاری کرنا نامناسب ہے۔ ہر آن قرآن میں غرق رہیں ہوش سنبھالے رہیں۔

یافت و شہود کی حد و انتہا نہیں۔ لیکن بعض نادانی سے سمجھتے ہیں ہم کو یافت و شہود حاصل ہوا۔ علم کامل ہو گیا حالانکہ علم کی انتہا نہیں۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ (۱۳/۴)

علمِ صحیح سب سے بڑی نعمت ہے لیکن اس کی قدر نہیں۔ لوگ کمالات، کشف چاہتے ہیں جس میں سوائے تصوّر، تخیّل، تقیّد کے کچھ نہیں اپنے حال اور عمل کو علمِ صحیح کے مطابق بنانا اور عالمِ شہادت کے ظہورات کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا اور مشاہدہ کرنا ہمارے سلسلے کی تعلیم کا خاص وصف ہے۔ خواب کی چیز کے لیے تاویل چاہیے۔ یہاں شہادت میں ہر چیز دیکھ لو، سمجھ لو، قرآن کے تحت، آیات کے مطابق۔ بہتوں کے پاس اس سے ہٹ کر تصورات اور خواب پر علم و عمل کا دار و مدار ہے۔ ایسے ہی لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور علمِ صحیح کے طالبِ صادق اور مخلص کم ہیں۔ علمِ صحیح کی مثال پانی کی ہے۔ بے رنگ۔ بے مزہ۔ اکثر لوگ لمینڈ

شربت کا رنگ و مزہ چاہتے ہیں۔ لیکن پانی کی بات کہاں جو حیات کا باعث ہے۔ لیکن بعض بیماروں کو پانی کڑوا معلوم ہوتا ہے تو ان کے مناسب چیز دینی پڑتی ہے۔ یہ پانی کی خرابی نہیں بلکہ ان کے مزاج کی خرابی ہے۔

(۲۹) تصوّرِ ذات

ایک صاحب نے پوچھا۔ آپ ذات کا تصوّر کس طرح کرتے ہیں۔ فرمایا۔ وہ خدا ہی کیا جو میرے تصوّر میں آجائے، وہ تو میری مخلوق ہوگی۔ قرآن نے جیسا بتایا ویسا رہنا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۷/۱۶) ہر چیز معلومِ الٰہی ہے۔ اپنی معلومیت کھل جائے تو بڑی بات ہے۔ ستم ظریفی ہے کہ یافت و شہود کا کورس بنا کر اللہ کو سمجھنے چلے ہیں۔ خود کو محیط اور اللہ کو محاط بنا رہے ہیں اپنے کو اللہ کا مُقَوِّم ثابت کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی شرک ہو سکتا ہے؟ لیکن بعض لوگ ہیں کہ اسی کو توحید سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو اگر اپنے عدم و جہل اور معلومیت کے مقام پر توحید نظر آئے تو اسے یہ حضرات بدعت و محرومی سمجھتے ہیں۔ اس تفہیم پر وہ صاحب پھڑک اُٹھے اور کہا میرا سارا میل دُھل گیا۔ آپ نے کورا بنا دیا۔ اَلحمدُ لِلّٰہ۔

(۳۰) یافتِ ذات کے دعوے

یہ عالمِ تعینات ہے۔ یہاں تجلیات پر نظر لازمی ہے۔ اگر یہ مقصود نہ ہوتا تو ہمیں تجرید (روح) کے مقام پر ہی رکھا جاتا۔ یہاں کیوں آتے۔ انبیاء، اولیا نے دُنیا میں شادیاں کیں تاکہ عالمِ شہادت کی تجلیات کو دیکھیں ورنہ تکمیل نہ ہوتی۔ صحیح علم و نظر مشکل ہے جو اللہ کے فضل سے ملتی ہے بلا تعینات و آثار ذات کی یافت کا خیال محض دعوے کا ہے۔ اس طرح جو لوگ صرف مسمّیٰ سے ربط پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ گویا سارے اسماء و صفات کے مظاہر کو باطل ٹھہراتے

ہیں جو رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (پ۴) (یعنی اے رب آپ نے اس کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا) کے خلاف ہے۔

دراصل یہ لوگ اپنے خیال کی یافت یعنی اپنی تجریدِ خیالی کو ذات کی یافت کہتے ہیں۔ نفس میں بلا کی تجرید اور اطلاقیت ہے جس سے یکسوئی اور ربودگی حاصل ہوتی ہے اس کے بعد قلب میں اور پھر رُوح میں تجرید ہے اطلاقیت ہے۔ رُوح مخلوق اور حادث ہے۔ اس میں غیر معمولی نورانیت ہے۔ عالمِ امر کے کُنْ فَیَکُوْنِی آثار پیدا ہوجاتے ہیں رُوح کی یافت کو غلطی سے بعض لوگ حق کی یافت سمجھتے ہیں۔ نفس، دل، رُوح کی تجرید مومن و کافر میں مشترک ہے۔ دراصل مومن کی امتیازی خصوصیت ایمان، علمِ صحیح اور بے ارادتی ہے۔ جس سے حق کھلنا شروع ہوتا ہے۔ فراست ایمان کا لازمہ ہے۔ یہ کیسی بات کہ یافت تو ذات کی ہے لیکن موٹی چیزیں تک بھی نظر نہیں آتیں جتنی دُنیادار کو۔ اور نیچے کے مقامات میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ شعر:-

آں کہ بر افلاک رفتارش بود　　　بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

یہ لوگ احادیث و قرآن کو اپنے خیال پر ڈھالتے ہیں حالانکہ اپنے خیال کو قرآن و حدیث پر ڈھالنا چاہیے۔ بکثرت آیات تعیّنات سے بھری ہوئی ہیں جن سے کس طرح آنکھ بند کریں گے۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الخ (پ۴) لیکن ان تجلّیات میں انھیں شرک نظر آتا ہے حالانکہ اسی میں اصلی توحید ہے ورنہ دھوکا ہے۔

ذات کے مقام کے اولیاء اللہ شاذ ہیں۔ ورنہ اکثر غلطی سے ایسا سمجھتے ہیں۔ اکثروں کو ایک دو اسم سے خاص مناسبت ہوتی ہے اور وہ اس کا مظہر ہوتے ہیں۔ بعض اولیاء اللہ کو خود اپنے مقام کا علم نہیں ہوتا لیکن عمل جاری

رہتا ہے۔ یہ اسلم ہے۔ بعض علم و عمل دونوں کے جامع ہوتے ہیں لیکن بیان نہیں کرسکتے۔ بعض کو قوتِ بیانیہ بھی حاصل رہتی ہے۔ جامعیت کم ہوتی ہے اور مشکل ہے۔

(۳۱) یافت و شہود و محویت

بعض لوگ یافت و شہود و محویت کے لیے خاص وقت میں کچھ دیر کے لیے خیال باندھ کر بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ کل وقت یہ حال ہونا چاہیے کہ گویا مچھلی کی طرح پانی میں ہیں۔ یہ تک محسوس نہ ہو کہ یافت ہے، شہود ہے۔ اگر محویت ہی مقصود ہو تو یہ کوئی امتیازی چیز نہیں۔ بعض اشراقیوں کو دس دس برس تک محویت رہتی ہے حتیٰ کہ سانپ، بچھو کے کاٹنے کا بھی احساس نہیں ہوتا لیکن یہاں تو کیڑوں مکوڑوں سے محویت ہوا ہو جائے گی۔ علمِ صحیح کے بعد چوبیس گھنٹے علم میں محویت ہونی چاہیے۔ یہ اسلام کا امتیازی کمال ہے جس کے لیے خاص وقت کی ضرورت نہیں۔ ہر آن، ہر محل پر محویت ہونی چاہیے۔ کہیں صبر کے ذریعے، کہیں شکر کے ذریعے، کہیں تڑپ کے ذریعے۔ بہر حال حق کے منشا کی تعمیل میں محو رہیں۔ منہمک رہیں۔

غلط قسم کی محویت کے بارے میں بڑے بڑوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ عرصے تک تجریدِ رُوحانی کو یافت و شہود سمجھتے رہے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ اپنے خیالی نور کو خدا سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ فقر و فاقہ، کمزوری اور غنودگی میں اُن کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔ یا روشنیاں نظر آتی ہیں تو اُسے وہ نورِ الٰہی اور وجود کا کھلنا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کو شہودِ حق سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر آن وہ علمِ قرآنی ملے جس میں ضیق و تاویل نہ ہو۔ فطرت کے مطابق ہدایتی نور کھلے، اور ہمارا ہر علم و عمل کسی آیت کی تفسیر بن جائے۔ یہ ہے اصل ہدایت اور نور کا کھلنا، گویا کل وقت پانی میں تیر رہے ہیں۔

یہ کیا کہ تھوڑی دیر پانی کا خیال کیا کہ سردی ہونے لگی، ورنہ کچھ نہیں کشفِ عقل، وہب و کسب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسرارِ قرآنی شرحِ صدر سے کھلتے ہیں۔ اور حضورؐ کی محبت کے ثمرہ میں لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ اور کُنْ فَيَكُونُ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

(۳۲) اسمائے حُسنیٰ فرمایا۔ ارشادِ باری ہے، وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ أَسْمَائِهٖ (۹/۱۲) (اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔ پس ان ناموں سے اس کو پکارو۔ اور چھوڑ دو اُن کو جو اس کے ناموں میں کج راہی کرتے ہیں) بعض اس قرآنی علم کی نزاکت کے فہم کے بغیر اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے اسماء بولتے ہیں جو اسمائے حُسنیٰ کے منافی ہیں اس میں ادب و احتیاط لازم ہے۔ اللہ، حی، علیم، مُرید، قدیر، سمیع، بصیر، کلیم، ہادی وغیرہ اللہ کے اسمائے حُسنیٰ ہیں۔ قرآن مجید میں بعض مقامات پر آیا ہے۔ هُوَ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ (۱۱) (وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے)۔ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاءُ (۲۹/۱۵) (اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے)۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ کے لئے مُمیت و مُضِل کے اسماء بعض لوگ بولتے ہیں۔ لیکن اس کا صحیح فہم کاملین اولیاء اللہ کی صحبت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ مغالطہ اور گمراہی میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ حی، مُحی، ہادی، شافی، نافع تو اللہ تعالیٰ کے ایجابی اسمائے حُسنیٰ ہیں۔ اللہ حی ہے یعنی زندہ ہے اور اپنی صفتِ حیات سے افاضۂ حیات کرتا ہے اس لئے مُحی اور حی و قیوم ہے۔ اور جب افاضۂ حیات نہیں کرتا اور اسمِ مُحی کی تجلی نہیں فرماتا تو اسی عمل کا نام اماتت ہے۔ اور مُمیت ایجابی صفت نہیں، بلکہ سلبی ہے۔ حیات کے عدمِ افاضہ سے موت سمجھ میں آتی ہے۔

اسی طرح جب اسمِ ہادی کا افاضہ نہ ہو تو اسی ہدایت سے محرومیت کو ضلالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح مُمیت، مُضِل اور ضار وغیرہ حقیقۃً ایجابی اسماءِ حُسنیٰ نہیں۔ اس کا مفہوم سمجھنے میں احتیاط لازم ہے۔

اللہ کس کو مارے گا، فنا کرے گا جب ہر چیز ہالک و فانی ہے۔ مرے کو کیا مارے۔ دراصل اسمِ حی و قیوم کے عدمِ اظہار کی اس طرح تعبیر کی جاتی ہے

(۳۳) رحمٰن۔ قرآن۔ انسان اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۲۷/۱۱) (رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ انسان کو پیدا کیا۔ اور اس کو بیان سکھایا) ان آیات کے متعلق مفسرین نے سوال اُٹھایا ہے کہ تخلیقِ انسانی سے پہلے کس کو قرآن پڑھایا۔ میرے قلب میں آیا۔ رسولِ کریمؐ قرآن کے حامل بن کر آئے قرآن کے معنی علم کے ہیں۔ اسی آیت کے لحاظ سے حضورؐ کی حقیقت، بطون کے لحاظ سے، اس عالم کی تخلیق سے پہلے، علم و قرآن ثابت ہوئی۔ پھر انسان کو قرآن کے بیان کے لیے پیدا کیا اور بیان سکھایا۔ جبرئیلؑ اور آدمؑ وغیرہ تو بعد کو علم و وحی لائے۔ لیکن دراصل پہلے ہی سے اپنے محل پر علم (حقیقتِ محمدی) موجود تھا۔ البتہ اس عالم میں جسمانی لحاظ سے حضورِ انورؐ کا ظہور بعد کو ہوا۔ یاد رکھو۔ انسان سے اصل مراد انسانِ کامل یعنی رسولِ کریمؐ کی ذاتِ مبارک ہے۔ عقیدت و محبت ہی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ حقیقت کے لحاظ سے۔ ان ہی قرآنی آیات کی روشنی میں ساری احادیثِ رسالت سمجھ میں آتی ہیں۔ مثلاً اَنَا مِنْ نُّوْرِ اللّٰهِ وَكُلُّ شَيْءٍ مِنْ نُّوْرِيْ۔ كُنْتُ نَبِيًّا وَّآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ۔ عارفین بھی یہی کہتے ہیں کہ انسانِ کامل (بالذات) حضورِ انورؐ ہیں۔ اسی لئے ملائکہ کا سجدہ اصلاً صرف آدمؑ کو نہیں بلکہ حضورِ انورؐ کو تھا۔ اس پر ناچیز نے عرض کیا۔ قرآن میں تو

آدمؑ کو سجدہ کا ذکر ہے۔ فرمایا۔ علم اور قرآن حضورؐ کی حقیقت تھے تو حضرت آدمؑ علم میں تھے یا نہیں، پس وہ اس علم کا جزو لازم ہوئے یا نہیں۔ اس طرح جو سجدہ حضرت آدمؑ کو کیا گیا، حضورؐ کے جزو ہونے کی وجہ سے اس کا رُخ حضورؐ ہی کی طرف ہوا۔ اور اصل سجدہ حضورِ انورؐ ہی کو کیا گیا۔ قرآن میں خلافتِ آدمؑ کا ذکر ہے لیکن اصلی خلافت حضورِ انورؐ ہی کی ہے جس سے ساری کائنات بلکہ آدمؑ بنے جو کُلّ شیءٍ مِنْ نُوْرِیْ سے ثابت ہے۔

جب علم، حمد، قرآن، انسان، محمدؐ کہو تو مطلب واحد ہے یعنی حضورِ اکرمؐ۔ اسی علم نے کلام کی شکل اختیار کی تو قرآن کہلایا۔ یہی علم جب مرتبۂ اجمال میں حمد سے متعلق ہوا تو محمدؐ کہلایا۔ اور یہ حمد جب علم کے مرتبۂ تفصیل میں ظاہر ہوئی تو عالمین اور کائنات کہلائی۔

اللہ کہنے کے بجائے اَلرَّحْمٰن کیوں کہا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تو وَرَاءُ الْوَرَا و ذات ہے۔ اس کا بیان تو الگ رہا، خیال بھی اس تک نہیں جا سکتا۔ رحمٰن اس لیے کہا کہ یہ صفت اللہ اور مخلوق میں وصل و تعلق پیدا کرنے والی ہے اسی لیے فرمایا۔ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (۱۵/۱۲) اللہ یا رحمٰن کہنا بالکل برابر ہے۔ اللہ سے قریب ترین صفت رحمٰن ہے۔ اور اسی صفت کے ذریعے کائنات کی تخلیق عمل میں آئی۔ اور چونکہ یہی صفت انسان (محمدؐ) سے بھی قریب ہے۔ اس لیے رحمٰن نے قرآن سکھایا! اسی لیے اَلرَّحْمٰنُ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا (۱۹/۲) کہا گیا۔ ہم کو صفتِ رحمٰن ہی سمجھنی ہے۔ ورنہ اللہ تو وراءُ الوراء ہے اور ھُوْ ہے۔ اس میں وہ حرارت ہے کہ کسی کو باقی نہیں رکھتا۔ اور صفتِ رحمٰن برزخ ہے جو خالق کا مخلوق سے تعلق قائم و برقرار رکھتی ہے۔

میرے اس بیان کی کہ توحید میں حرارت ہے اور رسالت میں ٹھنڈک، اس آیت سے تصدیق ہوتی ہے کہ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۲۷/۱۱) (سورج اور چاند حساب سے چلتے ہیں) یہ اللہ، رسول (رب و عبد) کو سمجھانے کی مثالیں ہیں۔ شمس اصلی ہے اور قمر مجازی (عارضی) ہے۔ جس میں ذاتی نور نہیں۔ اس طرح دو ذات مغائر یک دیگر ثابت ہوئیں۔ پھر ایک وجود بہ نور کھل گیا۔ اس طرح توحید میں فرق نہیں۔ قمر کو دیکھنے سے شمس کا انکار لازم نہیں۔ بلکہ لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ حدیث ہے۔ اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰهِ وَكُلُّ شَیْءٍ مِّنْ نُّوْرِیْ۔ لہٰذا توحید اُسی کی پکی ہے جس کی رسالت پکی ہے۔

(۳۴) رحمٰن۔ رحیم کا علم سورۂ رحمٰن۔ سورۂ اقرأ

جب حضورؐ کو عالمِ شہادت میں قرآن دیا گیا تو جبریلِ امینؑ نے کہا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (۳۰/۲۱) (پڑھ تو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو جمے ہوئے خون سے بنایا۔ پڑھ اور تیرے مہربان رب نے قلم کے ذریعے علم دیا۔ اور انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا) ان آیتوں کو سورۂ رحمٰن کی ابتدائی آیتوں سے ملا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں کتنی یکسانیت و مطابقت ہے۔

(۳۵) تعمیم۔ تخصیص

رحمٰن کے علم میں ساری کائنات مندرج ہے۔ اسی علم کے مطابق رحمٰن کے ذریعے تخلیق عمل میں آئے گی۔ کائنات کی تخلیق کے بعد اسمِ رحیم کے ذریعے تفریق نمایاں ہوگی اور ہر اسم اپنا حق ادا کرے گا۔ اس کو ایک تالاب اور خزانۂ آب

کی مثال سے سمجھو۔ رحمٰن کی مثال تالاب کی سی ہے جہاں سے شہر کو پانی آرہا ہے۔ لیکن تالاب سے پانی آکر خزانۂ آب میں فلٹر (صاف) ہوتا ہے۔ یہ صاف پانی کا خزانہ گویا اسمِ رحیم ہے۔ اصل تالاب میں اچھے بُرے پانی کی تفریق نہیں ہے۔ یہ فرق و امتیاز اپنے محل پر نمایاں ہو رہے ہیں۔ کافر و مومن کی تمیز ہو رہی ہے۔ کافر کو اسمِ رحمٰن کا عام فیضان حاصل رہے اور مومن کو اسمِ رحیم کا خاص فیضان حاصل ہے۔

(۳۶) مثال ایک صاحب نے پوچھا۔ رحمانیت اور رحیمیت کیا چیز ہے؟۔ فرمایا ساری رعایا کا ایک بادشاہ ہوتا ہے، یہ تعمیم ہے۔ لیکن شاہی ڈنر میں صرف خاص لوگ ہی شریک ہو سکتے ہیں، یہ تخصیص ہے۔ رعایا میں سے ہر شخص شاہی دعوت میں نہیں آسکتا۔ رعایا میں بڑے بڑے ساہوکار، زمیندار ہیں۔ وہ محض دولت کی بنا پر شاہی ڈنر میں نہیں آسکتے۔ لیکن غریب ہو کر امیر، تخصیص و محبت شاہی کی بنا پر ڈنر میں شریک ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی رحمانیت کے تحت، ہر شخص دنیا میں فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ جیسے بادشاہ سے سب رعایا فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ لیکن اللہ کی رحیمیت کے تحت صرف مسلمان ہی جنت کی نعمتیں پائیں گے چاہے وہ غریب ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ وہ اللہ کے وفادار بندے ہیں کہ اس کے رسول کو ماننے والے ہیں۔ لیکن کافر کتنے ہی دولت مند کیوں نہ ہوں، جنت میں نہیں جاسکیں گے کیوں کہ وہ منکر ہیں۔ رحمانیت میں تعمیم ہے اور رحیمیت میں تخصیص ہے۔

(۳۷) اسباب۔ بے اسبابی۔ حکمت۔ قدرت رحمٰن و رحیم کے اسماء

تمام کائنات کو حاوی ہیں۔ رسولُ اللہ رحیم ہونے کے باوجود اسمِ رحمٰن کا حق ادا کرتے تھے۔ اولیاء اللہ کی عظمت کا راز اسی اسم کی اتباع و تعمیل میں ہے۔ اولیاء اللہ قربِ فرائض یا قربِ نوافل کے مقام پر رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال حضرت شاہ کلیمُ اللہ جہان آبادیؒ نے لکھی ہے۔ ایک بڑے ولیُ اللہ اپنے خلیفہ کے ساتھ چڑھتی ہوئی ندی پر پہنچے۔ مرید بسم اللہ کہہ کر دریا پار کر گئے۔ اور مرشد صاحب ٹھہر گئے۔ مُرید نے کہا کیا آپ کو اللہ کی قدرت پر یقین نہیں۔ مُرشد نے کہا۔ ہے، لیکن تمہیں علم نہیں۔ مطلب یہ کہ مُرید نے رحیم کے فیضان کے تحت عمل کیا۔ اور مرشد نے رحیم پر ایمان رکھتے ہوئے رحمٰن کا حق ادا کیا۔ اور سنتُ اللہ کی پیروی میں حکمت کے تحت کہا۔ جب کشتی آئے گی تو میں آؤں گا۔ خرقِ عادت کی طلب ادب کے خلاف ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰؑ بہ تعمیلِ حکمت اپنے لوگوں کو ساتھ لے کر راتوں رات مصر سے نکل جاتے ہیں۔ فرعون کے لوگ اُن کا تعاقب کرتے ہیں اور جا لیتے ہیں۔ ایک طرف دشمن۔ ایک طرف سمندر۔ حضرت کے ساتھی پریشان ہو کر مایوس ہو جاتے ہیں۔ لیکن حضرت اس دشواری میں ایمان پر جمتے ہیں۔ چنانچہ قدرت کی تجلّی ہوتی ہے۔ سمندر میں راستہ ملتا ہے۔ صاف نکل جاتے ہیں۔ اور دُشمن اُن کے پیچھے غرق ہو جاتے ہیں۔ لطف یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے اچھے بُرے سب ساتھی جبکہ ان کے ایمان متزلزل بلکہ معطل ہو چکے تھے، موسیٰؑ کے ساتھ ہلاکت کی بلا سے نجات پا جاتے ہیں۔ اور وجہ صرف یہ کہ موسیٰؑ کے ساتھ تھے۔ نیکوں کا ساتھ بھی کیا بڑی نعمت ہے۔ لیکن لوگ معیت کی برکتوں سے ناواقف ہیں۔ بلکہ بہت سے تو انکار کرتے ہیں۔ خود محروم رہتے ہیں۔

(۳۸) رحمٰن و رحیم کا ادب

مصیبت میں مختلف محل کو سمجھنا ضروری ہے ہمیشہ 'رحیم' سے لپٹے رہیں اور رحمٰن کا حق ادا کرتے جائیں۔ رحیم، رحمٰن سے ٹکر نہیں لیتا البتہ مومن کے حق میں نتائج کو کنٹرول کرتا ہے۔ مثلاً اسمِ رحمٰن اقتضاءات کے مطابق چیزوں کو پیدا کرتا ہے۔ سانپ ہو یا بچھو۔ عداوت ہو یا آگ۔ لیکن اسمِ رحیم آگ کو حضرت ابراہیم کے لیے بَرْدًا وَّسَلَامًا (ٹھنڈی) کر دیتا ہے۔ رحمٰن آگ کو پیدا کرتا ہے۔ اس کی تخلیق میں رحیم حارج نہیں۔ البتہ تخلیق کے بعد مومن کو محفوظ رکھنے کے لیے اسمِ رحیم اپنے فیض سے اُسے بجھاتا ہے، مومن کو بچاتا ہے۔ اس لیے ادباً حکمت کے تحت، رحمٰن کے اقتضاءات کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اسباب میں بظاہر کسر نہ اٹھا رکھیں۔ اور دل بذریعہ دعا و توجہ اسمِ رحیم (یعنی قدرت) کی طرف متوجہ رہے۔

(۳۹) مسلمانوں کی ترقی کا راز

رحمٰن حکمت کے تحت اسباب مہیا کرتا ہے لیکن رحیم میں حکمت و اسباب پر بھروسہ کی گنجائش نہیں۔ وہاں محض قدرت ہی قدرت ہے۔ اور یہ اسم مومنین کے لیے خاص ہے۔ یہ عالم اِس کا زیادہ متحمل نہیں۔ آخرت اور جنت میں اس کے خوب مظاہرے ہیں۔ رحمٰن کا فیض کافر و مومن دونوں کے لیے عام ہے۔ حالاتِ حاضرہ میں مسلمانوں کے لیے حکمت میں، اسباب و وسائل میں کوئی خاص گنجائش نہیں۔ کیا اس وقت وہ اسباب میں یورپ، امریکہ اور روس کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ لیکن اللہ، رسولؐ کی محبت کے تحت، رحیم و قدیر سے ربط پیدا کر کے، قرآن کے ذریعے قرنِ اول کی طرح وہ دنیا کو مسخر کر سکتے ہیں۔ اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے قدرت سے ربط رکھ کر بے سروسامانی

میں بھی ترقی کی۔ اور جب کبھی محض وسائل و اسباب سے ربط رکھا، بھروسہ کیا، مار کھائی۔ مثلاً جنگِ حنین میں اپنی کثرت و قوت پر عُجب کیا، بھروسہ کیا تو شکست ہو گئی۔

مختصر یہ کہ مسلمان کافروں کی کثرت و قوت سے مرعوب نہ ہوں۔ بلکہ اللہ کی معیت و قدرت پر نظر رکھیں کہ قرآن کہتا ہے۔ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۸/۱۹) (یعنی اے کافرو تم کو تمہاری کثرت کچھ فائدہ نہیں دے گی کیونکہ اللہ مومنین کے ساتھ ہے)

(۴۰) مال و دولت اور ایمان

اسلام میں مال و دولت کی خاص اہمیت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مزمل میں کافروں کو وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ (یعنی اللہ رسول کو جھٹلانے والے اور خوب نعمتیں پانے والے) فرمایا۔ اور سورۂ زخرف میں ان کافروں کے مکانات کو سونے چاندی کے بنا دینے کا خیال ظاہر فرمایا، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ مسلمان بھی کافر ہو جائیں گے۔ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ . . . . وَزُخْرُفًا . . . . وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲۵/۴)

ظاہر ہے اللہ نے دُنیا میں کافروں کو زیادہ دولت و ثروت دی ہے کیونکہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ قرآن کے لحاظ سے اسلام کی امتیازی نعمت و خصوصیت دولت میں اضافہ کرنا نہیں۔ بلکہ ایمان اور علمِ صحیح دینا ہے۔ دولت کو اسلام کا لازمہ سمجھنا دھوکا ہے، گو دولت مند ہونا مغائرِ اسلام بھی نہیں۔ کافروں کو تبلیغ کرنے میں علمِ صحیح پر زور دینا ضروری ہے۔ کبھی اُن کے اعتبارات کے تابع نہ ہوں اور نہ اِن اعتبارات کو تقویت

دیں کہ اسلام لانے سے مال اولاد میں اضافہ ہوگا اور جاہ و اقتدار، منزلت حاصل ہوگی کیونکہ بعض تو دولت کی پوجا بھی کرتے ہیں۔ اور اولیاء اللہ سے بھی عقیدت رکھتے ہیں، نذر نیاز کرتے ہیں تاکہ ان کی دعا سے دولت وغیرہ میں ترقی ہو۔ اکثر انبیاء، اولیاء بے بسی اور افلاس میں گزار گئے اور بعض تو ناحق قتل کئے گئے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نصرت و قدرت کہاں گئی۔ یہ سخت دھوکہ ہے اصل دولت خود اسلام ہے۔ مومن کو مخالف حالات میں بھی سکون و اطمینانِ قلب حاصل رہتا ہے جو ایمان و علمِ صحیح کا نتیجہ ہوتا ہے۔

(۴۱) مومن کے لیے دوہرے فائدے | کامیابیوں کے حصول پر انانیت نہ برتیں، پروپیگنڈا نہ کریں، تفاخر نہ جتائیں اور مخالفین کا لحاظ کرکے ان کا حقِ تکریم و توصیف ادا کرتے رہیں، تو ان کی مخالفت و انانیت کی شدت میں بھی کمی ہو جائے گی۔ ایمان کے تقاضوں پر قائم رہ کر اپنے معاملات میں حق و صداقت سے تجاوز نہ کریں۔ اور اپنی مساعی میں اہلِ باطل کے طریقے، مکر و فریب وغیرہ اختیار نہ کریں۔ نتیجہ کا لحاظ کئے بغیر، اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید پر اپنا فرض ادا کرتے رہیں۔ اور عبدیت و استغفار اپنا مقام رکھیں تو اسم رحیم کی تائید حاصل ہوکر انشاء اللہ انجام بخیر ہوگا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۴۹) عاقبت کے معنی آخرت ہی نہیں بلکہ بعد کو آنے والی ہر چیز متقیوں کے لیے بہتر ہے۔

اس سے ہٹ کر اگر اپنی مساعی میں باطل کے حربے استعمال کریں تو اسم رحیم کی خصوصی تائید رک جاتی ہے۔ اب رہا اسم رحمٰن کا معاملہ۔ اسم رحمٰن کے تحت باطل والوں کو بھی ان کی مقتضیات کی تکمیل کے لیے قوت ملتی ہے

اور شیاطین کی تائید اہلِ باطل کے لیے جنبش میں آتی ہے۔ اور وہ بھی باطل کے حربے دل کھول کر اپنے اولیاء یعنی کافرین و فاسقین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مومن پر باطل کے طور طریقے اور حربے اس درجہ منفتح نہیں ہوتے اور نہ اس کا مزاج باطل کے موافق ہے۔ ایسے وقت اگر ہم عالمِ ظاہر میں اسم رحمٰن کے تقاضوں کا حق بھی ادا کریں اور حق پر رہیں تو ہمارا معاملہ رحمٰن سے بھی ٹھیک رہے گا اور رحیم سے بھی فیضان آئے گا۔ اس طرح ہم دوچند فائدے میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی جیب میں نہیں اتار سکتا غنی و حمید کے مقابل کوئی کیا دعویٰ کر سکے گا۔ دعویٰ صرف اس کے فضل کی امید کا ہو سکتا ہے۔ بس ہر وقت خشیت کے مقام پر رہیں کہ وہ ذات غنی و حمید ہے اور ہمارا کوئی عمل قابلِ اعتبار اور قابلِ فخر نہیں۔ اس لیئے کامیابیوں اور مقبولیت پر فخر و غرور نہ ہو۔ مصائب و آلام میں بھی طریقِ حق پر قائم رہیں۔ جلالی تجلیوں کو قہر و عذاب پر محمول نہ کریں کیونکہ مومن کے لیے ان میں لطف و کرم کی ادائیں پنہاں ہوتی ہیں۔

ع لطفِ نہان یار کا مشکل ہے امتیاز

اس عالم میں بظاہر فسق و کفر کو تقویت نظر آتی ہے، اور اولیاء اللہ کے حق میں ذلت و اذیت۔ لیکن یہی امر عین حکمت ہے جس سے ایک طرف اہلِ عشق و محبت کی فدائیت کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف منکروں، کافروں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی حجتِ بالغہ تمام ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام کے بعض دور میں دین اور دینداروں کو جتنا نقصان بعض مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں پہنچا اتنا شاید کافروں کے ہاتھوں بھی نہیں پہنچا ہوگا۔

(۴۲) رحیمیت کی تجلی | ایک بات سمجھ لو، سارے وساوس کا فور

ہو جائیں گے۔ قدرت کی تجلّی اُسی وقت ہوتی ہے جب سارے اسباب منقطع ہو جائیں۔ جب تک سبب کا ذرہ برابر سہارا ہو گا صفتِ قدرت کی تجلی نہ ہو گی۔ اِس کی مثال ایسی ہے کہ اگر آپ کے پاس آبِ حیات ہو تو نفسیاتی طور پر آپ اسے معمولی مرض میں استعمال نہیں کریں گے۔ جب تمام دوائیں ناکام ہو جائیں، جان لبوں پر آ جائے تو آپ آبِ حیات استعمال کریں گے اور مریض اچھا ہو جائے گا۔ اسی طرح آج کل مسلمانوں پر بے شمار مُہیب مصیبتیں ہیں، لیکن مایوسی کی بات نہیں جب اسباب کا بھروسہ نکل جائے اور مُسبّب پر دل جم جائے تو قدرت کی تجلی ہو کر مسلمان سنبھل جائیں گے۔ اس وقت صرف سیاسی جنگ نہیں ہے، بلکہ اسلام و کفر کا معرکہ آن پڑا ہے اس وقت کافروں کے خلاف جنگ صرف اسباب کے ذریعے ممکن نہیں۔ رحمٰن رحمٰن کا معاملہ نہیں۔ بلکہ رحمٰن کے مقابل رحیم کو اپنی قدرت کی تجلّی دکھانی ہو گی۔ تم ہی خیال کرو کہ ایسی شکل میں کافروں کی طرف اسمِ رحمٰن کا فیض ہو گا تو مومنین کی طرف اسمائے رحمٰن و رحیم دونوں کے فیض ہوں گے۔ کس کا پلہ بھاری ہو گا لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ اسمِ رحمٰن کے اقتضاء کی تعمیل میں حتی الامکان اسباب میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں اور ساتھ ہی اسمِ رحیم سے قوی ربط رکھیں۔ ایمان پر جمے رہیں اور حُبِّ نبوی اور اتباعِ رسالت میں کوتاہی نہ کریں۔
اسباب و وسائل کے استعمال کو دیانت و امانت کے تابع رکھیں۔
اور کتنے ہی بڑے اسباب و وسائل کیوں نہ ہوں اُن پر بھروسہ نہ کریں اُن کو اپنا سہارا نہ جانیں۔ اور اُن کے تابع نہ ہو جائیں۔

(۴۳) خلاصہ ۳۴ تا ۴۲ | چنانچہ حزبُ اللہ صاحبؒ البرنی میں اسمائے رحمٰن و رحیم

کی بحث کا حسبِ ذیل خلاصہ ملاحظہ ہو:۔
"خلاصہ یہ کہ عبد جو اللہ کی ربوبیت کا مظہر ہوتا ہے، اُس کی عبدیت رحمٰن و رحیم دونوں اسم کے فیضان کی جامع ہوتی ہے۔ اسی سبب عبدیت انسان کے عروج کا انتہائی مقام ہے۔ انبیاء کا بھی یہیں قیام ہے۔ انبیاء کے تحت صدیقین، صالحین بھی اس مقام سے فیض یاب ہوتے ہیں۔
ربوبیت کی دو شان ہیں۔ رحمٰن۔ رحیم۔ اسمِ رحمٰن کی شان حکمت ہے۔ اسم رحیم کی شان قدرت۔ رحمٰن کا فیضان عام ہے۔ اس کے واسطے ایمان شرط نہیں۔ مومن کے سوا کافر، ملحد، زندیق، سب کوئی اس فیضان پر زندگی بسر کرتے ہیں کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (۱۵/۲) اس کے مقابل رحیم کا فیضان خاص ہے۔ اس کے واسطے ایمان شرط ہے۔ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۲۲/۳) بہرحال رحمٰن و رحیم کا فیضان اور حکمت و قدرت کا تعلق ایمان و دین میں ربوبیت کا مرکزی مسئلہ ہے۔ جس کا خلاصہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے جس کا اجمال سورۂ فاتحہ میں درج ہے۔ جس کی تفصیل قرآنِ شریف میں پھیلی ہوئی ہے۔"

(۴۴) خلق و امر۔ حکمت و قدرت | قرآن میں ظہور کے چار اہم اعتبار ہیں۔ خلق۔ امر۔ کُن۔ کلمہ۔ انسان رُوح اور جسم سے مرکب ہے۔ رُوح کا تعلق عالمِ امر سے ہے اور جسم کا تعلق عالمِ خلق سے۔ دونوں کا تعلق رَبّ سے ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۸/۱۴) قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (۱۵/۱) عالمِ امر میں ہر چیز کُن کے ساتھ فوراً وجود میں آتی ہے۔ اس کا ظہور قدرت سے ہے۔ اس میں اطلاقیت ہے۔ یہ سلسلۂ اسباب سے بے نیاز ہے۔ اَمر کے عمل کے لیے کُن کلمہ ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا

اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۳۴) اس کے برخلاف جسم میں تقیید ہے۔ اور یہ سلسلۂ اسباب میں مقید ہے۔ اس کا ظہور حکمت کے تحت ہے۔

چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش عالمِ خلق کے عام قاعدہ کے خلاف باپ کے بغیر، امر کے تحت، کُن سے عمل میں آئی۔ اس لیے آپ کو قرآن میں کَلِمَۃُ اللّٰہ کہا گیا۔ اس طرح کُن اور کلمہ ایک ہیں۔ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں اَمر بمقابلہ خلق غالب و نمایاں ہے۔ اسی لیے آپ کی زندگی کے واقعات پُراسرار، حیرت ناک ہیں۔ مثلاً بچپن میں کرامت تھی کہ حضرت مریمؑ کے کمرہ میں غیب سے کھانا آجاتا تھا۔ بغیر باپ کے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی۔ پیدا ہوتے ہی بولنے لگے اور اپنی نبوت کا اعلان فرمایا۔ آپ مٹی کا پرندہ بناتے اور اس پر پھونکتے۔ فوراً وہ زندہ پرندہ بن جاتا۔ اللہ کے حکم سے آپ کے چھونے سے اندھوں، جذامیوں کو صحت ہوجاتی۔ مُردوں کو زندہ کر دیتے۔ لوگوں کے گھروں کے خزانے اور کھانوں کی تفصیل بیان فرماتے آپ کی دعا سے آسمان سے خوانِ نعمت اُترتا۔ آپ کے بجائے آپ کا مشابہ شخص سولی دیا گیا۔ علاوہ ازیں حضورِ انور صلعم کی معراج اور شقِ قمر وغیرہ وہ معجزات ہیں جن کا خصوصیت سے اَمر سے تعلق ہے، جہاں اسباب کو دخل نہیں۔ حکمت کے تحت اسباب عالمِ خلق کا اقتضا ہیں۔ اور قدرت کے تحت بے اسبابی عالمِ اَمر کا اقتضا۔ ان کے اسرار و حقایق عارفین پر کھلتے ہیں۔ قرآن کے لحاظ سے عبدیت میں مُردے کو زندہ کرنے کی گنجائش ہے چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے عبد اللہ ہونے کا اعلان فرمایا۔ امر کے عمل کا ظہور کُن سے ہوتا ہے۔ عموماً معجزات میں ملائکہ کا تعاون رہتا ہے۔ ایک فرشتہ نے امر کے تحت حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی بشارت

دی اور وہ حاملہ ہوگئیں۔

معجزات کی بنیاد اَمر و کُن پر ہے۔ دُنیا میں خلق کا عمل عام ہے اس میں علت و معلول کا سلسلہ چلتا ہے۔ لیکن اس بنا پر اَمر کے مقابلے میں خلق کی کمتری ثابت نہیں ہوتی۔ اگر خلق و اَمر میں اعلیٰ توازن ہو تو انسانیت کا اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے۔ حضورِ انورؐ مقامِ خلق اور مقامِ اَمر کے روابط میں توازن کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ توازن ہر نبی کی امتیازی خصوصیت ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی سہ سالہ رسالت کی زندگی کے چند ہی واقعات دُنیا کو معلوم ہیں، باقی پردۂ راز میں ہیں۔ بظاہر حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں امر غالب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خلق کے واقعات بھی قرآن و انجیل سے ثابت ہیں۔ مثلاً بچپن میں بلاسعی، امر کے تحت، حضرت مریمؑ کے کمرہ میں غیب سے کھانے آتے تھے۔ لیکن جب اُن کا مرتبہ بلند کیا گیا، اور حضرت عیسیٰؑ کی والدہ بننے کا وقت آیا تو زچگی کے بعد انھیں مقامِ خلق کا حق ادا کرنا پڑا۔ اور کھجور گرانے کے لیے سعی کا حکم ہوا۔ اسی طرح اَمر کے تحت حمل کے زمانے میں انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ لیکن مقامِ خلق میں زچگی کی تکلیف نہایت شدید رہی۔ یا تو حضرت عیسیٰؑ مُردوں کو زندہ کرتے تھے، یا انجیل کے بیان کے لحاظ سے حضرت عیسیٰؑ کو مقامِ خلق میں وفات کے وقت انتہائی تکلیفیں ہوئیں۔ اس سے مقصود آپ دونوں کی زندگی میں خلق و امر میں توازن قایم کرنا تھا تاکہ آپ کے مرتبے عالم میں ممتاز ہوں۔ ملائکہ اَمر کے تابع ہیں اور حیوانات خلق کے۔ لیکن انسان مقامِ خلق و امر کا جامع توازن رکھتا ہے۔ جنّات ملائکہ اور انسان کے بَین بَین ہیں۔

(۴۵) رسولِ کریمؐ۔ جبریلِ امینؑ ناچیز نے عرض کیا۔ جبریلؑ حاملِ کلماتِ قرآن

تھے یا عالمِ کلماتِ قرآن؟

فرمایا۔ اگر کہا جائے کہ خزانہ دار حافظ و امین ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ خزانہ کی تفصیلات سے واقف ہے۔ اور خزانہ پہنچانے کے معنی بھی یہ نہیں ہیں۔ حامل و قاصدِ کلمات کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ جاننے اور پیام پہنچانے کے بعد اُسے یاد بھی رہے، جیسا کہ حضور حافظ اور عالم ہیں۔ جبریلؑ فرشتہ ہیں، امین و قاصد ہیں نہ کہ عالم و حافظ۔ بینک اور بینکر دولت کا محل ہوتا ہے نہ کہ دولت سے تمتع کرتا ہے۔ ایک پوسٹ ماسٹر لاکھوں کی رقوم ملازم و قاصد کی حیثیت سے تقسیم کرتا ہے، خود تمتع سے محروم ہے۔ لیکن متمتع ہونے والے متمتع ہوتے ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قرآن میں بعض ایسی انسانی خصوصیات کا علم ہے جو فرشتوں میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً لوازمِ بشری اور مردانگی وغیرہ۔ پس جو صفات خود حضرت جبریلؑ میں نہ تھے ان کا علم انھیں کیسے ہو سکتا تھا۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ انسان خیر و شر کا جامع ہے۔ لیکن فرشتے شر سے خالی ہیں۔ لہٰذا فرشتوں کو شر کی تفصیلات کا علم نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں فرشتوں کو مقاماتِ انسانی کی رفعت کا بھی علم نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے آدمؑ کی خلافت کی خبر جو سُن پائی تو کہہ اُٹھے کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہتے ہیں جو فساد و خوں ریزی کرے (پ۱) اس پر اللہ نے متنبہ فرمایا۔ تم جاہل ہو۔ تمھیں معلوم نہیں: وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا (پ۱) (جملہ اسماء کا علم آدمؑ کو عطا فرمایا) اس سے ظاہر ہوا کہ فرشتوں کو آدمؑ کے سارے مقامات کا علم نہ تھا۔ حضورِ انور انسانِ کلّی ہیں جن میں جملہ اسماء کے مظہرِ تام بننے کی صلاحیت ہے۔ اَسْمَاءَ کُلَّهَا سے مُراد نہ صرف

اسماءِ الٰہیہ ہیں بلکہ اسماءِ کونیہ وغیرہ سب مُراد ہیں۔ کُلَّهَا لفظِ مُطلق ہے۔ اِس کو مقیّد کرنا جہل ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے قیاس آرائی پر فرشتوں کو تنبیہ فرمائی اور فرشتوں نے آدمؑ کی زبان سے علومِ اسماء کا بیان سُنا تو اپنے جہل کا اعتراف کیا اور معذرت کردی۔ سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (پ۱) فرشتوں کو تھوڑا سا علم ملا ہے۔ لیکن کل علم و حکمت کا حامل و عالم صاحبِ حقیقتِ آدمیہ رسول اللہ ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان مقدمات سے ظاہر ہے کہ جبریلِ امینؑ کو وہ علم حاصل نہیں جو جامعیت کے ساتھ حضور کو حاصل ہے۔ لہٰذا قرآن صاحبِ قرآن سے لینا چاہئے۔ وہی عالم ہیں یا جو آپ سے علم پائیں یعنی اولیاء اللہ۔

(۴۶) ملائکہ، جن و انس کا علم

فرشتوں نے آدمؑ کے علم ہی کو سجدہ کیا تھا کہ وہ اسماء کا علم رکھتا ہے۔ سب سے اعلیٰ علم انسان کو ملا ہے۔ اس کے بعد جنوں کو، اس کے بعد ملائکہ کو۔ شیطان بھی جن تھا۔ فسق و فجور کی وجہ سے اس نے "شیطانِ رجیم" نام پایا۔ جنوں میں بھی مسلمان اور کافر ہیں۔ مرشدین و مشائخین ہیں۔ لیکن اُن کی عبدیت ناقص ہوتی ہے۔ کیونکہ ناری مخلوق ہیں۔ ہم خاکی ہیں۔ خاک جہاں ڈال دو پڑی رہتی ہے۔ بے ارادتی و اضطرار اس کا خاص وصف ہے۔ اس کے برخلاف آگ میں زور اور حرارت ہے۔ جنوں کا ارادہ فنا نہیں ہوتا لیکن انسان کی اَنانیت و ارادہ فنا ہو جاتے ہیں اور وہ ذات کا مظہر بن جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ عبدیت کا کمال حاصل کرتا ہے۔

ملائکہ میں جنس نہیں۔ وہ ماموریت کی حد میں رہتے ہیں اور جبلّت پر عمل کرتے ہیں۔ اپنا ارادہ نہیں رکھتے۔ البتہ باقی مخلوق سے افضل ہیں کہ

ہیں۔ شیطان مُعلّمُ الملکوت تھا۔ اس کا قرآن میں ذکر نہیں۔ البتہ اس کا منشا ملائکہ کے مقابل میں جنّوں میں علم کی زیادتی دکھانا معلوم ہوتا ہے ملائکہ صرف خیر پر رہتے ہیں۔ شیطان شر پر لگا ہُوا ہے کہ وہ سراسر ضلالت ہے۔ اور انسان خیر و شر کا جامع ہے۔ جب خیر پر آتا ہے تو فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ اور اگر شر پر آئے تو شیطنت کی انتہا کردے۔ بعض اولیائے کاملین پر اپنی شریت اس درجہ منکشف ہوتی ہے کہ اگر شیطان کو اس کا علم ہوجائے تو اِس شریت کے سامنے سجدہ کردے اور اپنی شریت کو بھی ہیچ جانے۔

(۴۷) حدیثِ اَذِیّت

حضورِ انور صلعم نے ارشاد فرمایا۔ روئے زمین پر مجھ سے بڑھ کر کسی کو اَذِیّت نہیں دی گئی۔

اس کا مطلب عام طور پر غلط سمجھا جاتا ہے اس سے مُراد کھانے کپڑے، مال و دولت اور دُنیوی وسائل کی کمی اور تنگی یا دُکھ درد کا اظہار نہیں ہے کہ بہت سے کافروں کو بھی اس قسم کے مصائب کم و بیش پیش آتے ہیں۔ اس اذیت کے معنی یوں سمجھو۔ کسی بڑے قابل انجینیر سے یہ کہا جائے کہ ہمالیہ پہاڑ کاٹ کر ایک بڑی نہر نکالو۔ اور خود انجینیر بھی دریا دلی سے اُس نہر کو بنانے لیے بے چین ہو کہ اس سے مُلک گلزار ہو جائے گا۔ ایک طرف تو اس کو یہ حکم ملے اور دوسری طرف اہلِ ملک جن کی فلاح و ترقی کے لیے اس نے اس اسکیم کا بیڑا اُٹھایا ہے، خود اس اسکیم کے، بلکہ انجینیر کے مخالف بن جائیں۔ تو انجینیر کہے گا کہ مجھے عمر بھر میں ایسی مصیبتِ عظمیٰ کبھی پیش نہیں آئی جیسی اِس نہر کے نکالنے میں آئی۔ یہاں اِس بیان سے انجینیر کے کھانے کپڑے وغیرہ کی تنگی کی مصیبت مُراد نہ ہوگی۔ اِسی طرح حضور صلعم کو اللہ تعالیٰ نے سارے

عالم کے لیے رسول بنا کر بھیجا اور ہدایت کے لیے مامور فرمایا۔ ایک طرف آپ کو رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِیْن، بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْم۔ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ۔ رَسُوْلٌ کَرِیْم جیسے صفات عطا فرمائے تو دوسری طرف اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ (پ۲۰)، بھی فرما دیا۔ اور ان تمام انتہائی نازک، اعلیٰ روابط و جذبات و احساسات کے ساتھ بمقابلہ اولیٰ عرب جاہلیت جیسی اشد، جانی دُشمن اور گمراہ قوم کی اصلاح کا فرض سپرد ہوا جس کی کامیابی سے انجام دہی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھی۔

(۴۸) خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِی

فرمایا۔ حضورؐ کے زمانے کو محض حضورؐ کی موجودگی کی وجہ سے بہترین قرن کہتے ہیں اس کے بعد بہت سے ایسے ناگوار واقعات پیش آئے مثلاً جنگِ صفین۔ جنگِ کربلا وغیرہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلال و غِنا کے سامنے دم بخود رہنا پڑتا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اسمِ ہادی کی تجلّی اس زمانے میں بہت قوی تھی اس لیے اس کے مقابل ضلالت کے اقتضاءات بھی بہت قوّت و شدّت سے ظاہر ہونے ضروری تھے۔ لہذا ایسی ساری شکلیں پیش آئیں۔

فصلِ سوم

توحیدِ افعالی۔ رُبُوبِیّت

(۱)(ا) عَبْدُ وَ رَبّ

اسلام کی تعلیم کا نچوڑ عبد و رب کے مابین تعلق کا علم ہے جس سے کائنات میں انسان کا مقام سمجھ میں آتا ہے۔ عبد وہ ہے جو ذاتًا معدوم ہے۔ البتہ علمِ الٰہی میں اُسے ثبوتِ علمی حاصل ہے۔ اس کا اصلاً اپنا کچھ نہیں۔ اور جو کچھ اُسے حاصل ہے وہ رب سے ملتا ہے۔ اور رب وہ ہے جو شئے کے اقتضائے ذات کے مطابق اس کی تخلیق کرتا ہے، پرورش کرتا ہے۔ اور مِن کُلِّ وجوہ شئے کی تکمیل فرماتا ہے۔ پس عبد اپنی ذات کے اعتبار سے ہر وقت ہالِک و فانی ہے۔ اور اُس کا قیام اللہ کی قیّومیت سے ہے۔

(ب) آدمؑ اور شیطان خلق اور کسب

سب سے بڑا امتحانی سوال جو اللہ تعالیٰ نے دیا تھا وہ رُبوبیّت کا مسئلہ تھا جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اُس کے جوابات بھی محفوظ ہیں۔ اِسی امتحان میں شیطان ناکام اور آدمؑ کامیاب ہوئے۔ جب اللہ نے ملائکہ سے آدمؑ کو سجدہ کرنے کے لئے فرمایا تو شیطان نے غرور سے اس کی تعمیل سے انکار کیا اور کہا۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (۸/۹) میں اس سے بہتر ہُوں۔ اِس اِنکار پر جب وہ مردودِ بارگاہ ہُوا تو کہہ دیا۔ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ (۸/۹) (بسبب اس کے کہ تو نے ہی مجھے گمراہ کیا) اِس طرح گمراہ کرنے

کے فعل کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا۔ اور خیر کو اپنی طرف منسوب کیا۔ اس کے یہ دعاوٰی اعتبارات جہل، شرک و کفر کے تھے۔ اللہ نے اُسے گمراہ نہیں کیا بلکہ اس کے اقتضائے ذات شر کو ظاہر کر دیا۔ جو مانگ تھی دیدی۔ اٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ (۱۳/۱۳) اس نے بحث شروع کر دی کہ میں آدم سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے آدمؑ کو مٹی سے بنایا اور مجھے آگ سے لیکن اس جاہل کو کیسے معلوم ہوا کہ آگ مٹی سے بہتر ہے۔ کوئی وحی تو نہ تھی۔

(۲) مٹی کی عظمت

وہ مٹی کی حقیقت کو سمجھ نہ سکا۔ مٹی جامد اور بے ارادہ ہے۔ اور نزول کی پوری جامعیت رکھتی ہے۔ مٹی سے بڑھکر کسی میں نزول نہیں۔ اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا جو کامل نزول کی حالت ہے تاکہ اُسے کامل عروج عطا کرے اور اپنے اسماء کا مظہر بنائے! اور یہی اس کی فوقیت کی وہ جہت ہے جس کے سامنے ملائکہ کو سجدہ کرنا پڑا لیکن ظاہر بینوں کی نظر نزولی رُخ پر ہے۔ عروجی رُخ پر نہیں۔

پھر یہ کہ اس بے وقوف کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ رَبّ وہ ہے جو ایک لمحہ میں خیر کو شر میں بدل سکتا ہے۔ اس نے کیسے سمجھا کہ وہ خیر ہی رہے گا۔ وہ رَبّ ہی کیا جو کسی چیز کا پابند ہو۔ وہ ہر پابندی سے بالا ہے غنی ہے۔ اِسی وجوب و غنا کی بناء پر اللہ تعالیٰ کو سجدہ فرض ہے۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اپنے ذاتی اقتضائے شر پر نظر نہ کی، جاہل تھا۔ لیکن حضرت آدمؑ جنہیں کُل اسماء کا علم عطا ہوا تھا انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تخلیق، قدرت اور غنا پر نظر کی۔ اور اپنے کسب و اقتضائے ذاتی شر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی غلطی پر توبہ کی اور فرمایا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (۸/۹) (اے پروردگار۔ ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اگر تو نے مغفرت و رحمت نہ کی تو ہم خسارہ میں رہیں گے)۔

علاوہ ازیں جاہل شیطان کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ اس میں خیر کی جہت ہے ہی نہیں تو ادّعا کیسے۔ رب کا لفظ تو کہا مطلب نہیں سمجھا۔ توحیدِ افعالی میں خلقِ فعل وکسبِ فعل کی تمیز نہ کی۔ اور جہالت سے گمراہی کا فعل اللہ کی طرف منسوب کردیا۔ اگر کسب کا اعتبار لیتا تو سارا الزام اپنے سر لیتا۔ اس کے برخلاف حضرت آدمؑ نے خلق وکسب میں فرق وتمیز کیا۔ اور اسے سمجھ کر اپنی خطا پر توبہ کی۔ اور اسمائے الٰہی ربّ، توّاب، غفّار، رحمٰن، رحیم کی طرف رجوع کرکے استفادہ کیا لیکن شیطان جہلِ مرکّب اور ہٹ دھرمی پر اُتر آیا اور ملعون ہوا۔ اس کے باوجود ایک باطل فرقہ شیطان کے موحّد ہونے کا قائل ہے۔

(۳) رسولُ اللہ اور شیطان خیرِ کثیر۔ شرِ کثیر

اسی ربوبیت واقتضائے ذاتی خیر وشر، خلق وکسب کے مسئلہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں وضاحت سے سمجھا دیا۔ رسول اللہ صلعم جملہ اسمائے الٰہی کے مظہرِ تام ہیں۔ اس لئے سب سے بڑھ کر خیرِ کثیر آپ کے حصے میں آیا کہ رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ ہیں۔ اور آپ کے طفیل میں شیطان کو بھی کچھ خیر ملا کہ وہ آپ کی رحمت کے صدقے میں زندہ اور قائم ہے۔ البتہ وہ شرِ کثیر کا محل بنا۔ اور ذاتی شرِ کثیر کے باوجود وہی شیطان حکمتِ کُلّی میں انبیاء، اولیاء کے عروج کے لئے رحمت بن جاتا ہے۔ یہ گویا زہر سے تریاق کا کام لینے کا حکیمانہ اصول وکمال ہے۔ مثال کے لئے کوئلہ اور ہیرا دونوں میں کاربن ہے۔ دونوں کی حقیقت ایک ہے۔ کوئلہ میں سیاہی ہے۔ نور نہ ہونے کا نام سیاہی ہے۔ نور آیا تو ہیرا بنا۔ اسی طرح عدمیت وشریت نفس کا خاصّہ ہے۔ اور جس حد تک خیر ہے مِنَ اللہ ہے۔ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ وَ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ......

.... وَ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (۵⁄۹)۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (۱۳⁄۲) نفس کا شر اصلی ہے۔ البتہ رحم وخیر فضلِ ربّی ہے۔ اسی لئے فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ (۲۷⁄۶) کا حکم ہے (یعنی اپنے کو پاکیزہ مت جتاؤ) کیونکہ تم شر ہو۔ البتہ جب ہم خیر دیں تو اولیاء اللہ کی طرح خیر کو ہماری طرف سے جانو اور اظہارِ نعمت کرو۔ شیطان کی طرح خیر کو اپنی طرف راجع نہ کرو۔

• یہی علم رسالت ہے کہ فرمایا وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ وَ وَجَدَكَ عَآىٕلًا فَاَغْنٰى (۳۰⁄۱۸) (تجھ کو گمراہ پایا تو ہدایت کی۔ اور وجود میں فقیر ومحتاج پایا تو غنی کردیا) کتنی بڑی حقیقت ہے اور کتنی بڑی تجلّی۔ جب اپنی ذات کو جاہل، عدم اور گمراہ دیکھا کہ رائی برابر ہدایت ذاتاً مجھے حاصل نہیں تو عبدیّت کھل گئی۔ اور اُسی وقت ہدایت کی بشارت ملی اور توحید کھلی۔ گمراہی اپنی صفتِ اصلی ہے۔ ہدایت کا علم اِضافی فضلی ہے۔ ضال ہی میں ھدیٰ کی تجلّی آرہی ہے ورنہ وہ عدمِ ضال کے سوا کچھ نہیں۔

(۴) فجور وتقویٰ کا الہام

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا (۳۰⁄۱۶) یعنی اللہ نے اس (شئی) کے ذاتی فجور وتقویٰ۔ (شر وخیر) کو اس پر الہام کیا۔ الہام (خطرہ) کی تخلیق تو خیر ہے لیکن اس تخلیق کے بعد مخلوق کے اندر وہ فجور بن جاتا ہے یا تقویٰ۔ اسی کا امتیاز وادب ضروری ہے ورنہ الحاد ہے۔ ملحدین فجور وتقویٰ کی تمیز کے بغیر ہر خطرہ کو خیر سمجھکر جہالت سے تعمیل کرتے ہیں جو مقامِ نفس ہے۔ اور نفس فسق وفجور کا مؤید ہے۔ شیطان کی طرح اقتضاءات کو ملحوظ

نہیں رکھتے اور فجور کو بھی من خلقِ اللہ خیر کہہ کر معصیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اسے توحیدِ افعالی کی تکمیل کی سند سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسی آیت میں فجور و تقویٰ کا امتیاز ظاہر کیا جا رہا ہے۔

بعض ملحد الہام کے معنی حکم کے لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ہم تو حکم و الہام کے تحت عمل کرتے ہیں۔ سمجھنا چاہیئے کہ ہر الہام حکم نہیں ہوا کرتا۔ فجور و تقویٰ کا علم اور اللہ کا منشا قرآن میں تفصیل سے احکام کی شکل میں موجود ہے جس کا لحاظ فرض ہے۔

تخلیق کے بعد شئی میں جو خیر ہے من اللہ ہے، اور جو شر ہے مِنَ النَّفس ہے۔ شئی میں دراصل خیر ہے ہی نہیں۔ وہ تو شئے کے لئے زاید بر ذات ہے خیر وجود کا لازمہ ہے۔ اور شر بندے کی ذات کا لازمہ ہے جس کو بعینہٖ اللہ نے ظاہر کردیا۔ اسی لئے کہا گیا کہ خیر و شر دونوں کا ظہور مِنْ عِنْدِ اللّٰہ ہے۔ یعنی اللہ کی تخلیق سے ہے۔ شر (عدم اور اُس کے لوازم جہل بیماری وغیرہ) اس کا ذاتی ہے۔ اور وہ شئے ویسی ہی ہے اصلاً ذاتاً۔ البتہ اس میں حسنہ اور خیر کی جہت وجود کے فیضان کی وجہ سے ہے جو اس کے لئے زاید بر ذات ہے، فضل و عطا ہے۔ عدم کوئی شئے نہیں اور نہ شر کوئی ایجابی حقیقت ہے۔ بلکہ وجود جو اللہ کی ذات بھی ہے خیرِ حقیقی ہے۔ وجود نہ ہونا عدم، اور خیر نہ ہونا ہی شر ہے۔

(۵) خلق و کسب کے لئے سینما کی مثال | اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۸/۲۴)۔

(اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے) نور کا خاصہ یہ ہے کہ خود ظاہر ہو کر دوسرے کو ظاہر کرے۔ اللہ خود ظاہر ہو کر اشیاء کو نمایاں کر رہا ہے۔ اشیاء کی حقیقت فرضِ معلوم ہے، صفتِ علم میں

اُن کا ثبوت ہے۔ اس کے آگے ذات میں رسائی کہاں۔ لیکن چونکہ اسم صفت ذات سے جدا نہیں۔ اس لئے ذات کا ایک اعتبار لیا جاتا ہے۔ صفتِ نور کے متعلق ہونے کے بعد ہی یعنی تخلیق کے بعد ہی اشیاء نام پاتے ہیں۔ مثلاً سینما کا نور تخلیقی کام انجام دیتا ہے۔ کالی نیلی پیلی تصویریں اندر ظلمت میں ہیں۔ نور کا کام اقتضائے ذات کے مطابق ہر چیز کو ظاہر کردینا ہے۔ جب نور آجائے اور تصاویر کو من و عن ظاہر کردے تو تصاویر پر کالی گوری کا حکم لگتا ہے نہ کہ نور پر۔ اسی طرح تخلیق کے عمل سے پہلے نہ کوئی چیز اچھی ہے نہ بری۔ جب نور سے اشیاء کا ظہور ہو جائے تو نیک و بد کا حکم اشیاء پر لگتا ہے نہ کہ نور پر۔ سینما کا نور تصاویر کو ظاہر کرنے والا ہے نہ کہ نور تصویر ہے۔ اس لئے نور کھا رہا ہے، نور چوری کر رہا ہے نہیں کہتے۔ بلکہ ان افعال کو تصاویر کی طرف منسوب کرتے ہیں جو نور سے نمایاں ہوتی ہیں۔ اس لئے اللہ اور ہے، بندہ اور ہے۔ سُبحان اللہ (یعنی اللہ اشیاء کے عیوب سے پاک ہے) البتہ اِفاضۂ وجود (تخلیق) کی وجہ سے حق کا خلق سے ربط ہے۔ سر سے پیر تک اللہ کا نور ہے۔ یہ ہے الحمد للہ (یعنی سب حمد و خوبی اللہ کی ہے) سُبحانَ اللہ و الحمد للہ (تنزیہ و تشبیہ) کی یہی جامعیت بصیرتِ محمدیؐ ہے۔ اور بندہ تصویر کی طرح اپنے سارے لوازم و اقتضاءات کا مرجع ہے، بجز نور کے۔ نورِ (وجود) اس کے لئے زائد بر ذات ہے۔ اسی مسئلہ کے غلط علم کی وجہ سے بعضوں کے پاس معصیت عبادت بن گئی ہے کہ بلا لحاظ ماں، بہن، بیٹی سب روا رکھتے ہیں۔ اور اسے توحیدِ وجودی کی تکمیل کی سند سمجھتے ہیں کہ سب اللہ ہے۔ معاذ اللہ

(۶) خلقِ موت و حیات | خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ

أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (۲۹) ۔ (اللہ نے) موت و حیات کو پیدا کیا
تاکہ آزمائے تم کو، کون تم میں سے عمل میں بہتر ہے) اس میں موت کو پہلے
کیوں بیان کیا گیا۔ اس پر فرمایا۔ اصل یہ ہے کہ موت و مَیِّت کوئی ایجابی
چیز نہیں ہے۔ حیات نہ ہونے کا نام موت ہے۔ البتہ اسمِ حی کا میت کے ساتھ
جو ربط آ کر پڑا ہے وہی خلق (پیدا کرنا) کہلاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارا اصلی
میت پن (موت) پہلے نمایاں ہو رہا ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس کے لوازم جہل،
نقص، صورت وغیرہ نمایاں ہیں۔ اس کے بعد اپنی موت میں حیات نمایاں ہے،
عدم میں وجود نمایاں ہے، جہل میں علم نمایاں ہے۔ اضطرار میں ارادہ نمایاں ہے،
عجز میں قدرت نمایاں ہے وغیرہ۔ اسی لئے اللہ کے لئے جامع صفت حیات کا
اور بندے کے لئے جامع صفت موت کا اس آیت میں ذکر فرمایا۔

(۷) خلاصہ ۱ تا ۶ | مختصر یہ کہ خلقِ فعل اللہ کی طرف سے ہے۔ اور کسبِ فعل بندے کا۔ اللہ خالقِ فعل ہے تو بندہ کاسبِ
فعل و عمل۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ (۲۳) : (اللہ نے تم
کو پیدا کیا اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو) فاعلِ حقیقی اور فاعلِ مجازی کے الفاظ گمراہ کن
ہیں۔ "اللہ ہی فاعل و منفعل ہے" کے الفاظ مزید گمراہ کن ہیں، غیر واقعی ہیں۔
ایسے لوگ بے ادبی اور جہل سے ساری معصیتوں کا مرجع حق کو ٹھہرا کر ایمان
تباہ کر لیتے ہیں۔ اُن سے تو مجمل ایمان والا عامی بسا غنیمت ہے۔ جس کو ایمان
و ادب کی برکت سے اعلیٰ مقامات ان موحدینِ باطلہ کے مقابل حاصل ہو جاتے
ہیں۔ سب افعال اکل و شرب، نکاح، زنا، چوری وغیرہ ہمارے ذاتی ہیں۔
ہم ان کے فاعل ہیں۔ البتہ حول و قوت کے ذریعے تخلیق کر کے ان افعال کو نمایاں
کرنا حق کا کام ہے۔ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ (۱۵) (حول و قوت اللہ ہی

کی ہے)۔ اللہ ان افعال کا نہ تو فاعل ہے، نہ مُنفعِل ہے، بلکہ صرف خالق
ہے یعنی صفتِ نور (وجود) سے ظاہر کرتا ہے، سینما کے نور کی طرح۔
توحیدِ افعالی سب سے بڑا نازک مقام ہے جہاں اچھے اچھے پھسل کر گرتے
ہیں۔ یہیں رب اور عبد کی دو ذاتیں کھلتی ہیں۔ اس کے بغیر نہ تو عبودیت
صاف ہوتی ہے اور نہ توحیدِ وجودی کھلتی ہے۔ قلب میں ہمیشہ ضیق رہتی ہے
حضرت غوث الاعظمؒ کی تعلیم کا سارا زور توحیدِ افعالی پر ہے۔ اس کے بغیر 8
نہ اوپر کے مقامات کھلتے ہیں اور نہ نیچے کے۔ سب دھوکا ہی دھوکا رہتا ہے

(۸) فصوص الحکم | فرمایا۔ بعض جاہل جنہیں علمِ صحیح حاصل نہیں ہوتا، فصوص الحکم کے بعض ابواب پڑھ کر بہک جاتے ہیں۔ اور
محض قسم کے مراقبے کر کے اپنے ایمان کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ خلقِ افعال اور کسبِ
افعال کے مسئلہ کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ احتیاط واجب ہے۔ اس معرکۃ الآراء کتاب
میں حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ نے جو معارف قلمبند فرمائے ہیں، بیشتر دقیق
بلکہ ادق ہیں۔ اور پھر ان کا بیان بھی بے باک، بے دھڑک ہے۔ عارفین تو اس
سے کامل فائدہ اُٹھاتے ہیں، لیکن عام طور پر اس کے مطالعے سے لوگ غلط فہمی میں
پھنس جاتے ہیں۔ معتقد او معترض دونوں نقصان اُٹھاتے ہیں۔ تاہم حضرت
کا مسلک اسلم ہے۔

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَإِنْ تَرَقّٰى ۔ وَالرَّبُّ رَبٌّ وَإِنْ تَنَزَّلْ

(۹) ہبوطِ آدمؑ | سوال۔ جنت گناہ کا محل نہیں۔ حضرت آدمؑ کی غلطی اور ہُبُوطِ اِلَی الْاَرْض کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا۔
قرآن میں آدمؑ اور ابلیس کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق عالمِ امر، عالمِ
مثال سے ہے۔ اُس عالم میں بھی تخلیق ہے۔ تصویر ہے چنانچہ ارشاد ہے

وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ (۸/۹) عالمِ مثال وغیرہ میں بھی مجتبیں ہیں، مخالفتیں ہیں، جن کے آثار کبھی عالمِ شہادت میں آتے ہیں کبھی نہیں۔ حضرت آدمؑ کی تخلیق اور روئے زمین سے پہلے کی زندگی عالمِ امر میں تھی۔ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَۃَ (۸/۹) یَنْزِعُ عَنْھُمَا لِبَاسَھُمَا لِیُرِیَھُمَا سَوْاٰتِھِمَا (۴/۱) جب آدم وحوا نے درخت کو چکھا۔ شیطان نے ان کا لباس اُتروا دیا تاکہ دکھلا دیوے ان کو پردہ کا بدن (شرم گاہیں ان کی) اُس عالم میں جو غلطی ہوئی اس کی بنا پر جنت سے نکال کر عالمِ شہادت میں منتقل کیا گیا۔ اور یہاں حکمت کے تحت زندگی شروع ہوئی۔ اِسے مشکل کیوں سمجھا جائے جبکہ عالمِ امر و مثال کی مخلوق ملائکہ، جبرئیل تک حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضور انور صلعم کے پاس انسانوں کی شکل میں تجلی و تمثل کرکے عالمِ شہادت میں آتے تھے اور اب بھی شبِ قدر وغیرہ میں آتے ہیں۔

(۱۰) حقیقتِ شیطان

بعض جاہل کہتے ہیں کہ شیطان کا علم رسول اللہ کے علم سے بڑھکر ہے۔ کیونکہ وہ ہر نفس کی جنبشوں سے واقف رہتا ہے اور رگ رگ میں دوڑتا ہے۔ اِن نادانوں کو یہ تک نہیں معلوم کہ رسول اللہ نے دُنیا کو شیطان کی حقیقت سے واقف کرایا۔ شیطان تو آدمؑ کی حقیقت بھی نہ سمجھ سکا تو رسول اللہ کی حقیقت، رسالت، علم اور توحید کو کہاں پا سکتا ہے۔

(۱۱) نفس و شیطان

شرارت ہی شیطان ہے۔ اور نفس کا خاصہ شرارت ہے۔ شیطان شر کا سب سے بڑا تعین ہے۔ شیطان بہکانے والا ہے اور نفس بہکنے والا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ (۲/۱۲)۔ (وہ (شیطان) تم کو بُرائی

اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے)۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (۱۳/۱) (تحقیق نفس بُرائی کا حکم کرتا ہے)۔ یہ تو ہر ایک کا خاصہ ہوا۔ شر شیطانی خطرہ سے اور خیر رحمانی خطرہ سے آتا ہے۔ اگر نفس نے شیطانی خطرے کو اختیار کیا تو شر ہوگا اور رحمانی خطرے کو اختیار کیا تو خیر ہوگا۔ علمِ غلط کے محل کو نفس، اور علمِ صحیح کے محل کو قلب کہتے ہیں۔

گنہگار کا نفس معصیت پر ندامت کی وجہ سے کمزور ہو جاتا ہے۔ اور عابد کا نفس اگر علم صحیح نہ ہو تو بہت موٹا بلکہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ گویا سانپ کو دودھ، بالائی کھلانا ہے۔ حضرت عمرؓ کی بڑائی کا راز یہی تھا کہ حضور نے فرمایا۔ "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ نبی ہوتا۔ عمر جس گلی سے گزرتا ہے شیطان بھاگ جاتا ہے"۔ اللہ نے ہر نبی کے لئے شَیَاطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ پیدا کئے ہیں جن سے مقابلہ لازمی ہے۔ اِسی میں اُن کی قوتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی لئے شیطان شناسی پر اکابر بہت زور دیتے تھے۔ میں بھی اسی کا قائل ہوں، آج کل مشائخ حق شناسی پر بہت زور دیتے ہیں۔ شیطان کے چکر سے واقف نہیں حالانکہ سلوک میں مجاہدہ کے لئے شیطان اور اُس کے داؤ پیچ سے واقفیت لازمی ہے۔ قرآن شیطان کو ہمارا سب سے بڑا کھلا دشمن بتاتا ہے۔ لہٰذا ہم کو سب سے پہلے اِس دشمن سے محفوظ ہونا چاہیئے تاکہ قرآن کھلے اور جملہ کام اطمینان سے ہو سکیں۔

ایک صاحب نے کہا۔ میں نے حضرت غوثِ اعظمؓ کی جناب میں متوجہ ہو کر عرض کیا حضرت! نفس و شیطان میرے بڑے دشمن ہیں۔ اِن کو مار ڈالئے۔ حضرت (برنی صاحب) نے فرمایا۔ ٹھیک ہے۔ جو دشمن ہمارے قابو سے باہر ہیں۔ اُن کے قتل کے لئے کہنا تو مناسب ہے۔ لیکن نفس و شیطان تو ہمارے قابو میں ہیں۔ اُن سے تو ہم کو ہر وقت جنگ و جہاد کا حکم ہے۔ ان کو بھی حضرت کے

حوالے کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کہیں ہم کو کھانا کھلا دیجئے ہم کو چلا دیجئے۔
قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ امورِ غیر اختیاری کو سپرد کرنا مناسب ہے۔

(۱۲) شیطان کا شکار

جب تک اَنِیَّتْ (میں پن) باقی ہے شیطان حملہ کرتا رہتا ہے۔ ناچیز نے عرض کیا۔ کیا غوث اقطاب کی انیت مردہ نہیں ہوتی کہ شیطان اخیر وقت تک اُن کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ فرمایا۔ حالات اور محل مختلف ہیں۔ ایک انسان وہ ہے کہ جنگل میں جاکر شیر کا شکار کرتا ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ شیر گاؤں میں آکر انسانوں کا شکار کرتا ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ شیر اور انسان ہی کا تعلق دونوں محل پر کام کر رہا ہے۔ ایک میں شیر انسان کا شکار بنتا ہے، تو دوسرے میں انسان شیر کا شکار بنتا ہے۔ اگر انیت فنا نہ ہو تو شیر (شیطان) ہمیں شکار کرتا ہے۔ غوث، اقطاب کی اَنیت فنا ہو چکی ہے۔ لہٰذا وہ شیطان کا شکار کرتے ہیں، بھگاتے ہیں مارتے ہیں۔ اِسی جہاد میں انسان کی ترقی ہے، کمال ہے۔ ورنہ انیت میں پستی ہے، تنزل ہے۔

(۱۳) نفس کی مثال

بعض مشائخین اور علماء کے نفسیاتی مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ خدمتِ اسلام کے لئے بے نفسی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن احساسِ برتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ نفس و شیطان کے چکر میں ہیں۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ان کا مقام رہتا ہے۔ حضرت خلیل احمد پروفیسر علی گڈھ بڑے صاحبِ دل بزرگ تھے، فرماتے تھے۔ نفس کی مثال سوٴر کی سی ہے۔ اس کو حلال دودھ بالائی کھلاکر، نہلا دھلا کر کتنا ہی پاک صاف بنائیں۔ سوٴر کا ہر بال نجس رہتا ہے۔ اِسی طرح نفس حرام کا حریص رہتا ہے۔ نفس شر کا حکم کرتا ہے بجز اس کے کہ اللہ رحم کرے۔ اس کا شر صرف علم صحیح سے دفع ہوتا ہے۔ اللہ نفس و شیطان سے بچائے۔

(۱۴) نفس کا شر اور مختلف گروہ

صرف علمِ صحیح سے نفس کے شر کی پہچان ہوتی ہے اور اس کا علاج بھی علمِ صحیح ہے۔ بعض لوگ مَلکوتی صفت ہوتے ہیں، جن کو شر کا علم نہیں ہوتا، جو شر کی آگ میں جھلستے نہیں اور خیر ہی خیر میں رہتے ہیں۔ اُن کی حالت تجریدی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو شر و اس کے ماحول و فضا کا پورا علم رکھتے ہیں لیکن محفوظ رہتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو شر کی آگ میں جھلستے ہیں (ایسے علم و عمل سے پناہ مانگی گئی ہے) اور بدصورت ہو جاتے ہیں، حُسن میں فرق آجاتا ہے۔ لیکن طبیب حاذق ہو، علاج اچھا ہو تو صحت ہو کر بدصورتی دُور ہو جاتی ہے لیکن ایسا شخص اس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو عمر بھر صحت مند اور حسین رہا ہو۔

(۱۵) دینی کام میں نفس کا چکّر

ایک صاحب نے اپنے ایک فردِ خاندان کی تیمارداری ملتوی کر کے ایک دینی خدمت انجام دی۔ فرمایا۔ اسلام نے اس عالم میں سب سے زیادہ وقت کی قدر بتائی ہے۔ لاابالی پن نہ دین میں پسندیدہ ہے اور نہ دنیا میں۔ پہلے فرض مُقدم ہے۔ اس کے بعد نفل ہے۔ جسمانی تکلیفوں میں، حقِ تیمارداری ادا کرنے میں نماز تک کی قضا جائز رکھی گئی ہے۔ مقصود کیا ہے۔ صرف موقع، محل کا امتیاز ہے۔ اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ بعض وقت اِس طرح دینی کام کو مقتضا کے خلاف مقدّم کرنے میں نفس کا چکّر رہتا ہے۔ بڑا دیو (نفس) دل میں بیٹھا رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہم دین کے ایسے کارگذار ہیں کہ اپنے دنیوی کام چھوڑ کر دینی کام کرتے ہیں۔ اگر اس طرح دینی کاموں میں بھی نفس نے بڑائی اختیار کی تو شیطنت آگئی۔ ایسی صورت میں فیضان رُک جاتا ہے، جواب طلب ہو جاتا ہے۔

(۱۶) عارفین کا نفس

ایک صاحب نے ایک عارفِ کامل کے بارے میں

بیان کیا کہ انھوں نے فلاں معاملہ میں نفسانیت برتی۔ فرمایا۔ عارفین نے نفس کے باب میں لکھا ہے کہ بڑے بڑے مقامات پر پہنچ کر بھی وہ اپنی فطرت دکھاتا ہے۔ اس سے کبھی مامون نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ عارفین بعض وقت امر کے تحت حضرتِ خضرؑ کی طرح کوئی ایسا عمل کرتے ہیں جو بظاہر بدنما ہوتا ہے۔ بالفرض ان کا عمل نفسانیت کے تحت بھی ہو تو نفس بھی تو لطیف و کثیف ہوتے ہیں۔ کبھی نفس بہت کثافت دکھاتا ہے اور کبھی لطیف طریقہ پر لغزشیں کرتا ہے۔ اگر نفس بھی مانا جائے تو اُن کا نفس دوسروں کے مقابلے میں اصلاح یافتہ ہوتا ہے۔ ایک بات یہ ہے کہ ایسے عمل کو ہمیشہ نفس کے تحت نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اقتضائے ذات کہہ سکتے ہیں جو نفس سے اعلیٰ ہے۔

(۱۷) کان کی لذّت

انسانی فطرت ہے۔ کان سے بہت لذت لیتا ہے۔ حتیٰ کہ سلوک میں سب کے آخر میں کان کی لذّت کا ازالہ ہوتا ہے۔ اس لئے تعریف وغیرہ سے بہت ہوشیار رہنا چاہیئے۔ اگر کوئی میری تعریف کرے تو میں گھٹا دیتا ہوں۔ بُرائی کرے تو اُس میں خود میں اضافہ کر دیتا ہوں۔ اسلم طریق یہ ہے کہ ہمیشہ عدمیت ملحوظ رہے۔ سارے عالم کو میّت جانے۔ نہ کسی سے امید رکھے اور نہ تعریف سے متاثر ہو۔ اگر عنداللہ مقبول ہے تو خوشی مناسب ورنہ بے سود ہے۔ مخلوق کا کہنا سند نہیں۔ عارف خلق کی خوشی، ناخوشی سے بالا ہوتا ہے۔ ہر امر میں اُسے رضائے حق مطلوب ہوتی ہے۔ اگر کسی نیک کام پر تعریف ہو تو اُسے فضل جانے، اُس کے پیچھے نہ پڑے۔ اگر کوئی بُرائی کرے تو ہم ذاتاً برے ہی ہیں۔ مخلوق نہ اس میں اضافہ کر سکتی ہے نہ کمی۔ لہٰذا مخلوق سے نہ گھبرائیں، اللہ ہی سے خائف رہیں۔ ذاتاً ہم کسی

عظمت و تعریف کے قابل نہیں۔ ہمیں باطن سے ظاہر کو متاثر کرنا چاہیئے نہ کہ ظاہر (خارج) سے باطن کو۔ محفلوں میں بڑی جگہ حاصل ہونے کو اعزاز نہ خیال کریں اور نہ اس کی تلاش میں رہیں۔

(۱۸) شر کی کشش کی وجہ

ہماری ذات میں بوجہ عدمیت شر ہی شر ہے۔ اسی لئے نفس شر (گناہ) سے اجنبیّت محسوس نہیں کرتا بلکہ مجانست محسوس کرتا ہے اور خیر متقدم کرتا ہے۔ اور شیطان جو شر کا سب سے بڑا تعیّن ہے اس کا مددگار ہوتا ہے نفس و شیطان کی شر کے ساتھ ہم مذاقی ہے۔ اس لئے طبیعت شر کی طرف مائل ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شر میں لذّت فوری حاصل ہوتی ہے کہ نفس کے مطابق ہے۔ اس لئے بھی شر کی طرف میلان فطری ہے۔ اس کے برخلاف خیر کی طرف بڑھنے میں گرانی، تکلف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ایک زائد چیز ہے خیر اضافی ہے، شر ذاتی ہے۔ خیر زاید بر ذات ہے۔ خیر میں عروج ہے شر میں نزول ہے۔ چڑھنا مشکل ہے۔ گرنا آسان ہے۔ علاوہ ازیں خیر کا نتیجہ اور لذّت آخرت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس لئے نفس و شیطان کے ساتھ کشمکش کر کے، اللہ رسولؐ کی خاطر شر کو چھوڑنا اور خیر کو اختیار کرنا خاص درجات کا ضامن ہے اور فضل پر منحصر ہے۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ سب سے بڑا عارف باللہ وہ ہے جو نفس و شیطان کی جنبشوں کو پہچانے۔

(۱۹) خطرات کی تمیز اور اصلاحِ قلب

فرمایا۔ بچے سے بڑے تک ہر ایک پر پیدائش سے موت تک ہر آن، حتیٰ کہ خواب میں بھی خطرات (خیالات) کا تسلسل بندھا رہتا ہے۔ خطرات بندے کے اختیاری نہیں۔ خطرات کا ہر آن قلب پر تقاطر

ہو رہا ہے۔ خطرہ (خیال) ٹپ کے ساتھ دل میں اُتر جاتا ہے۔ اور آدمی اس کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس کے خلاف کوئی اسباب، اہتمام اور علم و ارادہ کام نہیں دے سکتے۔ مثلاً اچھی خاصی دوستی ہے لیکن ایک خطرہ دل میں آگیا تو لاکھ غلط فہمی دُور کرنا چاہیں خطرہ ہٹتا نہیں۔ یہی حال محبت کا ہے۔ محبت دل میں آجائے تو پھر انسان سارے موانع کی پروا نہیں کرتا۔ خطرہ بڑا بے پناہ ہوتا ہے۔ بقول غالب

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

کوئی کوئی خطرہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ نیندیں حرام ہو کر خودکشی کی نوبت آتی ہے۔ اِس طرح اوّل خیال (خطرہ)، پھر قول، پھر عمل کا سلسلہ ہر انسان پر طاری رہتا ہے۔ یہ خیر ہوتا ہے یا شر، رحمانی یا شیطانی۔ عالم میں ہمارا ہر عمل و اثر محفوظ رہتا ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ الخ (۳۰/۲۴)

خطرہ (علم) کا تعلق قلب سے ہے۔ قلب کی اصلاح ہو جائے تو توابع (قول و فعل) خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے تمام انبیاء، اولیا نے اصلاح قلب پر زور دیا۔ حضرت غوث اعظمؒ کی تعلیم کا خاص امتیاز یہ ہے کہ نفس، شیطان کی جنبشوں اور شیطان کے ایجنٹ، جن و انس کے وساوس و خطرات کی پہچان سکھائے ہیں۔ اور اُن کے خلاف جہاد بتاتے ہیں۔ اور یہ تمیز سکھاتے ہیں کہ کون سے خطرات رحمانی ہیں اور کون سے شیطانی نفسانی۔ ربوبیت سے ربط خطرات ہی کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ رحمانی خطرہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ معزز مہمان کی طرح شان و شوکت سے قلب پر آکر قائم رہتا ہے، جس سے لذت و سرور حاصل ہوتے ہیں۔ اِس میں لطافت و رفعت ہوتی ہے گویا آسمانوں پر ہیں۔ یہ اسباب کا محتاج نہیں ہوتا۔ اسباب کو چاہیں تو فیضان رُک جاتا ہے لیکن شیطانی

خطرات میں پستی ہوتی ہے۔ اس میں اسباب کے چکر، دماغی فکر ہوتے ہیں چور کی طرح آتے ہیں۔ ان میں بے لطفی، کدورت، تذبذب رہتا ہے۔ سوائے اس کے کہ چوری سے دوستی ہو جائے۔ ایسی صورت میں بھی پولیس کے ذریعے پکڑے جانے کا خوف قلب پر طاری رہتا ہے۔

جس دل میں اللہ کا خوف ہو اس سے شیطان ڈر کر بھاگتا ہے اور جو شیطان کے دوست ہو جائیں تو وہ اُن کو پچھاڑتا ہے۔ جب رحمانی و نفسانی خطرات کی پہچان شروع ہوتی ہے تو جس طرح ٹیلیفون اُٹھاتے ہی آواز یا طرزِ گفتگو سے پہچان لیتے ہیں کہ فلاں صاحب ہیں۔ اسی طرح رحمانی و نفسانی خطرات کی فوراً پہچان ہو جاتی ہے۔ اِس کی پہچان کے لئے کوئی قاعدہ کلیہ مقرر نہیں۔ یہ ذوق کی چیز ہے دُنیوی معاملات میں بھی، ذوق کی چیزیں صحیح ذوق ہی سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اللہ مجاہد کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ رحمانی خطرہ کے بعد تاویل و استدلال کرنا شیطانی چکر ہے اِس سے بچیں ورنہ رحمانی فیض بند ہو جاتا ہے۔ غلطی ہو تو توبہ کریں اور اپنے عمل کو بُرا کہیں۔

امرِ جلی - امرِ خفی

امر کی دو قسمیں ہیں۔ امرِ جلی۔ امرِ خفی یعنی ظاہری احکام۔ باطنی احکام۔ مثلاً۔ فوج کا نظام، جس میں دو قسم کے احکام ہوتے ہیں۔ ایک موٹے موٹے احکام کہ صبح بگل کے ساتھ وردی پہن کر وقت پر میدان میں آجانا۔ حکم کی تعمیل کرنا۔ جس سے ڈسپلن رہتا ہے اور پچاس روپے کا سپاہی بنتا ہے۔ لیکن جب روزانہ کی تعمیلِ احکام کا ملکہ اُس میں راسخ ہو جاتا ہے تو اس کو اعلیٰ ٹریننگ دی جاتی ہے اور بڑے عہدے پر ترقی دی جاتی ہے۔ اور راز کے احکام (امرِ خفی) دیئے جاتے ہیں۔ جب چند روپوں کے لئے، چند روزہ زندگی میں، حکومت کے احکام کی تعمیل میں اپنے وجود، مرضی اور فعل کو حکومت کے احکام

کے تابع کر دیتے ہیں تو کیا اس اللہ کے احکامِ جلی نہ مانیں جو ہم کو عدم سے وجود میں لایا۔ اس لئے ہمیں اذان سُنتے ہی نماز کے لئے آنا چاہئے جو بمنزلہ بگل ہے۔ فرض نماز، روزے کے ساتھ حقوقُ العباد ادا کرنا چاہئے جس کے بعد امرِ خفی یعنی خطراتِ رحمانی کا علم ملنا شروع ہوتا ہے۔ امرِ جلی کی تعمیل کے بغیر امرِ خفی نہیں کھلتا اور نہ امتیاز نصیب ہوتا ہے۔

(۲۰) خطرات کا مُحاسبہ

ارشاد ہے۔ وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (۲ ۳)

ترجمہ (اور اگر ظاہر کرو جو کچھ تمہارے جی میں ہے یا اسے چھپاؤ۔ اللہ اس کا تم سے حساب لے گا) یعنی صرف خطرات (علم) پر حکم و محاسبہ نہیں لیکن ارادہ کے بعد محاسبہ ہے۔ چاہے اظہار ہو یا اخفا ہو خطرات کی دو قسم ہیں۔ رحمانی۔ شیطانی۔ رحمانی خطرات کی ابتدا طبیعت کے خلاف ہوتی ہے۔ لیکن انجام نہایت اچھا ہوتا ہے۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (۲۰ ۱۶)۔ شیطانی خطرات کی ابتدا بظاہر خوش آئند ہوتی ہے لیکن انجام خراب ہوتا ہے۔

خطرہ بندے کا اختیاری نہیں۔ پہلے خطرات آتے ہیں، اُس کے بعد ارادہ بنتا ہے۔ بعض وقت لاکھ ارادہ کرو خطرہ نہیں آتا۔ بعض وقت خطرات آتے ہیں، ارادہ نہیں بنتا۔ بعض وقت ایک بڑا خطرہ کسی قلب پر آتا ہے وہ لاکھوں آدمیوں کے خطرات کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے ایک آدمی لاکھوں پر غالب آجاتا ہے۔

اہلِ عالم کا مدار خطرات پر ہے۔ قلب پر سارے معاملے چل رہے ہیں۔ جسمانی ڈھانچوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ قرآن نے دو قسم کے آدمی بتا۔ بعض وقت نیکوں کی نیکی غالب آتی ہے تو بُرے بھی انعام پاتے ہیں۔ ان

پر فضل و رحمت ہوتی ہے۔ مثلاً توبہ، استغفار، درود پڑھنے والے اولیاء اللہ کے ذریعے۔ لیکن بعض وقت بُروں کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے تو بھلے بھی پس جاتے ہیں۔ گویا یہاں بھی خطرات کا غلبہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۹ ۱۷)

(۲۱) وساوِس و خطرات

وسوسہ شیطانی ہوتا ہے۔ اور خطرات رحمانی اور شیطانی دونوں ہو سکتے ہیں۔ وساوس انسان کے قلب پر آتے ہیں۔ لیکن ان کی مثال چور کی سی ہے کہ ڈرتے ڈرتے سہمے ہوئے آتے ہیں۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کو قیام و قرار و قوت نہیں۔ اس کے برخلاف خطرات مخالف ہوں یا موافق جم کر آتے ہیں۔ ان میں قیام و قرار ہوتا ہے۔ بعض وقت ایک خطرہ آتا ہے لیکن اپنا اثر و عمل دکھائے بغیر غائب ہو جاتا ہے۔ سوال ہوتا ہے کہ آخر اس خطرہ کا مقصد کیا تھا۔ وہ دراصل انسان کا امتحان تھا۔ اِسی سے تو عالم میں ہلچل ہے۔ ان وساوس و خطرات کا واحد علاج علمِ صحیح (ایمان) ہے۔ اس کے بعد وہ ایسے بھاگتے ہیں جیسے نور سے ظلمت۔ بحث، حجت، تکرار کا کوئی حاصل نہیں۔ بعض وقت قلب پر کفر، شرک یا شیاطین کا زور ہوتا ہے، بڑی ضیق رہتی ہے۔ ان سے مقابلے میں ہمارا قلب کبھی غالب ہوتا ہے کبھی مغلوب۔ خطرہ آتے ہی مسلح ہو جانا چاہئے۔ اس وقت قلب میں جو اعتبار آئے اس کے تحت مقابلہ کرنا چاہئے۔ سکنڈوں کی بات رہتی ہے۔ اتنی مہلت نہیں ملتی کہ نسبتوں دعاؤں کی طرف توجہ کر سکیں۔

بعض خطرے بے پناہ ہوتے ہیں جن کا علاج بظاہر ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں کشمکش، دعا، توجہ اور نسبت سے استفادہ کر کے انھیں نکالنا پڑتا ہے۔ اور اولیاء اللہ کی نسبتوں کا جال لگا رہتا ہے جو بعضوں کے خطرات کو قلب انسانی

میں داخل ہونے سے روک کر واپس کر دیتے ہیں۔ جیسے کوئی کسی چور کو کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے روک دیتا ہے۔ اس میں اس خطرے کو دوسرے کے بجائے اپنے پر وار کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے بعد علمِ صحیح سے اسے دفع کیا جاتا ہے۔ بعض وقت وہ آچکتا ہے اور کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کو نکالنا پڑتا ہے۔ لوگ نہیں جانتے کہ اولیاء اللہ کا اس عالم کے انتظامات میں کیا دخل ہے۔ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ مشین کے ہوتے ہوئے پہیئے ہی کام کر رہے ہیں، حالانکہ مشین کا چلانے والا سب سے بڑا اہم حصہ نظر نہیں آتا اور وہ اندر ہوتا ہے۔ لوگوں کے قلوب کے خطرات کا علم حاصل کرنا سُفلی اور عُلوی دونوں علوم کے ذریعہ ممکن ہے۔ سُفلی میں تو ارادت و سعی سے کام لیا جاتا ہے لیکن عُلوی میں اولیاء اللہ بے ارادہ رہتے ہیں ان کو دوسروں کے خطرات کا علم ہوتا ہے مشاہدہ ہوتا ہے۔ قلب کے معرکے خوب چلتے ہیں۔

(۲۲) وسوسہ کی قوت، شکلیں، علاج

امراضِ روحانی کی ابتدا شیطانی وسوسہ سے ہوتی ہے جو اللہ رسول کے علم کے خلاف آتا ہے۔ اللہ ہر ایک کو بچائے کیونکہ یہ اتنی خطرناک چیز ہے کہ اس سے نجات کے لئے ایک سورہ ناس اتاری گئی۔ وسوسہ کیا ہے۔ گویا ٹیوب میں باریک پنکچر ہے۔ یعنی سوئی کی نوک برابر خطرہ شروع ہو گیا۔ سمجھدار آدمی کو فوراً اسی پر ہوشیار ہونا چاہئے کہ پنکچر بڑھنے نہ پائے۔ اس کے بعد علمِ الٰہی کے خلاف ظن شروع ہوتا ہے۔ یعنی پائی برابر خطرہ ترقی کر کے چار آنے ظن کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد ظن ترقی کر کے ریب و شک میں بدل جاتا ہے۔ یعنی آٹھ آنے شک آٹھ آنے یقین۔ اس کے بعد شک ترقی کر کے وہم بن جاتا ہے۔ گویا شک کا غلبہ ہو گیا۔ چودہ آنے پنکچر ہو گیا۔ اس کے بعد وہم ترقی کر کے کفر و شرک و الحاد بن جاتا ہے۔ ایمان

ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن گھبرائیے نہیں۔ ہمارے پاس قرآن میں کفر و شرک کا بھی علاج ہے قوتِ دافعہ صرف ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں ایسی شکل آئے کہیے۔ یہ اللہ رسول کے حکم کے خلاف ہے جسے میں قبول نہیں کر سکتا۔ ساری الجھنوں اور وسوسوں کا حل ایمان کی قینچی ہے جس سے قطع و برید ہو کر ان کی جڑ کٹ جائے گی۔ ورنہ وسوسوں کی خاصیت ہے کہ ایک کو ہٹایا تو دوسرا آیا۔ خود رو جنگل کی سی کیفیت ہے۔

وسوسہ دیکھنے میں پہلے بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ قائم ہو جائے تو اسی باطل اعتبار پر عوالم کے عوالم کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کو غذا نفس سے ملتی ہے۔ نفس ہمیشہ باطل کا خیر مقدم کرتا ہے کہ باطل اس کے منشا کے مطابق ہوتا ہے۔ حق آئے تو نفس خندہ پیشانی سے نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عالم میں باطل کو بہت فروغ ہے۔ باطل کا خطرہ بہت قوت دکھاتا ہے۔ اولاً حق بظاہر دبا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انجامِ کار فتح و غلبہ اسی کو ہے۔ مثالیں ہیں۔ کہیں تو حق ایسا دبا کہ کہہ اٹھے۔ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا (۲۱/۱۲) اور کہیں لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ (۹/۸) ہوتا ہے۔ آیتوں میں تضاد نہیں۔ البتہ ہر محل کی گفتگو الگ ہے۔ تعمیم نہیں، تخصیص ہے۔ اگر تعمیم بھی ہو تو انجامِ کار حق کا غلبہ مراد ہے۔

(۲۳) مسئلۂ تقدیر

مسئلہ تقدیر کے متعلق ایک صاحب کے سوال پر فرمایا۔ منتہیوں کی چیز مبتدیوں کو کیسے بتائیں پی۔ ایچ۔ ڈی اور پوسٹ گریجویٹ کے مسائل میٹرک و مڈل والوں کو کیسے سمجھائیں۔ جن میں صلاحیت نہ ہو ان سے بیان کرنا وقت ضائع کرنا ہے۔

تقدیر کا مسئلہ توحید افعالی کا مسئلہ ہے۔ جس کے نہ سمجھنے سے جبری اور قدری
فرقے بنے۔ یہ چیز ایمان کے بعد صبر، تسلیم، رضا بہ عامل ہونے سے کھل جاتی ہے،
ایمان یہ ہو کہ اللہ ظالم نہیں، ہم ظالم ہیں۔ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ (۱۲/۱۹)
(یعنی ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا) تمام اشیا جوں کے توں
اللہ کے علم میں ہیں۔ لیکن اس عالم میں انسان کی جنبش کو بہت اہمیت ہے۔ مقصود ہل چل،
سعی، جنبش، انابت و دعا ہیں۔ ہر وقت بندہ اللہ کی طرف متوجہ رہے اور دعا کی
گھنٹی لگی رہے۔

اصل میں جب تک اقتضائے ذاتی کا مسئلہ سمجھ میں نہ آئے تقدیر کا
مسئلہ کھل نہیں سکتا۔ ہر چیز کی تخلیق اقتضائے ذات کے مطابق ہو رہی ہے اور
• اُس کا اپنے محل پر ہونا لازمی ضروری ہے، جس پر اعتراض خالق کی حکمت
پر اعتراض ہے۔ ایک کموڈ اور اگالدان اپنے محل پر اتنے ہی ضروری ہیں
جتنا دیوان خانے کا فرنیچر اور گلدان۔ بلکہ ڈرائنگ روم اور چمن کے بغیر کام چل
سکتا ہے لیکن بیت الخلاء اور اگالدان کے بغیر گھر میں بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔
ایک بڑے مرشد نے کہ بادشاہِ وقت تک ان کا مرید تھا، ایک کریہہ المنظر
لڑکے کو دیکھا اور اعتراض کیا۔ ایسے کو بھی کیا بنایا تھا۔ نتیجہ یہ کہ فوراً اس کے عشق
میں گرفتار کر دیئے گئے۔ وہ موچی کا لڑکا تھا۔ چھ مہینے تک مرشد صاحب ذلّت کے
ساتھ اس کی دوکان کے سامنے پڑے رہے۔ بالآخر توبہ کی توفیق ہوئی جو قبول ہوئی خالق
عالم کا ارشاد ہے۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا۔
مصنوع پر اعتراض صانع پر اعتراض ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔
ہر چیز اُدھر سے آتی ہے۔ پتّا بغیر حکم کے نہیں ہلتا
(۲۴) جبر و قدر | لیکن لوگ حکمت کو نہیں سمجھتے۔ جبر و قدر کے مسئلہ

میں گرفتار ہیں۔ ظاہر بین کی عقل تو اسے نہیں پا سکتی۔ وہ یا تو جبر میں جائے گا۔
یا قدر میں۔ کیونکہ علم کے غرور کا ڈاٹ شیشی میں لگا ہے۔ یہ چیز شرحِ صدر
کی ہے۔ اس کو عقل سے تعلق نہیں۔ عقل استعمال کرو تو نورانی لیمپ پر
دھواں آتا معلوم ہوتا ہے یہ بلند مقام والوں کی بات ہے۔ لیکن چھوٹے
درجے والوں کو عقل ہی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ان کے حدود و آثار الگ
ہیں۔ اکثر لوگ تقدیر کہتے ہیں اور تعطل کی طرف جاتے ہیں۔ کسب و اختیار
سے انکار کرتے ہیں جو کفرانِ نعمت ہے۔ اور تقدیر کے نام سے معطل اور احدی
بن جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے اقتضا میں ارادہ بھی ہے
اور بے ارادتی بھی۔ ارادہ کی وجہ سے ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ بلند مرتبہ
میں اقتضا و تقدیر پر نظر رکھنی پڑتی ہے اور وہی خیر ہے۔ لیکن نیچے کے
مرتبے میں ایک دوسرے کا امتیاز دیکھ کر خیر و شر کا حکم لگایا جاتا ہے۔ ورنہ
جنت، دوزخ، حلال، حرام عبث ہو جائیں گے۔ مثلاً کسی فلم کا ایک بہت اچھا
پلاٹ ہے۔ لیکن تفصیل میں جہاں گدھا ہے اسے گدھا، اور جہاں گھوڑا ہے
اُسے گھوڑا، اور جہاں بد کردار ہے اسے بد، اور جہاں نیک کردار ہے اُسے
نیک ماننا پڑے گا۔ یہ تمام تصاویر نور سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ اسی طرح حکمتِ
کلی میں ہر چیز اپنے محل پر درست ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نور وجود سے خلق
کر رہا ہے شئے عدم ہے میت ہے۔ لہذا حسنہ من فضل اللہ ہے اور سیئہ
ہمارا ذاتی ہے۔

یہ چیز شرحِ صدر سے کھلتی ہے۔ عبادات و ریاضیات سے بھی نہیں کھلتی۔
علمائے ظاہر کی سمجھ سے باہر ہے۔ مولوی صاحبان کا وجود بھی اپنے محل پر
ضروری ہے کہ ان کا کام پولیس کا ہے یعنی احتساب کا۔ انھیں اور تفصلات سے

مطلب نہیں۔ لیکن عارف کے پاس عدالت ہوتی ہے۔ وہ منشاء محل اور حکمت پر
نظر رکھ کر حکم لگاتا ہے اولیاء اللہ میں بعض پولیس اور عدالت دونوں کی جامعیت
رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اسی لئے عارفین ہر ایک کو اپنے محل پر کام کرتا دیکھ کر
معذور بھی رکھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اپنی اقتضا کے تحت عمل
کر رہا ہے۔ دلی کے قاضی القضاۃ شریعت پناہ مولوی ضیاء الدین صاحب
حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کو بدعتی کہا کرتے تھے اور آپ کچھ نہ فرماتے۔
وسیع القلبی کا عالم یہ کہ جب وہ بیمار ہوئے حضرت نظام الدین اُن کی عیادت کو گئے۔
قاضی القضاۃ کو اطلاع ہوئی تو اپنا عمامہ بچھانے کا حکم دیا۔ لیکن حضرت
نے عمامہ اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور فرمایا یہ شریعت پناہ کا عمامہ ہے۔ یہ تھا
شریعت کا احترام جو کاملین اولیاء اللہ کے دلوں میں تھا۔

(۲۵) معلوم

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۷/۳) ہم اپنے علم کا کیا دعویٰ
کریں۔ ہم تو معلوم ہیں، معلوم کو علم ہے ہی نہیں۔ اس لئے ہم کس طرح اللہ کو
جان سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو وہ اللہ نہ رہا
اللہ خود اپنا آپ عالم ہے۔ استرداد علم یہی ہے۔ ہمارا انتہائی عروج یہی ہے کہ ہم
معلومیت کے مقام پر رہیں۔ یعنی ہم صرف ایک معلوم ہیں جو وجود و علم سے عاری
ہے۔ البتہ ہمارا اقتضا ہے ہمارے اقتضاء کو علم الٰہی میں ثبوت حاصل ہے۔
اللہ تعالیٰ کی ذات و ھُوِیّت کو ہم کیسے پا سکتے ہیں جب خود ہم معلوم ہیں۔
علم بھی ہماری صفت نہیں۔ معلوم کا ثبوت صرف علم الٰہی میں ہے۔ اس طرح
ہم ثابت الذات ہیں۔ مسلوب الوجود ہیں عدم اضافی
ہیں۔ معلوم کے اوپر علم کی صفت ہے اور اس کے اوپر ھُوِیّت ہے ھُوَ اللّٰهُ الَّذِی

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ البتہ اس عروج (معلومیت) کے بعد ہوش آتا ہے تو نزول
ہوتا ہے۔ اور نزول کی حالت میں علم ارادہ فعل وغیرہ عطا ہوتا ہے۔ ارشاد ہے۔
اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (۲۹/۱۴) اب امتثالِ امر چاہیئے اور ساتھ ہی
اپنے مقامِ معلومیت کا استحضار چاہیئے یعنی معلوم ہیں اور بس۔ اس کے آگے کوئی علم نہیں
معلوم کی حیثیت میں صفتِ علم سے البتہ کچھ ربط ہے رسائی ہے۔ اس کے آگے صفتِ
حیات ہے۔ پھر اس کے بعد ذات یا ھُوِیّت ہے۔ علم ہی حقیقتِ محمدی ہے۔ اور وہی
علم قرآن ہے۔ اس لئے ہماری رسائی حضورِ انور تک ہے۔ وہی ذریعہ و توسط ہیں
وہ جو چاہیں، جتنا چاہیں، سمجھائیں اور دکھائیں۔
ہمارا اصل عروج و کمال اسی میں ہے کہ ہم اپنے کو معلوم دیکھیں۔ چاہے
عروج کی حالت میں ہوں یا نزول کی حالت میں۔ چاہے خاموش رہیں یا مرجائیں
یا ہم سے بڑے سے بڑے افعال قدرت علم وغیرہ ظاہر ہوں۔ مطلب یہ کہ اپنے تصور
سے یافت و شہود کو قائم نہ کریں۔ اور اپنے علم و ارادہ سے اقوال و افعال
صادر نہ ہوں۔ جیسا کہ بعض اشراقی یا جاہل لوگ تصورات قائم کر کے اللہ رسول
کی ذات کو احاطہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بالکل غلط اعتبار ہے۔ شہود نہیں۔ شہود کا
دھوکا ہے۔ البتہ ارادت والے ارادی دونوں حالتوں میں یعنی ہر محل دعروج و
نزول پر اپنے کو معلوم دیکھنا چاہیئے۔ ایسا معلوم جسے ذاتی علم و ارادہ وغیرہ
نصیب نہیں۔ اس اعتبار میں اور یافت و شہود کے تصور والے اعتبار میں زمین
آسمان کا فرق ہے۔ اس میں ضیق تکلف بار نہیں۔ اُس میں بار ہے۔ ورنہ اکثر جاہل
ذہنی تعطل، نیند اور غفلت ہی کو یافت و شہود، جذب و استغراق کہتے ہیں۔
خلاصہ یہ کہ بقول حضرت مولانا محمد حسین صاحب قبلہ معلوم کا رخ بعلیم عالم عالِم
کی جانب رہے تو تکمیلِ دین ہے۔ اور اگر معلوم نے بعلیم عالم عالِم کو پا لیا اور

اُس میں محو ہو گیا تو "تکمیلِ نعمت ہے۔"

(۲۶) اعیانِ ثابتہ

ذات اُسے کہتے ہیں جس کی طرف اسماء و صفات راجع ہوں۔ اشیا کے ذوات اور لوازم کو اعیان کہتے ہیں۔ جسے اللہ بخوبی جانتا ہے۔ مثلاً فرعون کی شخصیت مع لوازم عینِ ثابتہ کہلائے گی۔ ثابتہ سے مطلب یہ ہے کہ ہر شی اللہ کے علم میں ثابت ہے وجود سے محروم ہے۔ اللہ کے سوا کسی کا وجود نہیں۔ اب جب اس عالم میں ان اعیان کا ظہور ہوا تو وہ اللہ کے وجود (قیومیت) سے ہوا۔ بندے کا تعین اللہ کے علم میں ہے۔ بندے کی حقیقت معلوم ہے۔ بندے کو چاہیے کہ اپنے کو معلوم دیکھے اور فنا کے مقام پر رہے۔ عبدیت عدم و جہل کا نام ہے۔ ربّنا کہا تو استغراق حاصل ہوا۔ اور بقا حاصل ہوئی۔ عبدیت و ربوبیت کا ہر آن صحیح ربط قائم رہے کہ ربّ اپنے مربوب کی ساری مُقتضیات کی تکمیل کرتا ہے۔ عینیت میں اجمال ہے اور غیریت میں تفصیل۔ غیریت محبوبِ خداوندی ہے۔ دراصل کوئی شخص (معلوم) اپنے طور پر کچھ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کسی خاص اسم یا چند اسماء کا مظہر بنتا ہے تو اضطراراً اس سے اُن افعال کا سرزد ہونا لازمی ہے۔ اس حکمت کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔

ہر چیز اپنی انیت (میں پن) کا مظاہرہ چاہتی ہے۔ پاندان کہتا ہے۔ میں پاندان ہوں۔ اگالدان کہتا ہے۔ میں اگالدان ہوں۔ اگر آپ اس کی انیت نکال دیں پھر وہ شئے وہ شئے نہ رہے گی۔ ہر ایک کا اقتضائے ذاتی مختلف ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص دوسرے کے اقتضا کا تابع ہو۔ بلکہ ہر شخص کو سمجھ کر اپنا اقتضا پورا کرنا چاہیے۔

المختصر یہ اختیار و کسب اس کے عینِ ثابتہ کے تابع ہے کہ اعیانِ ثابتہ جو

غیر مجعول ہیں ان کے مقتضیات کے مطابق خلقِ الٰہی واقع ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل کسی عارفِ کامل سے معلوم کریں۔

(۲۷) اقتضاءات کی رعایت

بڑا مزہ اس میں ہے کہ ہر ایک کا اقتضا دیکھیں اور اسمائے الٰہی کے مظاہر دیکھیں اور لطف اٹھائیں۔ ہر شی کا اقتضا پورا ہو رہا ہے۔ برتن میں جو ہے وہی چھلکتا ہے۔ تیل ہو تو تیل عطر ہو تو عطر۔ اس پر ایک صاحب نے کہا۔ پھر تو کسی کو گلہ شکوہ ہوتا ہی نہ چاہیے۔ فرمایا۔ گلہ بھی تو اقتضا میں داخل ہے۔ فرق یہ ہے کہ کوئی گلہ میں اقتضا کو دیکھ کر قلب کو بچا کر عقل و حکمت کا مقتضا پورا کر دیتا ہے۔ گویا بات حلق کے اوپر ختم ہو جاتی ہے۔ بعض گلہ میں نفسانیت برت کر قلب کو غارت کر لیتے ہیں۔ گویا پیٹ بھر گلہ کرتے ہیں۔ گلہ کو غذا بنا لیتے ہیں۔ حضرت غوثِ اعظمؓ کے صدقے میں غلاموں کو ایک اندازہ اور ذوق نصیب ہوتا ہے کہ کسی کام میں کتنا ٹھیریں یا کتنی جلدی کریں۔ ہر محل کا اقتضا دیکھ کر اُسی کے لحاظ سے عمل کرنا مناسب ہے۔ البتہ ہر کام میں اس بات کی تمیز ضروری ہے کہ نفس کا منشا ہے یا اللہ کا۔

مسائل کے استنباط میں ائمہؒ کے اقتضا و طبیعت کو بھی دخل ہے جو باطل نہیں ہو سکتا اور نہ نکل سکتا ہے۔ مثلاً ایک امام کی رائے ہے۔ آدمی عمداً ترکِ نماز پر کافر ہو جاتا ہے۔ دوسرا اس کے خلاف ہے۔

(۲۸) فطرت، اقتضا کی قوت

آج کل کے بعض مرشدین دن رات نامحرم عورتوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو کہتے ہیں۔ اگر میرے نفس پر اعتبار نہیں تو مرید ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن کتنے بڑے نبی حضرت یوسفؑ عورتوں کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي۔ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ
رَبِّي (۵۳/۱۲) (میں اپنے نفس کو پاک نہیں ٹھیراتا کیونکہ نفس برائی کا حکم دیتا ہے
الّا یہ کہ اللہ رحم کرے) جو فطرتِ انسانی کو سمجھتا ہے وہی اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّی
کہہ سکتا ہے یاد رکھو عبدیت ہی میں امن و سلامتی ہے اور دعوی میں شر و فساد
بعض وقت تعجب ہوتا ہے کہ فلاں نے ایسا کام علم و مرتبہ کے باوجود کیسے
کیا۔ اس کے متعلق قرآن کا فیصلہ موجود ہے گو علم و مرتبہ زندگی میں اہم ہیں لیکن
فطرت اور اقتضا سب پر غالب آتے ہیں۔ فطرت، علم، تربیت تینوں کا خیال
رکھنا پڑتا ہے انبیا تو فطرت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی فعل نفسانیت کے تحت
نہیں ہوتا۔ البتہ ان کی فطرت اللہ کے منشا کو پورا کرتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کا اقتضا
فطرت یہ تھا کہ اللہ بیزار کیا اور فرمایا۔ یہ سب آپ کا فتنہ ہے کافروں کو مال نہ دیجئے
تباہ کیجئے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر غصہ سے کتاب (الواح) پھینک دی۔

(۲۹) حکمت کی بات

اسلام دینِ فطرت ہے۔ قرآن عملی کتاب ہے
رسول اللہ کی تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ اقتضا
کو دبایا نہیں جاتا۔ بلکہ ہر ایک کے اقتضاءات کو خیر و حق کے حدود میں اظہار کا موقع
دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضورِ انورؐ اور حضرت عمرؓ کے درمیان چند موقعوں پر اختلاف
رائے ہوا۔ ہر پھول پھل اپنا رنگ بو مزہ دکھائے گا۔ ہر پھول کو گلاب اور ہر پھل کو آم
نہ بنا دیا جائے اسی لئے حضرت صدیقؓ کی نرمی رحم و حلم اور حضرت عمرؓ کی سختی و
شدت کو عبادت و عبدیت بنا دیا گیا۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرَاتِ (۱۴۸/۲) (ہر کسی کے واسطے ایک طرف ہے جس کی طرف وہ منہ پھیرتا ہے پس نیکیوں میں
سبقت کرو) ہر ایک کو اپنا اقتضا نیک نیتی سے پورا کرنا چاہئے۔ کیونکہ مرضیِ الٰہی
میں ہمارا اقتضا دوسروں کے اقتضا سے معارض ہو سکتا ہے۔ اسی لئے کسی ولی کے اقتضا

کی ریس مناسب نہیں۔ دینی اور علمی نقطۂ نظر سے معلوم کے مقام پر ہر ایک کو اپنا
اقتضا پورا کرنے کا موقع دینا چاہئے۔ اس کی میعاد اور طریق کی پہچان فراست
پر موقوف ہے۔ کوئی کلیہ نہیں۔

(۳۰) انسانی فطرت کی پستی و بلندی

صحیح علم و نظر اللہ کا خاص فضل ہے
جو عطا ہو جائے۔ ایک شخص زنا کو برا نہیں
سمجھتا بلکہ مفید اور صحت بخش بتاتا ہے۔ اور دوسرا اس کے مرتکب کو سنگسار
کرنے کے قابل سمجھتا ہے۔ انسانی فطرت کی پستی و بلندی دونوں کی انتہا نہیں
فطرت میں بے انتہا لچک ہے۔ اَسْفَلَ سَافِلِينَ (نیچے سب نیچوں کا) اور اَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۴/۳۰)
(بہت خوبصورت سانچہ) دونوں طرف صد درجے کے امکانات ہیں۔ بعض سفلی عمل کرنے والے جسم پر ہمیشہ
غلاظت لگائے رہتے ہیں مد کیوں کے سنڈاس کی طرح غلیظ رہتے ہیں۔ انھیں اسی میں لذت و سرور ہے۔

(۳۱) مقدرات

ایک معاملہ میں سارے اسباب موافق تھے لیکن اثر
الٹا ہوا۔ فرمایا۔ یہاں آکر ماننا پڑتا ہے مقدرات کو
اپنی بے بسی اور کسی کے قبضہ و قدرت، منشا و حکمت کو بعض وقت آسان سے
آسان کام مشکل بنا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض وقت مشکل سے مشکل کام آسان
کر دیا جاتا ہے۔ انسان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ لیکن وہ پھر بھی سعی پر مامور ہے یہ عالم عالمِ سعی ہے
جس میں اسماء کی تجلیاں ظاہر ہوتی ہیں اور حول و قوت تو من اللہ آتی ہے۔
ایک مسلمان صاحب نے ایک بڑے عہدے کے لئے دعائیں مانگیں نمازیں
پڑھیں درگاہوں پر حاضریاں دیں۔ لیکن ایک دوسرے صاحب کا تقرر ہوا، تو
وہ اللہ میاں سے بہت برہم ہوئے میں نے کہا۔ دعائیں ضائع نہیں جاتیں،
کوئی حکمت ہوگی، اگر اسے نہ مانو تو عہدے کے ساتھ ایمان بھی چلا جائے گا۔ ایک
مہینہ کے بعد ایک فساد ہوا۔ اُس افسر کو بھیجا گیا جسے ترقی ملی تھی اور وہ جاتے ہی

ہی مارا گیا۔ اس اطلاع پر ان صاحب نے نمازِ شکرانہ پڑھی اور نیازیں دلائیں۔

(۳۲) ارادہ۔ بے ارادتی

فرمایا۔ فرشتے اور دیگر مخلوق صرف ایک ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے خلاف نہیں کر سکتے۔

انسان دو ارادے لایا ہے۔ اس میں ایک ارادۃ اللہ ہے اور ایک اپنا ارادہ۔ یعنی چاہے تو خطرہ کی تعمیل کرے یا خلاف کرے۔ اس تعمیل کرنے یا خلاف کرنے میں اگر امرِ الٰہی کی موافقت ہو تو اس نے اپنے کو ارادۃ اللہ کے تابع کر دیا اور بے ارادہ ہو گیا۔ ایسی صورت میں عروج ہی عروج ہے۔ لیکن اگر اپنے ارادہ پر قائم رہا اور امرِ الٰہی کے خلاف کیا تو نزول ہی نزول ہے۔ بے ارادتی کا نکتہ اللہ کا خاص فضل ہے جو حضرت غوثِ اعظمؒ کے صدقے میں سمجھ میں آتا ہے۔ بظاہر بے ارادتی اور تعطل میں فرق کرنا مشکل ہے۔ الفاظ سے دھوکا نہ کھائیں۔ ارادے سے بے ارادہ نہ بنیں۔ عبدیت کا علم آتا ہے تو خود بے ارادہ ہو جاتا ہے۔ یہ علم وظائف و ریاضات سے نہیں ملتا بلکہ فضل و اجتبیٰ سے ملتا ہے۔ کھلتا ہے۔

اولیاء اللہ کی زندگی میں بھی ارادہ اور بے ارادتی کے مختلف واقعات پیش آتے رہتے ہیں جس سے لوگوں کو دھوکے ہوتے ہیں۔ کسی ولی اللہ کو خاص حالات میں تھوڑی دیر کے لئے بے ارادتی طاری رہی اور اس کے آثار نمایاں ہوئے لیکن بعد میں ارادے والے واقعات ہوئے تو لوگ تمیز نہ کر سکے۔ بعض پر کئی دنوں بے ارادتی کا عالم رہا۔ بعض کی ساری زندگی بے ارادتی میں گزری۔ جس طرح بہت سے لوگ ساری عمر ارادہ میں گزار دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ ممکن بلکہ واقعہ ہے کہ بعض اولیاء، غوث، اقطاب نے کل عمر بے ارادتی میں گزار دی۔ اصل میں علم صحیح چاہئے کہ ارادہ

اپنا ہے ہی نہیں۔ بلکہ ہم میت، جاہل، مضطر، عاجز ہیں اسی کا قیام، تمکن و عمل مطلوب ہے۔ بعضوں پر بے ارادتی فطری، پیدائشی طور پر طاری رہتی ہے۔ تعطل و توکل میں فرق سمجھنا ضروری ہے۔

(۳۳) ارادہ کی تین قسمیں

ایک حیوانی ارادہ ہے ایک انسانی ارادہ ہے اور ایک ماموریت ہے یعنی ارادۃ اللہ۔ ایک اپنی حرکت ہوتی ہے۔ ایک مردہ کو حرکت دی جاتی ہے۔ اور ایک یہ کہ بحول اللہ و امر اللہ مردہ حرکت کرتا ہے۔ ان تینوں میں بڑا فرق ہے۔ حیوان سے باز پرس نہیں۔ عامی مسلمان امرِ جلی کی تعمیل کرنے والے مزے میں ہیں کیونکہ امرِ جلی صاف ہیں۔ لیکن خواص یعنی امرِ خفی والوں کو مرضی پہچان کر عمل کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ جواب طلب ہوتا ہے۔ ماموریت والے سے کبھی ٹکر نہ لیں۔ حضرت موسیٰ تک نے حضرت خضر کے سامنے سکوت کیا۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ کو شروع میں حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بعض مسائل میں اختلاف تھا۔ حضور انورؐ نے خواب میں فرمایا۔ شیخ احمد (مجددؒ) ماموریت کے مقام پر ہے اُن کی مخالفت نہ کرو۔ صبح شاہ صاحب نے اپنے صاحبزادے کو حضرت کی خدمت میں مریدی کے لئے پیش کر کے بیعت میں داخل کرا دیا۔

(۳۴) بے ارادتی اور عزت

بعض مشائخ اپنے عمل کی تاویل کر کے اپنی عزت و شان کی حفاظت کرتے ہیں۔ جو شرک فی الربوبیت ہے۔ عزت اپنی چیز نہیں۔ آپ اس کی حفاظت کرنے والے کون۔ جب اللہ نے عزت دی ہے اور یہ اُسی کی ملک ہے تو وہی حفاظت بھی فرمائیگا اگر ہم اسکی حفاظت کیلئے نفسانی لوازم اختیار کریں تو انانیت آ جائے گی۔ پس عزت کو اپنی چیز جان کر اس کی حفاظت اپنی ارادت سے کرنا نامناسب ہے۔ البتہ یہ چیز تحتانی مرتبے والوں کیلئے مناسب ہے۔

اکابر اولیاء اللہ بالکل بے ارادتی کے مقام پر رہتے ہیں۔ لیکن ان کی توجہ الی الخلق دیکھ کر دھوکا ہوتا ہے۔ وہ تحت امر مخلوق کی کاربراری میں لگے رہتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں۔ یہ بھی دنیادار ہیں۔ ان میں ہم میں کیا فرق ہے۔ حالانکہ زمین آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً حضرت نظام الدینؒ اور حضرت پیران کلیرؒ دونوں بے ارادتی کے مقام پر ہیں۔ ایک مخلوق میں لگے ہوئے اور ایک خالق میں ایسے کہ لوگ سلام کو ترس جائیں۔

(۳۵) بے ارادتی اور اقتضا

سوال: کیا بے ارادتی کے مقام والے عقل و غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور اپنے معاملات محض فضل پر چھوڑ دیتے ہیں۔ فرمایا۔ ایسا کہنا نادانی ہے۔ جو ایسا کہے اس نے بے ارادتی کو سمجھا ہی نہیں۔ آخر ہر انسان کا اقتضا کہاں جائے گا۔ کوئی غور و فکر کا اقتضا لایا۔ کوئی عقل کا لایا۔ کوئی غور و فکر و عقل سے عاری ہونے کا اقتضا لایا۔ دراصل ان اقتضاءات مختلفہ کا ظہور یا تو ارادت سے ہوگا یا بے ارادتی سے ہوگا۔ البتہ فرق صرف نفسانیت و للہیت کا رہے گا۔ اور بے ارادتی میں بھی اپنی اپنی طبیعتوں، اقتضاؤں کے لحاظ سے فرق رہے گا۔ بڑی غلط فہمی بلکہ جہل ہے کہ لوگ طبائع اور اقتضاءات کا فرق نہ سمجھ کر اولیاء اللہ کے طبائع کی تقلید کرنا چاہتے ہیں جو ناممکن ہے۔ ہر ایک کا اقتضا مختلف ہوتا ہے۔ البتہ ہر محل پر صرف بے ارادتی حاصل ہونی چاہئے۔ ایک شخص بے ارادہ ہوتا ہے لیکن بے ارادتی میں خوب لڑنے کا اقتضا لایا ہے۔ دوسرا بے ارادہ ہے مگر صبر و خاموشی کا اقتضا لایا ہے۔ ایک میں سختی گرمی ہے۔ ایک میں نرمی۔ اس کے بھی بے شمار مدارج ہیں۔

(۳۶) تحت امر زندگی

زندگی تحت امر بسر ہو تو بے ارادتی کی اعلیٰ زندگی کا لطف ہے۔ ہر شخص کا کام دراصل امر اللہ ہی کے تحت ہو رہا ہے لیکن بندہ غافل ہے۔ ہر ایک کو مجمل ایمان ہے کہ خلقِ فعل ہو رہا ہے

لیکن کسی پر علم و ارادت حول و قوت کی تفصیل کھلنے لگتی ہے اور کسی پر نہیں کھلتی۔ سعی کوشش محمود ہیں بلکہ مقصود ہیں لیکن ہر ایک کا ایک محل ہے۔ اپنی ارادت کے تحت سعی نیچے کے مرتبہ کی چیز ہے۔ لیکن اونچے مرتبے والوں کو اپنی ارادت چھوڑنی پڑتی ہے۔ ان کی سعی اور ترک سعی دونوں تحت امر ہوتے ہیں۔ جس طرح ہمارے اعضا جوارح اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتے جب تک ہماری روح ارادہ اور رغبت کا اظہار نہ کرے۔ اسی طرح ہمارا کل تعین (جسم دل روح) اللہ کے ارادے اور قدرت کے تابع ہیں، اسی علم میں رہیں۔

حضرت غوث اعظمؒ کی زندگی قرب فرائض کی ہے۔ فرماتے ہیں سپاہی بن جا۔ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (۱۴/۱۲) (جو حکم ہو اس کی تعمیل کرتے ہیں) میں آ جا۔ فَاسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ (۱۲/۱) پر جم جا۔ فرض کے تحت جو عمل ہوتا ہے اس کی اہمیت و عظمت اپنے ارادے کے عمل سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مثلاً جب ایک سپاہی وردی پہن کر لڑتا ہے فیر کرتا ہے جان لیتا ہے تو انعام ملتا ہے۔ اگر کوئی اس سے ٹکر لے تو حکومت کی پوری قوتیں اس کی مدد کو آتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس کا فعل بظاہر اس کے ہاتھ پیر سے سرزد ہو رہا ہے لیکن وہ حکومت کے منشاء و حکم کے تحت ہے۔ اس لئے اس سے ٹکر حکومت سے ٹکر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اگر وردی اتار کر کسی گھر میں گھسے تو عورتیں تک پیٹ دیں گی، اسے پولیس گرفتار کرلے گی اور اس کا کوئی حامی نہ ہوگا۔ صورتاً فعل ایک ہی ہے لیکن احکام و آثار مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک ڈاکٹر دواخانے میں مریضوں کے سر پیٹ چیرتا پھاڑتا ہے تو انعام ملتا ہے۔ لیکن اگر وہی باہر کسی کے سو[ئی] چبھو دے تو گت بنتی ہے کیونکہ محل بدلا، منشا بدلا۔ اسی طرح جب ہم اللہ کے حکم (امر جلی۔ امر خفی) کے تحت کام کرتے ہیں تو ہمارا علم، قول و فعل الٰہی ہو جاتا ہے۔

اور اللہ کی حمایت و نصرت و معیت حاصل ہو جاتی ہے اور کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ اگر اس کے حکم کے خلاف کریں تو سارے عالم کی تائید بے فائدہ ہے۔

اس کا راز یہ ہے کہ تحتِ امر کام کرنے والے کی ذاتی مرضی نہیں۔ بلکہ وہ حق کی مرضی کے تحت ہے۔ رسول اپنی مرضی نہیں رکھتے۔ اس لئے اللہ نے رسول اللہ سے فرمایا۔ جس نے تم سے بیعت کی مجھ سے کی۔ تمہاری اطاعت میری اطاعت۔ تمہارا فعل میرا فعل۔ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ۔ جب قلب کی کامل اصلاح ہو جاتی ہے تو اپنی مرضی علم و ارادہ نہیں رہتے۔ اور امر خفی کا امتیاز ہو کر ہر فعل تحت امر ہو جاتا ہے۔ کافر و مومن کے فعل میں بظاہر فرق نہیں لیکن یہ باطن بے انتہا فرق ہے۔ لہٰذا قلب کی گھڑی (یعنی خطرات) کو قرآن کے ستارہ سے ملا کر رکھیں۔

(۲۷) توکّل کی حقیقت فرمایا۔ جملہ عالم اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اسباب و وسائل سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن یہ سب اپنی ذات سے موثر نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ اللہ موثر ہے نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہے اس لئے توکل یہ ہے کہ اللہ کی وکالت و کارسازی پر نظر رہے۔ اسباب پر نظر نہ رہے۔ حکمت کے تحت اسباب سے کام لیں لیکن مسبب پر نظر رکھیں۔ الحاصل اسباب و تدابیر بھی بے شک تحت حکمت اپنے محل پر بڑی چیز ہیں۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان میں عمداً کوتاہی کرنا درست نہیں ہو سکتا بلکہ حتی الوسع ان کا حق پورا کرنا واجب ہے۔ البتہ اسباب و تدابیر اپنے احکام و آثار میں قطعی نہیں اور نہ ان کو مطلقیت حاصل ہے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تابع ہیں۔ پس جہاں ان سے اعراض کرنا درست نہیں وہاں ان سے مرعوب ہونا بھی نادانی اور

حرمانی ہے۔ صحیح مسلک وہی ہے کہ دل بہ یار دست بہ کار۔ چنانچہ مومنین و متقین اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت دونوں سے ربط رکھتے ہیں۔ کیونکہ عالم اسباب میں کثرت و قوت اسباب و وسائل سب کچھ جمع ہوں تو بھی وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بالا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے مومنین ادباً حکمت کے تقاضوں کے تحت اسباب تو اختیار کرتے ہیں۔ لیکن قدرت کے فیضان کے امیدوار رہتے ہیں۔ بہر صورت ان کی امید و ہمت کا مرجع اللہ تعالیٰ رہتا ہے۔

بعض سالکین توکّل کا علم صاف نہ ہونے کی وجہ سے اسباب اختیار کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور اسباب اختیار کرنے کو توکل کے منافی سمجھتے ہیں۔ تعطّل میں رہتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو اسباب کا پابند سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو اسباب کو موثر سمجھ کر اسباب سے مرعوب رہتے ہیں۔ اسباب کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن حکمت کی آڑ لے کر اسے توکل سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ توکل کے بعد اللہ کافی ہے۔ ارشاد ہے وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔ بلکہ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ (پ۲۸) اللہ امر سے کام لے کر اسباب سے قطع نظر قدرت سے تکمیل کرنے والا ہے۔ اس کے معنی تساہل و تغافل نہیں کہ قصداً ترکِ اسباب کریں۔ البتہ بقدر ضرورت اسباب اختیار کریں اسباب کے تابع نہ رہیں۔ دل و دماغ پر اللہ مسلط رہے نہ کہ اسباب۔

ایک معاملے کے متعلق ناچیز نے عرض کیا۔ قلب میں تقاضا ہے۔ اپنی ارادت کو دخل نہ دے۔ اسباب چھوڑ دو۔ فرمایا۔ بالکل درست ہے۔ لیکن یاد رکھو اس میں بال برابر فرق بھی ہے جو دوسروں کی سمجھ سے باہر ہے۔ ایک طرف نفس کے تحت سہل انگاری سے اسباب اختیار نہ کرنا بد ترین گناہ ہے۔ دوسری طرف اللہ کے منشا کے تحت تفویض و توکل میں اسباب کا

ترک لازمی ہے۔ اس میں اور اُس میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ دوسرے کے لئے اس میں فرق نہیں بلکہ تعجب کی بات ہے۔

۳۸، توکّل اور تعطّل کا فرق

لوگ توکل کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں کہتے ہیں اللہ سب دے گا۔ قرآن میں بڑی تمیز بتائی گئی ہے۔ اسماء کا حق ادا کرنا ضروری ہے ورنہ اسماء باطل ہو جائیں گے۔ اگر مومن بے ارادتی کی حالت میں ہے اور امر کے تحت توکل کر کے ایسا کہتا ہے تو اس میں حفاظت ہوتی ہے اور آثار و اسباب غیب سے پیدا ہوتے ہیں لیکن اگر وہ اپنے ذاتی ارادہ اور نفس کی تجویز کی وجہ سے ایسا کہتا ہے تو اس میں توکل کا خاص فیضان نہیں آسکتا گویا وہ اپنے کو تکاسل کی وجہ سے معذور و معطل بنا لیتا ہے۔ اور اس تعطل، کاہلی، معذوری کا نام بے ارادتی رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بعض لوگ اس طرح توکل کر کے ذاتی ارادہ سے بیٹھ جاتے ہیں اور اُن کو مختلف فتوحات حاصل ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ توکل کا فیضان نہیں۔ اور نہ وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ دیگر اسماء و رحمانیت وغیرہ، کام کرتے ہیں۔ چنانچہ غیر مومن بھی بیٹھ جاتا ہے تو رزق ملتا ہے۔ لہٰذا سلوک میں بے ارادتی کا مقام ہونا چاہیئے۔

۳۹، توکل اور پیشہ

عام طور پر توکل کی غلط توجیہیں کی جاتی ہیں اگر ترکِ اسباب ہی کا نام توکل ہے اور اس کے فیوض و برکات مال و دولت، فرش و فرنیچر، سواری موٹر اور طبیعت کا سکون ہیں۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے دولت مند اہلِ علم ترکِ اسباب کر کے بعض آشرموں میں آ پڑے ہیں۔ اُن کے پاس لاکھوں کی دولت بھی ہے لیکن سب مال و

دولت چھوڑ کر دنیا کو ٹھوکر ماری ہے اور اسی میں سکون و شانتی محسوس کرتے ہیں۔ اگر ان کو ایمانی اعتبارات کے بغیر سکون مل رہا ہے تو آخر یہ فیض کہاں سے آ رہا ہے۔ اُن کی حالت تو ترکِ اسباب کے بعد بلحاظ مال و دولت آپ سے بدرجہا بہتر ہے۔ پھر آپ کو کیا امتیاز حاصل ہے۔ آپ جواب دیں گے۔ ہم نے ایمان کے ساتھ توکل کو اختیار کیا ہے۔ اگر توکل ایمان کے ساتھ ہے تو آپ کی نظر حق پر ہے یا مریدین اور اسباب پر۔ آپ کی زندگی کا مقصد تمتع ہے یا مفادِ ملت۔

حضورؐ کی زندگی دیکھئے۔ آپ نے گلہ بانی کی، تجارت اختیار فرمائی۔ دیگر انبیاء نے بھی پیشے کئے۔ اس لئے دین سے بدگمانیوں کے موجودہ دور میں، حکمت کے تحت دین کے وقار کے لئے، مرشدین کو پیشہ یا ملازمت اختیار کرنا مناسب ہے۔ چاہے ان کو ایمانی اصلی توکل ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ دراصل توکل علم کی تصحیح کا نام ہے۔ چاہے ملازمت ہو یا ترکِ ملازمت و اسباب۔ ایسے متوکلین سے دین پر زد پڑتی ہے اور لوگ دین سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ توکل کے فیوض کو ذاتی تمتع، عمدہ لباس، غذا، سیر سفر، فرش فرنیچر اور بیویوں کے زیورات میں صرف کرتے ہیں۔ ان کو حضورؐ کی زندگی میں ملت کے لئے خرچ کر کے فاقے رہنے کا نمونہ نہیں ملتا۔

۴۰، توکّل کے آثار

جب بغداد شریف میں ہماری چھ ہزار کی ہمیونی گم ہوئی تو میں سید صاحب حضرت کے آستانے پر حاضر ہوا اور عرض کیا۔ ہمارا ایمانی نقص تھا کہ اتنی بھی رقم لی۔ صرف آپ کا نام ہی لے کر نکلتے تو اس سے بہتر سامان ہو سکتے۔ ہم آپ کے غلام ہیں۔ اگر آپ کی مرضی یہ ہے کہ غلام ناکام ہوں اور حج نہ ہو تو مرضیِ مولیٰ از ہمہ اَولیٰ۔ پھر دی دیر

میں گم شدہ رقم مل گئی۔

اصل میں توکل اسباب سے بالا ہے۔ تعقّل میں خشکی ہے اس کی کھڑکی الگ ہے اور توکل کی کھڑکی الگ ہے۔ اگر مگر کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہر محل کا اقتضا الگ ہے۔ یہ توفیق کی چیز ہے۔ قلب میں علمِ صحیح اور ربوبیت جم جائے تو خوف و حزن نہیں آتا۔ لیکن نتائج کا منتظر نہ رہے جو ہو اس پر راضی و صابر رہے۔ کتنے پڑھے لکھے بحثیں خوب کرتے ہیں لیکن انھیں توحید و توکل کی ہوا نہیں لگتی۔ اور کتنے بے پڑھے لوگ علمِ صحیح پر استقامت رکھتے ہیں۔ توکل کے بعد اپنی ارادت کو دخل نہ دیں۔

(۴۱) طلب۔ ترک۔ ترکِ ترک

حکمت میں اسماء کے روابط کا ظہور ہوتا ہے۔ سعی اس کے آداب میں داخل ہے۔ مومن کو کثرتِ کار اور دشواریوں سے نہیں گھبرانا چاہیئے۔ دشواریوں پر غالب ہونے کی کوشش ہی اصل مجاہدہ ہے اور اس پر جمنا ہی اصل استقامت ہے۔ سورہ مزمّل میں کثرتِ کار اور دشواریوں پر غلبہ حاصل کرنے کی مردانہ کوشش کا ذکر ہے۔ کسبِ معاش کے لئے حکم خداوندی ہے۔ انسان حاجت مند پیدا ہوا ہے لیکن انسان کا عام رجحان یہ ہے کہ بغیر محنت کے معاش حاصل ہو جائے تو لطف ہے۔ یہ کم ہمتی ہے اسلام نے اس کی مذمت کی اور اس کا نام رہبانیت رکھا جس کی اجازت نہیں۔ پست ہمتی سے کسبِ معاش کو چھوڑ کر اس کا نام توکل رکھتے ہیں۔ ایسا عمل نفس کے تحت ہوتا ہے۔ اس لئے حق کی تائید نہیں ہوتی۔

ترک و طلب کے اسرار کا علم حضرت غوث اعظمؒ کی نسبت کا خاص فیضان ہے۔ حضرت کی تعلیم کے لحاظ سے ترک و طلب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تحتِ نفس

ایک تحتِ امر۔ اس کا علم عبدیت و خلافت کی جان ہے۔ اگر کوئی تحتِ امر طلب و ترک کر رہا ہے تو محمود ہے۔ ورنہ تحتِ نفس مذموم ہے۔ تحتِ امر بھی ترک کرنے کے معنی علمِ غلط کا ترک اور علمِ صحیح کا حصول ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں:-

چیست دنیا از خدا غافل بُدن — نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

قادری طریق میں طلب نہیں تو ترک بھی نہیں ہے۔ طلب کی تو پھر بھی گنجائش ہے کہ بندہ مجبور، معذور، حاجت مند پیدا ہوا ہے۔ طلب کرے تو اقتضائے فطرت ہے۔ البتہ عدمِ طلب یا ترکِ اسباب استغنا اور کبر کو ظاہر کرتا ہے جو حق کی صفت ہے۔ بندے کے لئے یہ محمود نہیں بلکہ جسارت ہے۔ ترکِ ملازمت، ترکِ نعمت، ترکِ اولاد میں نفس ہے۔ حتیٰ کہ اگر ترکِ معاصی کا دعویٰ کریگا تو پکڑا جائے گا کیونکہ اس میں اپنی قوت کا ادّعا ہے جو شرک ہے۔ لہٰذا ایسے ناپسندیدہ ترک کے خیال کو ترک کرنا چاہیئے۔ نفس کے تحت ایسا عمل قابل بازپرس ہے۔ البتہ اللہ کے حکم و توفیق سے معاصی کے ترک کا خیال درست ہے۔ علمِ صحیح کے تحت طلبِ معاش، دولت کمانا اور صحت و عزت کی زندگی بسر کرنا مستحسن ہے۔

(۴۲) تارکُ الدنیا۔ متروکُ الدنیا

جب کھانے کو نہیں ملتا اور دمڑی کو کوئی نہیں پوچھتا تو بعض بناوٹی پیر اپنے آپ کو تارکُ الدنیا بنا لیتے ہیں۔ اور گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں تاکہ لوگ اُن کی طرف رجوع ہوں اور وہ تمتع حاصل کر سکیں۔ ایسی صورت میں وہ تارکُ الدنیا کہاں؟ در اصل متروکُ الدنیا ہوئے۔ جو قوت، دولت، علومِ دینی و دنیوی اور دیگر اسباب کے ہوتے ہوئے تارکُ الدنیا

ہونا کمال ہے۔ عین تمتع کے زمانے میں بلکہ دعوتِ تمتع ملنے کے باوجود محض اللہ کے لئے ان تمام اسباب کو چھوڑنا اور تارکُ الدّنیا ہونا خاص اولیاء اللہ کی شان ہے۔

(۴۳) تمتع کی امید مخلوق سے امید بڑی ابتلا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ اگر ہم نعمت دینا چاہیں تو کوئی چھین نہیں سکتا۔ اور اگر ہم چھیننا چاہیں تو کوئی دے نہیں سکتا (۱۱/۱۴)، اس لئے ظاہری آثار و اشکال سے کبھی دھوکا نہ کھائیں، امید نہ باندھیں چاہے کامیابی کے نقوش پر کیوں نہ ہوں۔ جب تک ہمیں عطا نہ ہو، وہ چیز اپنی نہیں ہے اور نہ قابل توجہ ہے مثلاً اگر کباب تلے بھنے جائیں اور خوشبو بھی دینے لگیں تو کتے کو چاہیے کہ اسے نہ سونگھے ورنہ اسکی اصالت میں فرق ہے پس مالک کے حکم و عطاء پر نظر رہے۔ عطاء کے بعد بھی جب کھانے کا حکم دیں تو اپنی چیز ہے۔

بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ بادشاہِ وقت اور عمائدینِ سلطنت کے ربط سے آپنے کوئی فائدے نہیں اٹھائے۔ انکی نظر میں تعلقات برائے تمتع ہیں۔ حالانکہ یہ سماجی تعلقات ہیں۔ دوستی اور خصوصاً مذہبی دوستی کا مقصد ذاتی تمتع نہ ہونا چاہیئے

(۴۴) دعا اور استقامت قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا (۱۱/۱۴)، (بے شک قبول کیگئی دعا تمھاری پس استقامت دکھاؤ)

اس عالم کی عجب حکمت ہے۔ اہلِ ایمان پر بھی سخت بلکہ بہت سخت دور گزرتے ہیں اہل ایمان سے نصرت کا وعدہ ہے۔ البتہ استقامت شرط ہے۔ اس سے دین میں قوت آتی ہے۔ اور دنیا تو دنیا عاقبت میں ابدی سرفرازی حاصل ہوتی ہے یہی قوت و ترقی دراصل ایسی سختیوں کی منشا ہوتی ہے۔ مصیبتوں میں ہمارا صبر و استقامت

مقصودِ الٰہی ہے۔ حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کو کامیابی سے قبل کافی انتظار کرنا پڑا۔ دشمنوں کی رسّی دراز کی گئی۔ آگ وغیرہ کے سامان ہونے دیئے۔ جلال کی تجلیاں پوری ہوگئیں تو حفاظت کے ساتھ نصرت عطا ہوئی۔ اس میں کوئی دم نہیں مار سکتا۔ معاملہ واجبیت، معقولیت، حق و صداقت کا بھی ہو تو بعض وقت تجلی خلاف ہوجاتی ہے۔ پھر موانعات کے باوجود کامیابی عطا ہوتی ہے۔ جو قابلِ شکرانہ و نیاز ہوتی ہے۔ جب مومن کا کام بن رہا ہو تو شیاطین مخالفت پر بڑا زور دکھاتے ہیں۔ ان کی قوتوں کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ اس لئے امید کے ساتھ حفاظت کی دعا کرتے رہیں اور کبھی یہ نہ کہیں کہ ایسا مخالفانہ عمل کیوں ہو رہا ہے۔

یاد رکھو علمِ صحیح کے بعد جو دقتیں آتی ہیں ان کا منشا مومن کا مقام بنانا اور ٹریننگ دینا ہوتا ہے۔ اور علمِ باطل کے بعد جو دقتیں آتی ہیں ان کا منشا اہلِ باطل کو تباہ کرنا ہوتا ہے۔

(۴۵) مصائب میں استقامت ایک سرکاری ملازم کا تنزّل ہوا تو فرمایا۔ اس عالم کے اقتضاءات بے حد و حساب ہیں۔ حکمت کی حد نہیں۔ البتہ قرآن کے لحاظ سے اتنا اطمینان ہے کہ متقیوں کا انجام بخیر ہے۔ درمیانی مراحل بے حساب ہیں۔ آثار پر نہ جائیں۔ اگر سب کام ہمارے حسبِ منشاء ہوتے رہیں تو اللہ میاں بیمہ کمپنی بن جائیں گے کہ ایمان کے بعد کسی آزمائش کی ضرورت نہ ہو۔ حالانکہ ایمان کے بعد کسی کا سلوک بذریعہ نقصانات اِنَّا لِلّٰهِ (۲/۲)، سے طے کرایا جاتا ہے تو کسی کا مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ سے، اور کسی کا اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ (۹/۱۵)، سے جیسا جس کا اقتضا ہے۔ مطلوب علمِ صحیح ہو تاکہ غیرتِ دینی، خودداری اور آزادی سے زندگی بسر ہو۔ ورنہ روپیہ کی کمی بیشی کوئی چیز نہیں۔ قرآن میں ہے۔ ہم سو میں ہزار کی برکت دیتے ہیں یہ ہزل

پر صحیح ہے۔

(۴۶) پریشانیوں میں حکمت اللہ کی مصلحتوں کو سمجھنا مشکل ہے۔ کامیابی کے لئے دعا رہنی چاہیئے۔ لیکن غلبہ و نصرت حاصل کرنے کے لیئے باطنی اصلاح ضروری ہے جس کے نتیجے میں نصرت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ آیت کی ترتیب ملاحظہ ہو۔ وَاعْفُ عَنَّا۔ وَاغْفِرْ لَنَا۔ وَارْحَمْنَا۔ اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۳/۸) (معاف کر ہم کو۔ بخش ہم کو۔ اور رحم کر ہم پر۔ تو دوست کارساز ہے پس ہمکو کافروں پر غالب کر) نصرت یوں ہی نہیں آیا کرتی بلکہ اس سے قبل مصائب و آفات کی بھٹی میں سے گزارا جاتا ہے تاکہ صبر و استقامت کا مقام حاصل ہو جائے۔ گو مصیبت نہ آنے کی خواہش اور فوری نصرت حاصل ہونے کا خیال فطری ہے۔ لیکن منشائے الٰہی کے تحت ان مصائب سے گزرنا لابد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ الخ (اگر تم اللہ کے واسطے مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور ثابت قدمی عطا کرے گا) بہرحال مصائب کا آنا اس عالم میں قطعی ہے۔ قانونِ عُسر و یُسر عام ہے۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۳۰/۶)۔ البتہ اس کے بعد مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ کی دعا پر نصرتِ قریبہ کی بشارت ملتی ہے وقت کا تعین نہیں۔

(۴۷) حقیقی اطمینانِ قلب بے نیازی اور اطمینانِ قلب کے الفاظ عموماً بہت غلط استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعض لوگ راہبوں، جوگیوں کی طرح ترکِ علائق کرکے بیٹھنے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کو کیسی بے نیازی اور اطمینانِ قلب حاصل ہے۔ ایسے آثار سے نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان چیزوں کا اصل محرک کیا ہے۔ ایمان ہے یا ہوائے

نفسانی۔ علم ہے یا جہل۔ ورنہ ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک مایوسی آپڑے یا اعصاب خراب ہو جائیں، یا دماغ الٹ جائے۔ تو انسان بال بچوں، جائداد وغیرہ کو چھوڑ بیٹھتا ہے جس کے پیچھے کوئی اعلیٰ علم نہیں ہوتا۔ اسکے برخلاف توحید کی وجہ سے جو بے نیازی استغنا حاصل ہوتا ہے۔ وہ اعلیٰ علم و ایمان کا نتیجہ ہوتا ہے جسمیں بلا تاویل سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے مرض اور صحت دونوں کے آثار و نتائج ایک سے نہیں ہو سکتے

اس سوال پر کہ کافر بھی اپنے اعتقاداتِ مذہبی کے تحت بے نیازی دکھاتے ہیں۔ انمیں اور اسلامی استغنا میں کیا فرق ہے۔ فرمایا چونکہ انکے پاس اللہ رسول پر ایمان نہیں۔ اس لئے راہبوں وغیرہ کے استغنا میں نفس کی آمیزش ہوتی ہے۔ ان کا مذہبی کتابی علم انسانی علم سے خلط ملط ہو چکا، اس لئے للّٰہیت باقی نہ رہی اور وہ اعلیٰ ایمانی آثار جو عبدیت کا لازمہ ہیں ان میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ علاوہ ازیں کسی کو سکون و اطمینان حاصل بھی ہو جائے تو دھوکا نہ کھانا چاہیئے کیونکہ بعض لوگوں کو اپنے اقتضائے طبع سے گندی سے گندی چیزوں میں سکون و لطف ملتا ہے۔ بعض بھنگ، مدک پینے والوں کے کمرے سنڈاس کی طرح غلیظ رہتے ہیں۔ لیکن انکی بدبو کا لطف اٹھانے کیلئے دور دور سے مدکی، چرسی آتے ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ، اعلیٰ سے اعلیٰ چیزوں میں لوگوں کو سکون ملتا ہے۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کس اعلیٰ علم و ایمان کے تحت یہ سکون و اطمینان نصیب ہو رہا ہے قرآناً حقیقی اطمینان اور سکون وہی ہے جو ایمان کا نتیجہ ہو۔ ارشاد ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ (۱۳/۲۰) (جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے آرام و اطمینان حاصل کرتے ہیں) یہ اللہ کا فضل ہے ورنہ سارے عالم کی حکومت جاہ و حشمت ہم میں سکون و محبت نہیں پیدا کر سکتے۔ ملاحظہ ہو۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (۱۰/۴)

(۴۸) ملکِ استغنا ایک بزرگ کے متعلق روایت ہے۔ اُن کا تموّل مشہور تھا ایک دن حضرت اپنے گھوڑوں کیلئے سونے چاندی کے ساز و سامان تیار کرا رہے تھے۔ ایک شخص نے خیال کیا۔ اللہ والے ہو کر دُنیا میں کتنے لگے ہیں۔ حضرت کے قلب پر یہ بات آئی تو فرمایا۔ ایں میخ در گِلِ زدہ ام، نہ بر دل۔ یعنی میرا دل اس سے بندھا نہیں ہے۔ میں بے ہمہ با ہمہ ہوں۔ اطمینان و استغنا محض فضلِ الٰہی ہے جو دولت بلکہ عبادات سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ چاہے تو شر میں خیر اور خیر میں شر ظاہر ہوتا ہے۔

(۴۹) نفسیات و ہدایت ہدایتِ انسانی دنیا کا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ انبیاء کا خاص موضوع، انسان، رہا۔ ہدایت کے لئے انسانی نفسیات جذبات، ماحول کا مطالعہ ضروری ہے۔ لیکن اکثر مرشدین اس میں کورے رہتے ہیں۔ یورپ کے ماہرینِ تعلیم نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسکے ذریعہ تعلیم کو ترقی دیتے ہیں۔ محض احکام و ہدایات مُسلّط کرنے کا طریقہ ناقص ہے۔ البتہ حالات کے مطالعے کے بعد، مناسب طریق پر اشارے دینا، ایما کرنا، دیرپا، مثمر ثابت ہوتا ہے۔ کسی پر اپنا خیال عائد کرنا اور اپنے اقتضا کے تابع کرنا مفید نہیں۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (۲۲/۱۹) ذمہ نہیں ہے ہم پر مگر ظاہر کا پہنچانا، اس کا مطلب حکمت کے ساتھ، اقتضاءات و حالات کے لحاظ سے کوشش کرنا ہے۔ البتہ نتیجہ کے ہم ذمہ دار نہیں۔ اللہ ہادی ہے۔ دعا کریں۔ محل کے لحاظ سے مہلت بھی لازمی رہتی ہے۔

بعض لوگ اولیاء اللہ سے ربط رکھتے ہیں لیکن اس محل کا اقتضا پورا نہیں کرتے۔ بلکہ شیطانی لوازم پورے کر کے عمدہ نتائج کے متوقع رہتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں کا فیض بند ہو جاتا ہے اور وہ شیطان کا فٹ بال بن جاتے

ہیں۔ مثلاً بجلی سے ربط پیدا کرنے کے بعد، اگر ذرا سی غفلت یا غلطی ہو تو دھما کا ایسا ہوتا ہے کہ بالکل اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ مومن ہونے اور اولیاء اللہ سے ربط کا دعویٰ کرنے سے کوئی بچ سکتا ہے۔ یہ شیطانی چکر ہے شیطان شر کا بڑا تعیّن ہے۔ اس کے زیرِ اثر نہ صرف کافر ہیں بلکہ وہ فاسق مسلمان بھی جو غلط علم و عمل میں مبتلا رہتے ہیں۔ ارشاد ہے۔ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ (۲/۱)، قرآن میں الفاظ مطلق استعمال ہوئے ہیں ایسا زہر جسم میں پھیلے تو جان جاتی ہے۔ ورنہ زہر کے مقام کو قطع کرنا ضروری ہے ایمان کی حالت میں باطل سے ربط رکھنا مہلک ثابت ہوتا ہے۔ تین خلفاء کے دَورِ خلافت کے واقعات سے ثابت ہے کہ کس طرح بعض مسلمان شیطان کے چکّر میں پھنس کر تباہ ہو گئے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں مانعینِ زکوٰۃ نے نماز، روزہ، حج کی ادائی کا اقرار کیا۔ لیکن زکوٰۃ سے انکار کیا۔ فراستِ صدّیقی نے اِن کا وجود ملت کے لئے مہلک جان کر جہاد کا حکم فرمایا۔ اور کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ حدیث میں ہے۔ کسی معاملے میں ایک یہودی اور ایک مسلمان میں اختلاف ہوا۔ یہودی نے کہا۔ رسول اللہ ؐ کے پاس چلیں۔ آپ جو تصفیہ فرمائیں اسے ہم دونو قبول کریں گے حضور ؐ نے تصفیہ فرمایا۔ لیکن وہاں سے نکلنے کے بعد، اس نام نہاد مسلمان نے اختلاف کیا اور کہا۔ میں حضرت عمرؓ کو حَکَم بنانا چاہتا ہوں۔ یہودی اس پر بھی رضامند ہو گیا۔ اور دونوں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے اور واقعہ بیان کیا۔ حضرت عمرؓ اندر گئے اور تلوار لا کر اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس فراستِ فاروقی پر کسی نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ یہ منافق تھا۔ شیطان کے زیرِ اثر تھا کہ حضرت عمرؓ کو رسول اللہ ؐ کے مقابلہ میں حَکَم بنانا چاہتا تھا۔ تیسری مثال حضرت علیؓ کی ہے۔ خارجی کثرت

سے قرآن پڑھا کرتے تھے۔ نمازی اتنے کہ پیشانیوں پر گھٹے پڑ گئے تھے۔ لیکن حضرت علی رضؓ نے اِن کے خلاف جہاد کا حکم دیا۔ کیونکہ ان کا وجود ملّت کے لئے سمِّ قاتل تھا اس پہ آج تک کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ مطلب یہ کہ اِن تینوں فریقوں نے اللہ رسول اور قرآن سے ظاہری ربط رکھا تھا۔ لیکن باطنی روح و حیات کا پتہ نہ تھا۔ حزبُ الشیطان تھے اس لئے قتل کئے گئے۔ اس کی سمجھ کے لئے بصیرتِ محمدیؐ، فراستِ صدیقی، سیاستِ فاروقی اور حکمتِ علوی کی ضرورت ہے۔

(۵۰) خیر و شر کی بصیرت عام مسلمان اور علماء بھی قرآن پڑھتے ہیں اور اولیاء اللہ بھی۔ لیکن قرآن سے جو بصیرت علماء ظاہر کو ملتی ہے، اس کی اور جو بصیرت اولیاء اللہ کو ملتی ہے اس کی کیفیت میں فرق ہے۔ اولیاء اللہ پر شرحِ صدر اور علمِ لدنی کی وجہ سے، قرآن مجید کی آیات جو خیر سے متعلق ہیں، اُن میں خیر کی مقدار کا تناسُب کھل جاتا ہے کہ کس عمل میں خیر کی مقدار کا تناسب کیا ہے۔ اسی طرح قرآن کی آیات جو شر سے متعلق ہیں ان میں شر کی مقدار کا تناسب بھی کھل جاتا ہے کہ کس عمل میں شر کی مقدار کا تناسب کیا ہے۔ اس کے برخلاف عام علماء خیر و شر کا تقابل تو جانتے ہیں لیکن تناسب کا انھیں صحیح علم نہیں ہوتا کہ وہ خیرِ کثیر اور خیرِ قلیل میں کما حقہ تمیز کر سکیں۔ اسیطرح خیر و شر کی باریکیوں پہ بھی علماءِ ظاہر کی نظر نہیں جاتی تو عمل کہاں سے کریں گے اس کے برخلاف اولیائے کاملین کے پاس ایسی میزانِ بصیرت ہوتی ہے جس میں رائی برابر خیر و شر بھی تُل جاتے ہیں

(۵۱) حُسنِ ظن ایک اصُول یاد رکھو۔ ہر کسی سے خیر کی توقع رکھیں، لیکن اس سے شر ظاہر ہونے پر تعجب نہ کریں۔ اکثر لوگ اسی میں حیران

رہتے ہیں کہ فلاں صاحب سے ایسی امید نہ تھی۔ میاں! اُمید ہی کیوں رکھی۔ اس میں خیر فرض ہی کیوں کیا۔ ہر ایک اپنا اقتضا ظاہر کر رہا ہے۔ دیکھتے رہو۔ جہاں تک خیر کا تعلق ہے وہ اللہ کا فضل ہے۔ اور جہاں تک شر کا تعلق ہے اُس کا ذاتی ہے۔ اللہ کے فضل کی امید پر ہر ایک سے حُسنِ ظن رکھنا چاہیئے اور بدظنی نہ کرنی چاہیئے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ (تحقیق اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے)۔ البتہ خیر ظاہر نہ ہو اور شر ظاہر ہو تو تعجب نہ کریں کہ یہ اس کے اقتضائے ذاتی کے مطابق ظاہر ہو رہا ہے۔ اسلام کی تعلیم میں عمل کے ارادے پر اِنْ شَاءَ اللّٰہ (اگر اللہ نے چاہا) کہنے کا حکم ہے۔ اس کا منشا یہی ہے کہ تمام خیر اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے ورنہ اِنْ شِئْتُ (اگر میں چاہوں) ہو جائے گا جو نفس و شرک ہے

(۵۲) اچھی۔ بُری ہر چیز اپنے محل اور ربط کی بنا پر اچھی، بری، بڑی چھوٹی کہلاتی ہے۔ ہر ایک کے احکام الگ ہیں۔ زمین پر چلنے والوں کے احکام ہوا میں اُڑنے والوں سے مختلف ہوتے ہیں نیچے کی لغزش سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا لیکن اوپر کی لغزش سے سر کے بل نیچے گرے گا۔ بزرگوں کا قول ہے حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّاٰتُ الْمُقَرَّبِیْن۔ صالحین کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں۔ اہلِ نفس کے مقام کے احکام الگ ہیں اور اہلِ دل کے اعلیٰ مقامات کے احکام الگ۔ اعلیٰ مقام پر رہ کر نیچے والوں کے کام کریں تو مار پڑ جاتی ہے۔

بعض وقت انسان پر تحکّم اور تعزّز کی تجلّی ہوتی ہے تو خوب حکم چلتا ہے عزّت ملتی ہے لیکن تبخترؔ (فخر اور اکڑ) کرے اور بھولے اور اسبابِ ظاہری (عزّت و تعلقات) پر بھروسہ کرے یعنی انیت و انانیّت آجائے جو

نادانستہ طور پر تحت الشعور میں پڑے رہتے ہیں تو تحکم و تعزز کی تجلیاں رُک جاتی ہیں۔ ایسے موقع پر مقامِ عبدیت میں رہیں اور نیچے کے مقام پر صبر کریں۔ نفس کے مقام پر رہ کر بے نفسی و بے ارادتی کے لوازم چاہنا مناسب نہیں۔ اصلاح کی خاطر نعمت روکی جاسکتی ہے۔ اس محل پر توبہ کے ذریعے توفیق طلب کرے۔

۵۳۔ عقل و قلب

انسان میں دو قسم کی حرارت ہوتی ہے۔ ایک بخار کی حرارت جو مرض و کمزوری کی علامت ہے۔ اور ایک صحت کی حرارت جو قوت کی نشانی ہے۔ اسی طرح ایمان کے تعلق سے ایک حرارت نفسانیت کی ہوتی ہے اور ایک توحید کی۔ مطلب یہ کہ ہم قلب کے اعتبار کے تحت رہیں اور عقل کو قلب و قرآن کے تابع رکھیں تو ہدایت ملے گی ورنہ محض عقل و دماغ کے تحت رہیں تو حیرانی رہے گی۔ اس کی مثال ایسی جانو کہ طوفانی بارش ہو رہی ہے گھر گر رہے ہیں۔ تو قلب کا کام یہ ہے کہ وہ سمجھے۔ بارش کا برسانے والا اللہ ہے۔ اس کے حکم سے بارش ہو رہی ہے۔ لہٰذا اس سے دعا کئے جائیں کہ بارش رُکے اور ہم نقصان سے بچیں۔ یہ تو قلبی اعتبار ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ عقل کے تقاضوں کو بھی پورا کریں۔ اور گھر کے ٹپکے وغیرہ درست کرائیں۔ اِس طرح قلب ہی کے زیرِ ہدایت عقل کو استعمال کریں

دین کے لئے قلب و دماغ دونوں کی ضرورت ہے۔ ہر ایک اپنے محل پر ضروری ہے۔ عہدِ جدید کا اقتضا علمی تحقیقات ہے۔ جس میں دماغی لحاظ سے دارالمصنفین اعظم گڑھ اچھا کام کر رہا ہے۔ دنیا پر دماغی عظمت ظاہر کر رہا ہے لیکن بڑا کام قلبی ہے جو اولیاء اللہ

کا ہے۔ حضرت غوثِ اعظمؓ نے قلبی و دماغی دونوں خدمات انجام دیں

(۵۴) عقل و فضل

ہر روز یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کل تک بے وقوف تھے، محض فضل پر بچے۔ لوگ عقل و فضل کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ ناچیز نے عرض کیا عقل بھی تو فضل ہی ہے۔ فرمایا۔ بے شک۔ لیکن عقل کے حدود ہیں اور فضل لامحدود ہے۔ عقل کی چمک جگنو کی چمک ہے جو تھوڑی دیر کے لئے ہوتی ہے لیکن فضل تو نور ہے لامحدود ہے۔ اِس امتیاز کو اہلِ عقل بھی دیکھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔ جب فضل ہوتا ہے تو اُلٹی بات بھی سیدھی بیٹھ جاتی ہے جس کی توجیہ ممکن نہیں۔ فضل نہ ہو تو عقل سے جتنے بھی جوڑ بٹھالو، زاویئے بنالو، لیکن جوڑ بیٹھتا ہی نہیں۔ اس لئے ہر آن ہم فضل کے محتاج ہیں۔ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ (یعنی اللہ سے اس کا فضل مانگو) ہمارے معاملات میں عقل برائے نام ہوتی ہے لیکن ہم اللہ کے فضل سے بڑے عقل مند سمجھے جاتے ہیں۔

ہر معاملے میں فضل کا اعتبار رہے۔ تفاخر کا اعتبار نہ آئے۔ اپنی ذاتی اہمیت و عظمت محسوس نہ کریں۔ واٹر پروف بنے رہیں۔ جس پر تعریف و مقبولیت کے قطرے تو گرتے ہیں لیکن دل میں رطوبت نہیں پہنچتی۔ یہی حفاظتِ الٰہی ہے۔

عقل کے ذریعے انسان ایٹم بم، ہائیڈروجن بم بنا کر اپنی قوت کو ہزاروں گنا بڑھاتا ہے۔ جب عقل میں اتنی قوت ہو تو ایمان میں کتنی قوت ہوگی اور ہماری دعاؤں کے آثار کتنے قوی ہوں گے۔ ایک مومن کی دعا چھوٹے سے چھوٹے لشکر کو بڑے سے بڑے لشکروں پر فتح و غلبہ دلاتی رہی ہے۔

(۵۵) عدل و فضل قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کو ذو عدل (عادل) کہیں نہیں کہا گیا۔ بلکہ اس سے بڑھکر ذو فضل (فضل والا) کہا گیا۔ عدل تو اس وقت ہوگا جب کہ بندے کا کوئی حق ہو۔ ہم رائی برابر کا حق نہیں رکھتے تو بغیر حق کے عدل کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ البتہ اللہ فضل فرماتا ہے کہ بندے کو حق نہ ہونے کے باوجود نعمت عطا کرتا ہے۔ اعمال کا مدار وجود پر ہے اور وہ ہمارا ذاتی نہیں۔ زاید بر ذات ہے محض فضل ہے۔ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ (۱۹/۱۸)

(۵۶) اَن پڑھ اور فضل قرآن فہمی اور سلوک میں ترقی کے لئے پڑھنا لکھنا لازم نہیں۔ بلکہ ایک ایسا محل آتا ہے جہاں علوم مکسوبہ کو بھولنا پڑتا ہے جس کے بغیر علمِ حق قلب میں نہیں آتا۔ وہ علمی علم ہے کسبی نہیں۔ اِس کو شرحِ صدر، علمِ لدنی کہتے ہیں جو خاص فضل ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ چنانچہ مولانا رومؒ، حضرت غزالیؒ اور حضرت سہروردیؒ نے بھی اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔

صد کتاب و صد ورق در نار کُن　　　روئے خود را جانبِ دِلدار کُن

اللہ تعالےٰ نے نبی کریم صلعم کی خصوصیت اُمّی (اَن پڑھ) بیان کی۔ آپ پڑھے لکھے نہ تھے۔ لیکن اتنا عظیم الشان علم (قرآن) لائے اور سب عالم کو سکھا گئے۔ بڑے بڑے صحابہ پیدا کئے جن میں اکثر اَن پڑھ تھے۔ بعض اکابر اولیاء اللہ بھی ایسے ہوئے ہیں کہ اُن کا ظاہری علوم میں کوئی خاص مقام نہ تھا جس پر سب کو حیرت ہے۔

قرآنی معارف کا حصول ڈگریوں پر نہیں۔ لکھنے پڑھنے کو شرحِ صدر اور فضلِ الٰہی سے کوئی تعلق نہیں۔ دور کیوں جائیں۔ خود ہمارے بڑے

حضرت قبلہ کمال اللہ شاہؒ ہی کو لو۔ وہ کیا پڑھے لکھے تھے۔ عربی کے اعراب تک ٹھیک نہ پڑھ سکتے تھے لیکن معارفِ قرآنی کا دریا بہتا تھا۔ پروفیسر مولوی مناظر احسن گیلانیؒ تو آپ پر فدا ہی تھے لیکن ان کے استاد مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی ہندوستان کے مشہور عالم، فلسفی، متکلم اور ادیب تھے۔ ستر برس کی عمر میں آدھ گھنٹے کی تعلیم میں حضرت کے قدموں پر گر پڑے بیعت کرلی، خلافت حاصل کی۔ اور فرمایا۔ اگر یہ علمِ توحید حضرت سے نہ ملتا تو میں دنیا سے ملحد چلا تھا۔ اِسی طرح بڑے عالم مولوی صفی الدین صاحب نے جو حرمین شریفین میں مدتوں رہے۔ بڑھاپے میں حضرت کے قدموں میں علم حاصل کیا۔ اور مجھ سے فرمایا۔ ایک پھانس تھی جو دل میں لگی ہوئی تھی لیکن حضرت کی صحبت میں نکل گئی اور علمِ حق نصیب ہوا۔

(۵۷) مبلغِ اعظم بنگال اسی سلسلے میں مولوی مناظر احسن صاحب کی کتاب "مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" کے حوالے سے حضرت اخی سراج مبلغ اعظم بنگال کا بھی ذکر فرمایا۔ حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ نے دلی میں عظیم الشان تبلیغی نظام قائم فرمایا تھا۔ آپ نے سینکڑوں اولیاء اللہ کو دکن، بنگال، پنجاب اور سارے ہندوستان میں تبلیغ کے لئے بھیجا۔ ان میں حضرت اخی سراج عثمانؒ مبلغ اعظم سمجھے جاتے ہیں۔ اور صاحبِ بنگالہ مشہور ہیں۔ آپ سلطان جی کے مرید و خلیفہ تھے۔ بڑھاپے تک بالکل ناخواندہ رہے۔ لڑکپن سے حضرت کے خدمت گاروں میں پرورش پائی۔ سلطان جی کے حکم پر استاد مولانا فخر الدینؒ نے اخیر عمر میں چھ مہینے تعلیم دی۔ اس کے بعد سلطان جیؒ نے آپ کو بنگال بھیجا اور تبلیغ کا فرض سپرد فرمایا۔ آپ کے فیض سے تقریباً سارا

بنگال اسلام لایا۔ جس پر آج حیرت کی جاتی ہے۔ پنڈوہ کے بزرگ حضرت علاؤ الحق والدین جن کا آج سارا بنگال معتقد ہے۔ ان ہی اخی سراج عثمانؒ کے تراشیدہ ہیں۔

(۵۸) خشیت و شکر

ناچیز کی ایک کامیابی پر فرمایا۔ قلب لذت نہ لے۔ پھریری نہ آئے۔ یہ ادعا نہ ہو کہ ہم نے کچھ کیا۔ کسی چیز کا لزوم نہ سمجھو۔ لادعویٰ رہو۔ نہ تو کسی کے کہنے سے خوش ہو نہ خائف و مغلوب ہو۔ صرف شکر ادا کر کے خشیت کے مقام پر رہو۔ غیب پر ایمان لانا فرض ہے۔ ورنہ شہود و شہادت کے بعد، احکام، آثار دیکھ کر تو کافر، فرعون تک ایمان لاتا ہے۔ اب تو تجلی موافق رہی۔ کیا معلوم کہ دوسری تجلی کیا ہوتی ہے۔ ہمارے گناہ کیا کم ہیں۔ اسی لئے اولیاء استغفار میں لگے رہتے ہیں۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا کہتے رہتے ہیں۔ قرآن میں مختال اور فخور نہ بننے کی تعلیم ہے۔

قرآن نے فرح سے منع فرمایا۔ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (۲۰/۱۱) ترجمہ (مت خوش ہو تحقیق اللہ نہیں دوست رکھتا بہت خوش ہونے والوں کو) و نیز حکم ہے: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ (۴/۱) یعنی اللہ کی عطا پر فرح (اترانا) نہیں کر سکتے۔ حمد اپنی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کریں تو عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ انبیاء کی زندگی اسی خشیت پر ہے۔ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (۱۵/۵) یعنی اس کی رحمت کے امیدوار رہیں۔ ساتھ ہی عذاب کو ہر وقت

حاضر جانیں اور ہر وقت خائف رہیں۔ رحمت کی امید من اللہ آتی ہے۔ وہ مقام نہیں ہے۔ اس لئے یوسف علیہ السلام کی دعا تھی تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا (۱۳/۲) (یا اللہ) مجھے مسلمان ماریو) نبی کریم صلعم رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ہونے کے باوجود خشیت سے فرماتے۔ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ (۲۶/۱) (یعنی نہ معلوم میرے اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا) اللہ اکبر۔ خشیت کی حد ہے۔ حضورؐ کا عام میلان حزن کی طرف تھا۔ ممالکِ عرب کے فتوحات کے باوجود حضورؐ سر آن کانپتے تھے۔ روتے تھے۔ استغفار فرماتے تھے۔ کبھی آپ کو ہنستے نہیں دیکھا گیا۔ صرف مسکرا دیتے تھے۔ حدیث میں ہے۔ جو میں جانتا ہوں تم جانتے تو بی بچوں کو بھول جاتے۔

اسی مقامِ حزن و خشیت پر لَا تَحْزَنْ (۱۲/۱) کا انعام ملتا ہے۔

چاہے کتنا ہی فضل ہو نفس کے تحت کوئی خوشی نہ ہو۔ البتہ قرآن میں صرف ایک بات پر فرح کی اجازت ہے اور وہ ناقابلِ تبدیل حقیقت قرآن ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۵/۱۶) صرف قرآن کو استحکام ہے۔ باقی سب حالات ہر آن بدلنے والے ہیں۔ ان کو مستقل جان کر کیسے خوشیاں منائی جا سکتی ہیں۔ اللہ کے الطاف و عنایات پر بھی نہ خوش ہوں اور نہ اترائیں بلکہ صرف شکر کریں۔ الحمد للہ کہیں۔ صرف قرآن اور قرآن کے علم کے انفتاح کے تعلق سے فرح کی اجازت ہی نہیں بلکہ امر ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۱/۱) (کہہ اللہ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیئے۔ وہ بہتر ہے اس سے جو یہ جمع کرتے ہیں) اللہ نے ہم کو قرآن کے قابل سمجھا۔

قرآن کا خاصہ دوسری جگہ یوں بیان ہوا ہے۔ لَوْ اَنْزَلْنَا

هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ (۲۸ پ) (اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اُتارتے تو اُس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا) قرآن جب پر اُترے اللہ کی خشیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور عرفانِ حق پہ بندہ اشک بار ہوتا ہے وجد میں آتا ہے۔ ارشاد ہے۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰۤی اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (۷ پ)

شرو نزول ہمارا مقام ہے نہ معلوم دوسری آن کس مصیبت کے غار میں گریں۔ اپنے کو کبھی مامون نہ سمجھیں۔ خوف وخشیت کا مقام ہی عبدیت ہے۔ خشیت اور نعمت میں تضاد نہیں۔ رجائیت (امید) رب کا فضل ہے جو سنبھال کر ہمیں زندہ رکھتی ہے۔ رضا کا مقام وانعام بھی اُسی کو ملتا ہے جو خشیت کے مقام پر رہے۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ (۳۰ پ) خشیت کے بعد ہی اجر ومغفرت عطا ہوتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَرِیْمٌ (۲۹ پ) غیب پر خشیت وہیبت ہونی چاہیئے حاضر پر کیا ہو گی۔ اسی لئے تقویٰ کا انحصار ایمان بالغیب پر ہے جتنا بڑا فضل ہو اتنا ہی خوف لازم ہے۔ فضل ومراتب کی جتنی بلندیاں نصیب ہوں گی اتنا ہی فطرتاً اِس امر کا خوف ہو گا کہ اس بلندی کے نیچے شر وعذاب کی کتنی گہرائیاں ہیں جن میں گرنے کا خوف لگا ہوا ہے۔ لہٰذا ایاز قدرِ خود بشناس۔ قربِ سُلطانی مخدوش باشد ملحوظ رہے۔

(۵۹) خشیتِ الٰہی اور خوفِ غیر اللہ

ناچیز نے عرض کیا۔ حضرت موسیٰ عصا کے

اژدھا بننے سے ڈر گئے۔ اولیاء اللہ کے لَا خَوْفٌ وَّلَا حُزْنٌ کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا خوف کی ۲ دو نوعیتیں ہیں۔ ایک وہ جس کے محرک انسانی زندگی کے طبعی تقاضے ہوتے ہیں جو انسانی فطرت اور حکمتِ الٰہی کے مطابق ہیں جیسے کسی شخص کا ہاتھ ناواقفیت میں آگ پر پڑ جائے تو وہ بے اختیار گھبرا کر ہاتھ ہٹا لے گا۔ دوسری نوعیت کا خوف وخشیت وہ ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ یعنی بندہ غیر اللہ کو عدم اور میتِ محض جانتا ہے اور اللہ کے سوا کسی کو موثر، نافع، ضار نہیں جانتا۔ تمام نعمتوں کو اللہ کی طرف سے جانتا ہے اور کسی نعمت کا قیام ایک لحظہ کے لئے بھی لازمی نہیں سمجھتا۔ داخل وخارج میں کتنے ہی موافق آثار ظاہر ہو جائیں، نہ وہ فرح کرتا ہے اور نہ اُس کی خشیت میں فرق آتا ہے کہ نہ معلوم دوسری آن کیا تجلی آ جائے۔ اسی طرح اگر مخالف آثار جمع ہو جائیں تو اُن کو قطعی نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی ذات سے موثر نہیں بلکہ اللہ کے حکم وقدرت کے تابع ہیں۔ اللہ سے امید رکھتا ہے کہ ممکن ہے وہ خیر وفضل کی صورتیں پیدا کر دے۔ اس کی نظر ہمیشہ حق پر لگی رہتی ہے کہ وہ کیا کرتا ہے اور اس کا کیا منشا ہے۔ اور وہ اپنی جنبشوں کو منشائے الٰہی کے تابع بنا لیتا ہے۔ اس طرح مخلوق کے تعلق سے اس کا قلب لَا خَوْفٌ وَّلَا حُزْنٌ کے مقام پر رہتا ہے۔ نہ غیر اللہ سے خوف کرتا ہے نہ امید رکھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے تعلق سے اس پر ہر آن خوف ورجا کا حال طاری رہتا ہے۔

حضرت موسیٰ ؑ نے امرِ الٰہی کے تحت عصا پھینکا۔ وہ اژدھا بن گیا۔ عصا کے اژدھا بننے میں حضرت کے علم وارادت کو دخل نہ تھا۔ حکمتِ الٰہی کے تحت آپ ڈر کر پلٹے لیکن اللہ نے امر فرمایا۔ مت ڈرو۔ میرے پاس رسولوں کو خوف سے

سروکار نہیں، جب اُن کے ساتھ امر وقدرت کا معاملہ ہوتا ہے تو کوئی مخالف آثار کلام نہیں کرتے۔ اژدھا میں نے پیدا کیا اور میں ہی اس کے شر سے محفوظ رکھ سکتا ہوں۔ اِس سے حضرت موسیٰؑ کی تعلیم مقصود تھی۔

(۶۰) اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یا اَلْحَمْدُ لِی

سوال۔ لَا تَفْرَحْ (۲۰/۱۱) اور قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (۱۱/۱۱) اِن دو آیتوں میں کیا تطبیق ہے۔ فرمایا۔ عوام کی خوشیوں میں اور عارفین کی خوشیوں میں بڑا فرق ہے۔ ہر دو کے احکام جُدا ہیں خوشیاں منانے پر عوام قابلِ بازپرس نہیں لیکن عارف قابلِ بازپرس ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ کے فضل ورحمت کے علم پر خوشی منانے کو کہا جا رہا ہے جو اشیاء کے اوپر کی چیز ہے۔ لیکن بعض مرشدین جس پر خوشی کرتے ہیں وہ "شئے" ہوتی ہے۔ یعنی شئے کے حصول پر وہ خوشیاں کرتے ہیں نہ کہ فضل ورحمتِ الٰہی پر۔ اُن کا دل گواہی دے سکتا ہے کہ ان کے دل پر شیئیت غالب ہے یا فضل ورحمت۔ اِسی پر تصفیہ ہو جائے گا۔ اگر شئے کے تحت ہو تو نفس ہے۔ لیکن مریدین کو سمجھانے کے لئے فضل ورحمت کہہ دیتے ہیں۔ لہٰذا اُن پر "لَا تَفْرَحْ" کا اطلاق ہوگا۔ اور اُن کے مقام کے لحاظ سے سزا ہوگی۔ البتہ خشیت کے علم کے بعد توازن ٹھیک ہو جاتا ہے۔

میرے علم میں ہے کہ بعض موجودہ اولیاء نے خوشی کی تو ایسی اُگت بنی کہ شئے ہی جان لیوا ثابت ہوئی۔ اکثر سالکین مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (اترانے والا، فخر کرنے والا) اور وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (۳۰/۱۸) میں تطبیق نہیں دے سکتے۔ نفس کے تحت خوب بڑائی کرتے ہیں۔ اور نعمت بیان کرنے کے حکم سے اِس کی سند لیتے ہیں۔ غفور کا نام لے کر بد اعمالیوں کے لئے بہانے

تلاش کرتے ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتے رہتے ہیں، لیکن در اصل اَلْحَمْدُ لِی ہوتا جاتا ہے۔

(۶۱) فرح اور شُکر کا فرق

لوگ فرح اور شکر میں فرق نہیں کرتے۔ حالانکہ فرح کی بنیاد انیت پر ہے جو شرک ہے۔ اور شکر کی بنیاد بے ارادتی پر ہے جو توحید ہے۔ ہر مقام اور ہر محل کا ایک عمل ہے۔ جو عمل مقربین کا ہے وہ اصحابِ یمین سے متوقع نہیں اور اصحابِ یمین کا علم وعمل مقربین کے لئے سیآت بن جاتا ہے کیونکہ وہ اس محل کے خلاف ہے۔ بلکہ سزا ہو کر تنزل ہو جاتا ہے۔ ہر محل کی ٹریننگ کے بعد مقام بنتا ہے۔ اعلیٰ مقام پر رہ کر نیچے والوں کی طرح فرح کرنا چاہو تو غلطی ہے۔ اگر خوشیاں کرنی ہوں تو نیچے آؤ۔ وہاں اِس کی اجازت بلکہ تائید وتقویت ہے۔ اوپر رہنا چاہو تو ہوائی جہاز کی فضا کے تابع رہنا پڑے گا۔ اگر زمین پر موٹر یا ریل گاڑی کا سفر مطلوب ہو تو یہاں کے اعتبارات الگ ہیں۔ ہر محل کے خطرات، انعامات، احکام علٰحدہ ہیں جن کی تعمیل وہاں کے محل کا اقتضا ہوگی۔

(۶۲) آمد و آورد

خشیت کی نعمت بعضوں کو آورد سے ملتی ہے، بعضوں پر آمد رہتی ہے۔ بعض آورد سے آمد کی طرف آتے ہیں۔ یہ بھی مناسب ہے۔ البتہ آمد ہی آمد ہے فوراً خشیت کا علم کھلے تو کیا کہنا۔ اُس کا فضل ہے۔ ماشاء اللہ خشیت کہنے کی چیز نہیں۔ کھلنے اور گذرنے کی چیز ہے۔ جب تک یہ حال نہ ہو قرآن کھلتا نہیں۔ محض الحمدللہ کہنے اور نعمت میں گم رہنے سے محفوظیت وتوازن نہیں پیدا ہوتے۔ گویا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ جس میں قطعیت وقرار نہیں۔ البتہ خشیت کے علم کے بعد توازن ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور یہ علم بھی ایک قطرہ ہے بحرِ زخار کا۔

(۶۳) اِستغفار اور شکر کا قرآنی سلوک اور ذَنْبِکَ کی تشریح

فرمایا۔ قرآن نے دو باتیں بہت بڑی بیان کی ہیں۔ استغفار اور شکر۔ یہ ایمان و ترقی کی جان ہیں۔ یہ بہت نازک اور اعلیٰ اعتبار ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ گناہ پر استغفار کر لیا اور کھانا ملنے پر شکر، تو بڑا کام کر لیا۔ لیکن یہ بہت بلند چیز ہے۔ اللہ کھولے تو سمجھ میں آئے۔ حضرت سلیمانؑ نے دعا فرمائی۔ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا الخ (۲۳/۱۲) حضرت کس درجہ کی حکومت مانگتے ہیں لیکن اس سے پہلے استغفار فرماتے ہیں۔ کیا یہاں جرائم گنانا مقصود ہے ہرگز نہیں۔ اگر جرائم گنانا مقصود ہوتا تو اس عفو طلبی کے ساتھ ملک و حکومت مانگنے کا کیا موقع تھا لیکن یہاں استغفار اور ملک مانگنا لازم و ملزوم ہیں اللہ سمجھائے تو سمجھ میں آئے۔

یاد رکھو دیگر انبیاءؑ نے اپنے لئے جن نعمتوں کی دعائیں کیں، حضورِ انور صلعم کو اِن نعمتوں کی عطا کی بشارتیں دی گئیں۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ نے شرحِ صدر کے لئے دعا فرمائی۔ لیکن حضور کو اَلَمْ نَشْرَحْ کی بشارت ملی۔ اسی طرح حضرت سلیمانؑ نے رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا عرض کیا تو حضورِ انورؐ کو اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا۔ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (۲۶/۹) کی بشارت دی گئی۔ یعنی ہم نے تم کو کھلم کھلا فتح عطا کی تاکہ تمہارے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمائیں۔ نہ صرف یہی بلکہ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ (۲۶/۹) کی بشارتِ عظیم بھی ملی کہ اللہ

تم پر اپنی نعمت تمام کر دے۔

ناچیز نے عرض کیا۔ حضرت سلیمانؑ نے حکومت مانگنے سے پہلے مغفرت کی استدعا کی ہے۔ حضورِ انورؐ کو اِتمامِ نعمت کی عطا سے پہلے مغفرتِ گناہ (ذَنْۢبِكَ) کی بشارت ملی ہے۔ لیکن انبیاءؑ تو معصوم ہیں۔ گناہ سے پاک ہیں تو پھر ذَنْۢبِكَ کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا سمجھنے کی بات یہ ہے کہ رسول کے مرتبے کا گناہ کیا چیز ہے۔ بعض لوگ جہالت سے یہ سمجھتے ہیں کہ رسول بھی دوسرے لوگوں کی طرح اِقتضائے بشری کے تحت گناہ کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ رسول تو معصوم ہوتے ہیں۔ یہاں عام گناہ کا اعتبار نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ عبدیت سبحان اور عبد کے مابین حدِ فاصل ہے۔ سُبّوحیّت میں تو کسی قصور، نقص اور عیب کا گزر نہیں۔ لیکن عبدیت وجہِ فاصل ہے۔ ذاتِ عبد مرجع ہے قصور کا، نقص اور عیب کا۔ چنانچہ ذَنْۢبِكَ فرما کر عبدیت کے اِسی فرق کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔ پس رسول کے مرتبے کا "ذنب" یہی ہے کہ عبد ہے، فقیر ہے، سراپا نقص و عدم ہے۔ کوئی کمال ذاتی نہیں۔ یہ ربط اللہ تعالیٰ کو حد درجے محبوب ہے۔ اور محبوبیتِ تامہ ہی کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمانا چاہتا ہے۔ اور اپنے محبوب میں کوئی نقص اور عیب کا پہلو دیکھنا نہیں چاہتا۔ ہر وقت درود اور رحمت بھیجتا ہے اور محامد و مکارم سے زینت دینا چاہتا ہے اور محمدؐ بنا دیتا ہے۔ لیکن ازلاً ابداً عبدیت کی حدِ فاصل رسول اللہ (عبد) صلعم اور سبحانؐ (اللہ) میں قائم و دائم ہے سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ (۱/۵) اس پر دال ہے۔ یہ وہ نکتے ہیں کہ بیان ان کا متحمل نہیں۔ بلکہ بیان کرنے سے بھی سمجھ میں نہیں آتے۔

محض فضل سے کھلے تو سمجھ میں آئے۔ جب حضورِ انور کی عبدیت کا یہ عالم ہے تو آپ کی عبادات کا کیا ترفّع ہوگا۔ قیاس سے باہر ہے۔

یاد رکھو۔ قرآنی سلوک یہ ہے کہ درخواست (دعا) پر استغفار کا اسٹامپ لگایا جائے کہ اس اسٹامپ کے بغیر درخواست قابلِ پیش رفت نہیں۔ علاوہ ازیں حضورؐ کا توسط اور درود اللہ تعالیٰ کی کشش کے لئے خاص راز ہیں۔ یہ قرآنی سلوک فطرت کے مطابق ہے۔ استغفار و شکر کا یہ قرآنی سلوک ابتدائی قرنوں میں کثرت سے ملتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (۲۷/۱۴) یعنی پہلے زمانے میں مقربین کی کثرت ہوگی۔ بعد میں ان کی تعداد کم ہوگی۔ لیکن ہر زمانے میں ان کی قوت اِسی اصولِ تعلیم کی بناء پر ہوگی۔ لوگ آج کل قرآنی سلوک بھول گئے اور اس کے استاد بھی کم نظر آتے ہیں۔

(۶۴) مُلکِ سلیمانی اور مقامِ کُنْ

ناچیز نے عرض کیا۔ حضرت سلیمان کی یہ دعا تو مقبول ہے کہ مجھے ایسا ملک و حکومت عطا کیجئے کہ میرے بعد کسی کو نہ ملے۔ لیکن بعد کو دوسروں کو اس سے بڑی بڑی سلطنتیں عطا کی گئیں۔ اس کی کیا توضیح ہے۔ فرمایا۔ یہاں ملک و حکومت کیفیت کے لحاظ سے ہے، نہ کہ مقدار و وسعت کے لحاظ سے۔ حضرت کی حکومت جن و انس بلکہ ہوا تک پر تھی۔ نہ صرف یہی بلکہ حضرت کُنْ، کے مقام پر حاکم وقت تھے کہ صدّیقین تک کو بارگاہِ ربوبیّت کر لَهُمْ مَّا يَشَاۤءُوْنَ (۲۴/۱) کی شان عطا ہوتی ہے۔

آپ کا تو کیا کہنا۔ آپ کے ایک جن اور ایک (انسان) وزیر کی قوت و حکومت کا قرآن میں ذکر ہے۔ جن نے کہا۔ دربار برخاست ہونے سے قبل بلقیس کے

تخت کو لا حاضر کرونگا۔ لیکن قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ الخ (۱۹/۸) وزیر نے جس کے پاس کتابِ آسمانی کا علم تھا۔ کہا۔ میں پلک جھپکنے سے پہلے لے آؤنگا۔ چنانچہ لا کر پیش کر دیا۔

(۶۵) عبدیت و فلاح

بعض لوگ عبادات و تقدس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ مشیخت کا دعوے کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ الخ (۲۰/۱) یعنی جنھوں نے توبہ کی ایمان لائے اور عملِ صالح کیا۔ ممکن ہے فلاح پائیں۔ دل لرز جانے کی بات ہے کہ ایمان و عملِ صالح کے باوجود فلاح کا دعویٰ نہیں کر سکتے کیسی عبدیت ظاہر فرمائی ہے پھر فوراً ارشاد ہے۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاۤءُ وَيَخْتَارُ (۲۰/۱) (یعنی اللہ جسے چاہے پیدا کرے اور فلاح کے لئے منتخب کرے) مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (۲۰/۱) (ان کو کوئی اختیارِ پسندیدگی نہیں) فلاح اللہ کا محض فضل ہے اس لئے ہر آن خشیت میں رہیں۔

(۶۶) مقبولیت کی روح

ایک نازک بات یہ ہے کہ جتنی عبادتیں اور اوراد کئے جاتے ہیں وہ گویا ایک مجرّد جسم تو بنا دیتے ہیں لیکن یہ لازمی نہیں کہ اس میں روح بھی ہو۔ یہ تو محض فضلِ الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس جسم میں قبولیت کی رُوح بھر دے۔ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (۲/۱۴)۔ اس پر دال ہے۔ اسی لئے اولیاء اللہ آخیر وقت تک عبادات کے باوجود یہی فرماتے ہیں۔ اگر اللہ قبول کرے اور خاتمہ بالخیر کرے تو ہمارے لئے خیر ہے۔ ورنہ وہ ذات تو غنی ہے۔ اس کے سامنے سب عبادات و ریاضات کے بعد نہ اِدّعا ممکن اور نہ حق ثابت کر سکتے ہیں۔ اللہ خشیت مقام رکھے (آمین)

فصلِ چہارم

تعبّد۔ تعظیمِ شعائرُ اللہ۔ تکریمِ مقرّبین

(ا) (۱) سلطان عبدالعزیز بن سعود کی فرمائش پر مکہ معظمہ کے شاہی جلسہ میں فی البدیہہ تقریر ۵ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ فرمایا۔ آپ نے جو امن و امان قائم کیا ہے اس کا ہم اعتراف کرتے ہیں، اس کی قدر کرتے ہیں۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں لیکن ہم سابقہ ترکی حکومت کا بھی احسان فراموش نہیں کر سکتے کہ اس نے اپنی عقیدت مندی سے حجاز میں دولت کے دریا بہا دیئے۔ اوقاف کی حد نہ تھی۔ داد و دہش کی حد نہ تھی . . . .

(ب) رسالت کا معرکہ یہ تو انتظامی اُمور تھے۔ اب دینی اُمور کو لیجئے۔ توحید پر جو بار بار زور دیا جاتا ہے، بہت خوب ہے۔ اسلام تو اسلام، اسلام کی برکت سے دوسرے مذاہب بھی توحید کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ اللہ ایک ہے۔ وہی خالق ہے۔ وہی رازق ہے، وہی قادر ہے۔ وہی حاکم ہے۔ یہ عقائد آج بہت عام ہو گئے ہیں کسی تاکید کے محتاج نہیں ہیں۔ آج اسلام اور دیگر مذاہب کے مابین جو حجّت ہے جو معرکہ ہے وہ رسالت پر ہے۔ ورنہ توحید پر سب راضی ہیں۔ اس لئے اسلام و کفر میں اس وقت ما بہ الامتیاز جو عقیدہ ہے، وہ رسولؐ اللہ کی رسالت ہے۔ ورنہ عقلی اور قولی توحید بطفیلِ اسلام آج کم و بیش سب مذاہب میں عام ہو رہی ہے۔

(ج) توحیدِ ایمانی کی روح حُبِّ نبویؐ پس خالی توحید دوہرانا چنداں کارگر نہیں ہے۔ رسالت کے اعلان و وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد اس ایمانی توحید کا لطف ہے جو رسالت کے طفیل سے حاصل ہوتی ہے اور جو اسلام کے باہر میسّر نہیں آسکتی۔ رسالت میں ہر کوئی سُنّت پر زور دیتا ہے اور زور دینا بجا ہے کہ قرآنِ کریم میں اتباع کی تاکید ہے لیکن بہت سے اس راز سے بے خبر ہیں کہ محبّت اور تعظیم اتباع کی جان ہیں۔ ان ہی دونوں کے صحیح امتزاج سے حقیقی اتباع پیدا ہوتی ہے۔ محبّت میں قوت ہے۔ اور تعظیم میں تعدیل۔ جس اتباع کی بنیاد محبت و تعظیم نہ ہو وہ محض ایک رسمی تقلید ہے۔ اتباع نہیں ہے اور نہ اس میں اتباع کی خیر و برکت ہے۔ اتباع کے واسطے محبت و تعظیم کس درجے لازم ہے۔ اہلِ علم اس کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں توحید کے پہلو بہ پہلو حضور رحمۃ للعالمینؐ کی محبت و تعظیم کی جو تعلیم ہے وہ دنیا میں بے نظیر ہے کہ عبدیت میں انتہائی محبوبیت و رفعت درج ہے۔

(د) دُعا آپ کے ابتدائی طرزِ عمل نے مسلمانانِ عالم کو سخت مُتوحّش اور مایوس کر دیا گویا آپ کے عہدِ حکومت میں رسولؐ کریم کی محبت اور تعظیم کے واسطے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بعد کو تشدّد گھٹنے لگا حکومت کا مسلک رُو بہ اصلاح معلوم ہوتا ہے گو رفتار سست ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ اس ارضِ مقدس کی خدمت گذاری آپ کے تفویض رہے تو ہمیں خدا سے امید ہے اور ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو رسولؐ کریم کی محبت و تعظیم سے سرشار کر دے کہ اتباع زندہ ہو جائے اور اتباع کی برکت سے توحیدِ نبوی کا رنگ چڑھ جائے...... اس کے بعد میں نے صَلٰوۃً تُنْجِیْنَا اور قرآنی دعا پڑھ کر تقریر ختم کر دی۔

یہ تقریر محض توفیقِ الٰہی کا کرشمہ تھی۔ اس کا چرچا بہت پھیلا۔ اور خاص و عام میں تعارف خوب ہوگیا۔ جدھر جاتے پہچان میں آتے۔ سب مصافحہ کرتے بوسے لیتے۔ مشہور بزرگ حضرت سید عبدالحی کتانی مشتاق ہوکر حرم شریف میں ملے اور فرمایا۔ تم نے تمام اسلامی ممالک کی طرف سے نیابت و وکالت کی ہے۔ میں نے عرض کیا حضرت! تقریر تو اردو میں تھی۔ لیکن عرب حضرات نے اس کا اس درجے لطف کس طرح لیا فرمایا کہ ایمان و اخلاص میں بجلی کا سا اثر ہے۔ تمہاری آواز اور لب و لہجہ سے حقانیت ٹپکتی تھی۔ دل لذّت اندوز ہو رہے تھے۔ یہ فیضان اختیاری نہیں ہے۔ فضلِ الٰہی ہے۔ حجّاج میں تو بفضلہ عام و خاص نے تقریر کی قدر کی لیکن لوگ اس ٹوہ میں تھے کہ حکومت نے اس تقریر کو کن کانوں سے سُنا۔ آیا کچھ ترشی یا تلخی تو پیدا نہیں ہوئی لیکن یہ بات صاف ہوگئی۔ دو ہی روز بعد پھر دوسری دعوت آئی اور اس کے ساتھ یہ تاکید کہ ضرور شرکت فرمائی جائے۔ اس دعوت کے بعد لوگوں کو اطمینان ہوگیا کہ تقریر سے شکر رنجی پیدا نہیں ہوئی۔

(اقتباس ص۹۳ تا ۱۰۱ مراط الحمید للبرنی حصہ دوم)

۲ مدارسِ مدینۂ طیبہ

مدینہ منورہ میں بچوں کے متعدد مدارس ہیں۔ مدارس اور بھی زیادہ کھل جاتے لیکن حکومت نے دینیات میں اپنے عقائد کا نصاب لازم کردیا ہے۔ جو لوگ اس نصاب کو قبول کرتے ہیں ان کے مدارس جاری ہیں۔ جن کو اس میں عُذر ہے ان کے مدارس بند ہوگئے۔ فی الحال مولانا سیّد احمد صاحب فیض آبادی (برادرِ بزرگ مولانا حسین احمد صاحب دیوبندی) کا مدرسہ بہت ترقی پر ہے (حرم نبویؐ کے قریب) یہ مدرسہ گویا دیوبند کی ایک شاخ ہے۔ چنانچہ اس تعلق کی یادگار میں مدرسہ کے سامنے لب سڑک مولسری کے پودے بھی وہاں سے لاکر

نصب کئے گئے ہیں کہ جو پھل وہاں آتے ہیں یہاں بھی آئیں۔ مدرسہ پر حکومت کی خاص عنایت ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ علمائے دیوبند میں اشاعت و تعلیم کا جو حوصلہ اور سلیقہ ہے اس کی مثال ہندوستان کے دیگر علماء میں کم نظر آتی ہے۔ البتہ عقائد کی بحث جدا ہے۔ یہ ایک قدیم بحث ہے نئی نہیں۔ مذہبی جماعتوں میں قدرتاً دیوبندیوں کا بڑا عروج ہے۔ حکومت سے گہرا ربط ضبط ہے۔ شیر و شکر کا معاملہ ہے۔ مولانا سید احمد صاحب سرگروہ ہیں (ص ۱۳۷ تا ۱۳۹)

(مکہ معظمہ کے شاہی جلسہ میں) کل دوران میں بعض ہندوستانی مولوی صاحبان بڑے فخر سے اور بے تکلفی سے ادھر اُدھر پھر رہے تھے گویا اپنا ہی مکان ہے اپنا ہی زمان ہے (ص۹۲ مراط الحمید جلد دوم للبرنی)

(۳) مقرّبین کے بارے میں افراط تفریط
(ا) رفعتِ انسانی اور شیطان

قرآن میں ہے۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (پ ۱) اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اسماء کا علم عطا فرمایا۔ اسماء میں اسماءِ الٰہیہ بھی ہیں اور اسماءِ کونیہ بھی۔ انسان ان اسماء کا مظہر ہے۔ ظہور کے مراتب ہیں۔ مدارج ہیں۔ انبیاء اور اولیاء میں ان کا ظہور بہ مراتب اعلیٰ ہے۔ اسی رفعتِ انسانی کا مشاہدہ کرکے ملائکہ نے حضرت آدم کو سجدہ کیا۔ شیطان نے سجدہ سے انکار کیا۔ جاہل کہتے ہیں کہ وہ موحّد تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو سجدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ غلط ہے۔ بلکہ اس نے کہا۔ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ (پ ۸) (میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے تو آگ سے بنایا اور اُسے مٹی سے) در اصل وہ رفعتِ انسانی سے انکار کر رہا تھا۔ اور آدم کے مقابلے میں اپنی رفعت ثابت کر رہا تھا۔ پس ہر وہ شخص جو مقامات

انسانی کی رفعت وعظمت کا انکار کرے، تم ہی بتاؤ کہ اس کے قلب پر رحمٰن کی تجلّی ہے یا شیطان کی۔؟

(ب) مغضوبین انسان کی فضیلت و کرامت کے تعلق سے شیطان دو حربے استعمال کراتا ہے۔ ایک تو یہ کہ انبیاءؑ اولیاء کی عظمت کا انکار کراتا ہے، جیسے آج کل کے مادہ پرست ہیں۔ معترضین میں بھی مادّیت کا ایک رنگ ہے۔ یہ انبیاءؑ اولیاء کی رفعت وعظمت کا انکار کرتے ہیں کہ وہ ان کی نظر میں گویا مٹی یا مٹی کے پتلے ہیں۔ ہیچ ہیں۔ مردہ ہیں۔ امانت، ولایت، خلافت کے خوبصورت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ کا دعویٰ تو نہیں کرتے لیکن بَشَرٌ مِّثْلُنَا کہتے ہیں۔ یعنی یہ ہماری طرح ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ بڑے بھائی ہیں۔ اتنا فرق تو تابع و متبوع کی ہمتوں میں ہونا عجب نہیں۔ لیکن باطنی طور پر ان کے قلوب پر اولیاء اللہ کی عظمت ایسی مسلّط رہتی ہے کہ وہ اس کو ہٹانے کے لئے اعتراض و توہین کے مرض میں ہر وقت مبتلا رہتے ہیں۔ اس طرح شیطان ان کو ان فیوض وبرکات سے محروم کر دیتا ہے جو انبیاءؑ اولیاء کے ربط، رفاقت، ادب وتوسل سے حاصل ہوتے ہیں۔

(ج) ضالّین اس کے برخلاف شیطان کا دوسرا حربہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کی رفعت وعظمت میں غلو اور مبالغہ کراتا ہے کہ غلو کرنے والے لوگ، بعض انسانوں کو خدا، خدا کا بیٹا، بی بی یا اوتار ماننے لگتے ہیں اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ بعض مرشدین بھی اس قسم کے غلو کا شکار ہیں۔ ان دو طبقوں میں سے ایک طبقہ مغضوبین کا ہے تو دوسرا ضالّین کا۔

یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا فرق ہے۔ یہودی تو موحّد ہیں حضرت موسیٰؑ کو پیغمبر مانتے ہیں۔ ان میں تھوڑے ہی ہیں جو حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔

لیکن ان کا بڑا قصور یہ ہے کہ عظمتِ انبیاء کے قائل نہیں۔ انبیاء اور محبوبانِ الٰہی کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ اس لئے وہ غضبِ الٰہی کے مستحق بنے۔ اس کے برخلاف عیسائی شرک تو کرتے ہیں لیکن محبوبانِ الٰہی سے محبت رکھتے ہیں۔ قرآن ان کو مومنین سے قریب کہتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰی۔ (٦/١٥) ــــ ترجمہ۔ (تو پائے گا عداوت میں سب سے زیادہ شدید مومنین کے لئے یہود ومشرکین کو اور سب سے نزدیک محبت میں مومنین کی ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں) حضرت عیسیٰؑ نے نزولِ قرآن سے پہلے کے نصاریٰ کے لئے مغفرت تک کی گنجائش بتائی کہ جناب باری میں عرض کریں گے۔ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (٧/٦)۔ اور اگر تو ان کو بخش دے تو زبردست حکمت والا ہے)۔ یہ دونوں افراط وتفریط میں مبتلا ہیں۔

(د) مومنین اور صراطِ مستقیم اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔ اس نے اپنی تمام مخلوق میں انسان کو سب سے بلند مرتبہ اور رفعت عطا فرمائی ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلعم کامل ترین انسان اور سارے عالم میں سب سے زیادہ مکرم ومعظم ہیں۔ آپ کی رفعت وعلو مرتبت کی کوئی انتہا نہیں۔ ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کھلے کھلے اپنے صفات کا مظہر بنایا کہ وہ جملہ عوالم کے لئے اسم رحمٰن کے مظہر ہیں یعنی رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ہیں تو مومنین کے حق میں اسماء رؤف و رحیم کے مظہر ہیں۔ یعنی بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ہیں اسم کریم کے مظہر ہیں یعنی رسولِ کریم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شان اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ہے۔ اور رسول اللہ

صفات، افعال، آثار میں اس کے کامل ترین مظہر ہیں۔ عبد ہیں ذاتاً غیر ہیں۔ یہی فرق سمجھنے کا ہے کہ کائنات میں سب سے زیادہ مکرم و معظم اور رحمت ہونے کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں فقیر ہیں یعنی کچھ بھی نہیں۔ حضور نے فرمایا۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ۔ آپ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقابل میں کچھ بھی نہیں ہیں یہ درست ہے اور یہ غیریت ہے۔ اور پھر اللہ کے فضل وعطا اور امانت سے سب کچھ ہیں، یہ بھی درست ہے۔ اور یہ قرب ہے۔ اقربیت ہے۔ عینیت ہے۔ لہٰذا ذاتاً کچھ نہیں۔ اور وجوداً اللہ کی عطا سے سب کچھ۔ یہ عبدیت ہے۔ یہی وہ ممتاز علم ہے جو دیگر ادیان کو کماحقہٗ نصیب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے الوہیت، وجوب و غنائے ذاتی کے سوا رسول اللہ کو جملہ صفات کا مظہر بنایا۔ قرآن عطا فرمایا۔ اور قرآن میں سب کچھ ہے۔ حتیٰ کہ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی سے سرفراز فرمایا جو عبد و رب کے درمیان خاص راز ہے کہ مقربین و ملائکہ کو بھی اس کا علم نہیں۔ اس کا ایمائی سمجھنے کو بھی حوصلہ چاہیئے۔

(۴) نام کی توحید

فرمایا۔ میں نے حج کے موقع پر سلطان بن سعود کے شاہی جلسہ میں بیان کیا تھا۔ توحید کی کنجی رسالت ہے۔ اور اتباعِ رسالت کی روح حُب و ادب و تعظیم نبوی ہیں۔ اسے شرک کہیں تو حقیقی توحید کیسے ملیگی۔

(ا) کاغذ کے پھول

ایسے لوگوں کی توحید کی مثال کاغذ کے پھولوں کی ہے کہ پھولوں کا دھوکا ہو۔ لیکن ڈالی پر کھلے ہوئے پھول کی بات کہاں آسکتی ہے کہ پھلتا، پھولتا اور چمن کو مہکاتا ہے۔ اسے بسائیں تو معطر ہو جائیں۔ اسی طرح یہ لوگ توحید اور حق پرستی کے نام سے خوشنما رنگین باتیں تو خوب کرتے ہیں۔ لیکن اس راست گوئی کے پردے میں ان کا منشاء

کچھ اور ہوتا ہے۔ یعنی مقربینِ الٰہی اور اولیاء اللہ کی تحقیر و توہین۔ اِن مطالب کے بیان کے سلسلے میں حضرت اکثر دو واقعات کا ذکر فرماتے تھے۔ ان دونوں واقعات کو حضرت فضیلت جنگ انوار اللہ شاہ رحؒ نے اپنی کتاب انوارِ احمدی (صفحہ ۲۸۹ تا ۲۹۰) میں تحقیق سے بیان کیا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(ب) مُعترضین

رسول اللہ کو اپنے اوپر قیاس کرکے تعریض و اعتراض کرنے کی ابتدا خود عہدِ نبوی سے ہو چکی تھی۔ چنانچہ ذو الخویصرہ کے بارے میں جو نجد کے قبیلۂ بنو تمیم سے تھا (جس سے عبد الوہاب نجدی صاحب کا بھی تعلق سمجھا جاتا ہے) بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضؓ نے فرمایا کہ ایک موقع پر ہم لوگ رسول اللہ کے پاس حاضر تھے۔ اور حضور کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور کہا یا رسول اللہ! عدل کیجئے۔ آپ نے عدل نہیں کیا۔ حضرت نے فرمایا تیرے لئے خرابی ہو۔ جب میں ہی عدل نہ کروں تو کون عدل کریگا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ اجازت ہو تو میں اس کی گردن اُڑا دوں۔ حضور نے فرمایا۔ اسے چھوڑ دو۔ اس کے رُفقاء ایسے لوگ ہونگے کہ ان کی نمازوں، روزوں کے مقابلے میں تم لوگ اپنی نمازوں، روزوں کو حقیر سمجھوگے۔ وہ قرآن پڑھیں گے لیکن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُتریگا۔ وہ دین سے ایسے نکل جائینگے جیسے تیر شکار سے صاف گزر جاتا ہے۔ یہ ہمیشہ خروج کرتے رہیں گے۔

(ج) خارجی

اس کی ابتدا خارجیوں سے ہوئی۔ جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین عہد نامۂ صلح لکھا جانے لگا تو عروہ بن ادیہ تمیمی نے حضرت علیؓ سے کہا کہ اللہ کے معاملے میں آپ انسانوں کو حَکَم بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حَکَم نہیں بن سکتا۔ اس پر حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا کہ بات تو سچی ہے لیکن اس کا مقصود باطل ہے۔ اس اختلاف

پر جب عروہ اور اس کے ساتھی خارجیوں نے حضرت علیؓ کے خلاف خروج کیا تو حضرت علیؓ نے ان کے خلاف جہاد فرمایا۔ خارجیوں کے مقابلے کے لئے جب حضرت علیؓ نے فوج بھیجی تو حضرت جندب نے خارجیوں کی نماز، روزہ قرآن خوانی اور عبادت گذاری دیکھ کر ان سے لڑنے میں پس و پیش کیا لیکن حضرت علیؓ کے ارشاد سے آپ پر خارجیوں کی گمراہی واضح ہو گئی اور آپ نے ان سے جنگ فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی بیان ہے کہ ایسے زاہد عابد میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ ریاضات و عبادات سے اور زیادہ جاگنے سے ان کے چہروں پر خشکی نظر آتی اور ہاتھ پاؤں مضمحل۔ اگر یہ لوگ حضرت علیؓ کے مقابلے میں نہ آتے تو بادی النظر میں اولیاء اللہ سمجھے جاتے۔ اور ان کے مخالفین کو نہ معلوم لوگ کیا سمجھتے۔

(۵) تعظیم شعائر اللہ، تکریم مقربین

(۱) ادب کی اہمیت

قرآن شریف میں ادب و تعظیم نبویؐ پر بے انتہا زور دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ...... اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۲۶/۱۳) یعنی اگر تم نبی صلعم کی آواز سے اپنی آواز بلند کرو گے تو تمہارے سارے اعمال حبط ہو جائیں گے اور تم کو خبر بھی نہ ہوگی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوبانِ الٰہی کے ادب میں ذرا سی کوتاہی پر غیرتِ الٰہی کس درجے جوش میں آتی ہے۔ اور یہ کہ کتنا اعلیٰ معیارِ ادب مطلوب ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (۲۶/۹) (یعنی تم اس رسولؐ کی مدد کرو اور ادب رکھو)

(ب) اولیاء اللہ کی شان

اولیاء اللہ کی شان یہ بتائی گئی ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۲۶/۱۴) اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ

اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۱/۱۲) یعنی اللہ کے پاس تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ اولیاء اللہ کو خوف و حزن نہیں ہوتا۔ ایمان اور تقویٰ ان کا شعار ہوتا ہے۔ اُن کے لئے دنیا اور آخرت میں بشارتیں ہوتی ہیں۔ یہی سب سے عظیم کامیابی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ اولیاء اللہ کو لوگ اس حقیقی معیارِ قرآنی کے بجائے اپنے مقرر کردہ خیالی معیار سے جانچتے ہیں۔ اور جاہل لوگ صرف ان کو اولیاء اللہ مانتے ہیں جو کشف و کرامات اور کمالات دکھاتے ہیں یا دل کی بات بتاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے پاس جا کر دولت، صحت اور اولاد کے لئے دعائیں کراتے ہیں۔ حالانکہ یہ کرامت نہیں بلکہ استدراج ہوتا ہے اولیاء اللہ کی شان کچھ اور ہی ہے۔ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے قرب سے ہے۔ اولیاء اللہ کی مرتبت و عظمت کہ یہ کتنے بڑے شعائر اللہ ہیں۔ حسب ذیل قرآنی مثالوں سے واضح ہوگی۔

"قرآن نے صفا، مروہ مقامات اور قربانی کے جانوروں تک کو شعائر اللہ قرار دیا۔ یوں تو سب خدا کی مخلوق برابر ہے لیکن وہ بھی کیا نسبت ہوگی کہ اوقات، مقامات و حیوانات کو شعائر اللہ بنا دے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (۱۷/۱۱) شعائر اللہ کی تعظیم کرنے سے تطہیر قلب جیسی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ راز صرف اس

قدر ہے کہ وہاں کوئی خاص نسبتِ الٰہی ثابت ہے۔ ورنہ وہ شئے بذاتہٖ خود مخلوقِ محض ہے۔ بے حقیقت ہے۔ نسبت کا راز بہت دقیق ہے اللہ سمجھائے تاکہ حفظِ مراتب کی فہم وتمیز حاصل ہو۔ ورنہ ایک طرف انکار ہے تو دوسری طرف بھی شرک تیار ہے۔

(ج) مقامِ ابراہیم۔ حجرِ اسود کعبہ شریف میں مقامِ ابراہیم ایک پتھر ہے۔ جس پر حضرت ابراہیمؑ کا نقشِ قدم بھی نمایاں ہے۔ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيمَ مُصَلًّى (پ۱) یعنی پکڑو تم مقامِ ابراہیم کو جائے نماز۔

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

حجرِ اسود بھی ایک متبرک پتھر ہے۔ اس سے بڑھکر اور کیا تبریک ہوگی کہ خود حضورِ انورؐ صلعم اسے بوسہ دیتے تھے۔ لیکن اسلام نے تبرک اور تعبّد میں زمین اور آسمان کا فرق رکھا ہے۔ دیگر مذاہب میں یہ دونوں اعتبار مخلوط ہوگئے اور گمراہی پھیلی۔ چنانچہ اس فرق کو مشتہر کرنے کی غرض سے ایک مرتبہ حُجاج کے روبرو حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ نے حجرِ اسود کو مخاطب کر کے فرمایا۔ (بخاری شریف) "بے شک میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے۔ نہ کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اگر میں نے رسول اللہ کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا"۔ سبحان اللہ کیا توحید ہے۔ کیا اتباع ہے۔ کیا تعشق ہے کیا تبرک ہے۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آثار پرستی کا گمان ہوتا ہے۔ ایمان متزلزل رہتا ہے۔ بردِ قلبی حاصل نہیں ہوتا۔ عبادات محض رسم بن کر رہ جاتی ہیں۔ روح نہیں آتی۔ چنانچہ صراط الحمید للبرنی حصہ اول صـ۲۲۴ـ

صـ۲۲۵ پر اس کا خلاصہ ملاحظہ ہو۔

(د) خلاصہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ اصلِ دین ہے انبیاءؑ اولیاءِ دین کے معلّم ہیں۔ اور گو وہ بذاتِ خود سراسر مخلوق ہیں۔ عبد ہیں۔ لیکن اللہ کے نزدیک بے حد مقرب ہیں۔ مقبول ہیں۔ ان کی دُعائیں مقبول ہیں۔ ان کے کام مقبول ہیں۔ ان کے آثار مقبول ہیں۔ ان کی اتباع مقبول ہے۔ ان کی تعظیم و توقیر واجب ہے۔ ان کا احترام لازم ہے۔ اور چونکہ سب کچھ مرضیِ الٰہی کے مطابق اور سراسر تحت امر ہے۔ توحید کے تابع ہے۔ شرک سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ علمِ قرآنی عطا فرمائے جو افراط و تفریط سے پاک ہے۔ صراطِ مستقیم کا رہنما ہے کہ وہی طریقِ اسلام ہے۔

(٦) جمعِ طاعتیں قرآن کے لحاظ سے عبدیت میں اتنی رفعت و قوت ہے کہ بیمار کو اچھا کرتا ہے اور مُردہ کو زندہ کرتا ہے۔ اسی لئے حضرت غوث اعظمؓ فرماتے ہیں میں محی الدین ہوں۔ عبدالقادر ہوں۔ اللہ کے سب ملک میرے حکم کے تابع ہیں۔ بِلَادُ اللّٰهِ مُلْكِي تَحْتَ حُكْمِي۔ راز یہ ہے کہ اپنی رضا کو مرضیِ الٰہی کے تابع کرنے کے بعد ہر چیز بندہ کو عطا ہوتی ہے۔ حکومت کا یہ حال ہوتا ہے کہ قرآن میں اپنے حبیبؐ کے متعلق ارشاد ہے۔ اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ (پ۵) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (پ۵) یعنی اللہ رسول کی اطاعت کرو۔ جس نے رسول کی اطاعت کی، تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ مذکورۂ بالا اسماء اور مندرجہ بالا اطاعتوں میں ظہورِ صفات اور

جمع طاعتیں کو ظاہر کیا گیا ہے لیکن بعض کج فہموں کو اس صریح قرآنی توحید میں شرک نظر آتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق تنبیہ ہے! اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ....... اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکَافِرُوْنَ حَقًّا (۶)

اللہ تعالیٰ اطاعتِ رسولؐ کی توفیق عطا فرمائے جو عین توحید ہے۔

(۷) غلو کا ردِّ عمل

آج کل نوجوانوں میں وہابیت کا فتنہ پھیل رہا ہے جس کی ذمہ داری بڑی حد تک ایسے مرشدین پر ہے جن کے افراط کا یہ ردِّ عمل ہے۔ ان میں سے بعض نرے جاہل، خود بین، خود پسند، خود ستا، تنگ نظر، تنگ دل بلکہ مغالطہ پسند ہوتے ہیں۔ ان کے پاس مرید سازی، مرید بازی کا لزوم ہے۔ تمتّع، تعزّز، شہرت طلبی، بزرگی کے لوازم ہیں۔ مریدوں کو ان کی صحبت سے فائدہ ہونا تو کجا، اُلٹا یہی مریدوں کی صحبت سے تمتّع حاصل کرتے ہیں۔ توحید کی اصل پرکھ معاملات میں ہے کہ بندہ غیر اللہ کے خوف کے بغیر، اللہ کے بھروسہ پر معاملات میں قوت دکھائے لیکن ان کے معاملات صاف نہیں ہوتے۔ یہ تمتّع کرتے ہیں سجدے کراتے ہیں۔ جس کا قدرتی نتیجہ تفریط ہوتا ہے۔ جس وقت عبد الوہاب نجدی صاحب نے تحریکِ وہابیت شروع کی ہے، مکہ، مدینہ میں بعض مشائخ اپنے کو سجدے کرلتے تھے۔ اور عورتیں غیر مسلموں کا ناچ ناچتی تھیں۔ جس کے ردِّ عمل میں یہ تحریک شروع ہوئی۔ آج کل ان پیروں کا شور و غوغا ان معترضین کے خلاف، محض اپنے مفاداتِ حاصلہ کے تحفظ کے لئے ہے۔ ورنہ اگر ان کو کھانے کو ملتا رہے تو غالباً یہ دین کی تباہی کی فکر نہ کریں۔ میرا مطالعہ اور مشاہدہ ہے کہ معترضین اسباب میں سب سے

زیادہ مبتلا رہتے ہیں۔ ان کو اولیاء اللہ سے استعانت میں شرک نظر آتا ہے لیکن وہ خود رات دن عہدہ داروں، دُنیا داروں سے استعانت کرتے رہتے ہیں تو انھیں اس میں شرک نظر نہیں آتا۔ حالانکہ علم و عمل کے ہر مقام پر علمِ توحید کو کارفرما ہونا چاہیئے۔ جب اُنھیں انبیاء، اولیاء میں رفعت و عظمت کے بجائے ذلت، پستی اور بے بسی نظر آتی ہے، تو کیوں وہ اسی ذلت و بے بسی کو ان عہدہ داروں میں نہیں دیکھتے۔ یہاں اقتضائے بشری کی آڑ کیوں لیتے ہیں۔ ان کے اس استدلال و عمل سے یہ لازم آتا ہے کہ جب اس علم سے عہدہ داروں سے استعانت کی جاسکتی ہے تو ان کی عبادت بھی کی جاسکتی ہے۔ یہ پیچیدگی یوں واقع ہوتی ہے کہ وہ تعبّد و تعظیم میں فرق نہیں جانتے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا مطلب نہیں سمجھتے کہ کس طرح منشائے الٰہی کے تحت سارے عالم سے استعانت و استفاضہ کرنے کے باوجود شرک واقع نہیں ہوتا۔ اور توحید حاصل رہتی ہے اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں فرق نہیں آتا۔

(۸) سجدے کے احکام

بعض لوگ کسی مسلمان کو کسی بزرگ کے مزار کا سجدہ کرتے یا قدم بوسی کرتے دیکھتے ہیں تو اس عمل پر شرک کا حکم لگا دیتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ بہت نازک بحث ہے۔ قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی اُمتوں میں بزرگوں کو سجدہ جائز تھا۔ اور یہ عمل حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ کے زمانے تک جائز رہا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا (اعراف) ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو پس انھوں

نے سجدہ کیا) سورۂ یوسف میں ارشاد ہے۔ وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (یعنی حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو اُٹھا کر تخت پر بٹھا لیا اور وہ سب حضرت یوسفؑ کے آگے سجدے میں گر پڑے) ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جس عمل کا حکم دیا ہو اور ایک نبیؑ اور اس کی اولاد نے جو عمل کیا ہو، وہ عمل ہرگز شرک نہیں ہو سکتا۔

اب رہا اُمّتِ محمدیہ میں سجدہ کا حکم۔ تو اس بارے میں حدیث ہے حضور نے فرمایا۔ اگر میں کسی کو یہ حکم دیتا کہ کسی دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے کہ شوہر کا اس پر بہت بڑا حق ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں سورۂ یوسف کے بیان میں ایک حدیث منقول ہے۔ حضرت سلمانؓ مدینے کے ایک راستے میں حضور سے ملے۔ انھیں اسلام لائے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا۔ انھوں نے حضورؐ کو سجدہ کیا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اے سلمان۔ مجھے سجدہ مت کرو۔ اور اس ذاتِ حی (اللہ) کو سجدہ کرو جسے موت نہیں۔

لیکن بعض اکابر کا مسلک یہ ہے کہ جن احادیث سے غیر اُللہ کو سجدہ کرنے کی حُرمت کا استدلال کیا جاتا ہے اُن کی نوعیت خبرِ آحاد کی ہے جو موجبِ ظن ہے۔ اور قرآن مجید میں مقربین کو سجدۂ تعظیم و تکریم کا بیان استحباب کے ساتھ آیا ہے جو موجبِ یقین ہے۔ اس لئے ان اخبارِ آحاد کی بناء پر غیر اللہ کو سجدۂ تعظیمی کی حرمت پر استدلال کرنا درست نہیں۔ ان کے نزدیک سجدۂ تعظیمی جائز ہے۔

بہرحال اُمّت کے سَوادِ اعظم کا مسلک یہ ہے کہ غیرُ اللہ کو سجدہ حرام ہے لیکن اس حکم کا بھی صرف یہ اثر ہوگا کہ اگر کوئی کسی کو سجدۂ تعظیمی کرے

تو وہ ایک فعلِ حرام کا مرتکب قرار دیا جائے گا یعنی فسق کا۔ نہ کہ شرک و کفر کا۔ شرک کا تعلق تو عقیدہ سے ہے کہ اگر کوئی کسی غیر اللہ کو الٰہ و معبود جانے، مانے تو وہ مشرک ہوگا۔ خواہ اس غیرُ اللہ کو سجدہ کرے یا نہ کرے۔ لیکن اگر اس کا عمل شرک کا نہ ہو اور محض تحیّۃ و تعظیم کی نیت سے سجدہ کرے تو اس پر کسی طرح شرک کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ احکام میں جس عمل کو حرام کہا گیا ہے اُسے حرام کہنا چاہیئے۔ اُسے شرک کہنا اپنی ذہنی اختراع ہے بدعت ہے اور زیادتی ہے اور احکام و منشائے قرآنی کے خلاف ہے۔

عبدیت ہنسی کھیل نہیں۔ بہت نازک مقام ہے۔

(۹) ولایت و رسالت کا فہم

معترضین عبد کی بے بسی پر حکم لگاتے ہیں۔ اس کی قدرت و اختیار کے رُخ کو نہیں دیکھتے جو اللہ نے عطا کیا ہے۔ اولیاء اللہ پر کن حکمتوں کے تحت کیا مصیبتیں گزرتی ہیں، اس کا ان لوگوں کو علم نہیں۔ ان پر بے ادبی کی ایسی مار ہے کہ اولیاء اللہ کو کیا سمجھیں گے جبکہ وہ رسول اللہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ یاد رکھو جب تک رسولؐ اللہ سمجھ میں نہ آئیں، اللہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اللہ کو سوائے رسولؐ اللہ کے کسی نے نہیں سمجھا۔ جب ہم رسولؐ اللہ کو سمجھیں گے تو اُن سے ہم کو اللہ کی سمجھ عطا ہوگی یہ قدرتی راستہ ہے۔ رسالت کی یافت اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہے علیٰ قدرِ مراتب بعض لوگ اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن رسولؐ اللہ سے کد رکھتے ہیں حضورؐ کے مراتب سے محض اس لئے انکار کرتے ہیں کہ کہیں اُن کی توحید میں فرق نہ آئے حالانکہ رسالت کے صحیح ربط کے بغیر اُنھیں توحید نصیب ہو ہی نہیں سکتی۔ اس بے توفیقی کے باوجود وہ ہم سے کہتے ہیں کہ قرآن سے نازک اعتبارات

سمجھاؤ۔ ہم اُن خاص نعمتوں کو جو مقربین کے لئے مختص ہیں کیسے سمجھائیں۔ یہ بے ادبی کی وجہ سے اہل نہیں اور نہ اِن کا شرح صدر ہو سکتا ہے۔ اگر وہ تسلیم نہ کریں تو نعمت کی ناقدری کی وجہ سے ان پر مار پڑے گی اور ہم پر ذمہ داری آئے گی۔ لہٰذا اِس نہ کہنے میں بخل نہیں حکمت ہے۔

(۱۰) طریقِ اِجتبیٰ و اِنابت

اللہ کی طرف بڑھنے کے دو طریق ہیں، ایک اجتبیٰ دوسرا انابت۔ پہلے میں اُدھر سے کشش ہے۔ دوسرے میں اِدھر سے دوا دوش ہے۔ اِجتبیٰ والوں کا کیا کہنا کہ طلبیدہ جاتے ہیں۔ البتہ اِنابت والوں کو زیادہ مجاہدہ درکار ہے۔ قرآنا مجاہدے میں ایمان و تقویٰ کے ساتھ وسیلہ بڑی چیز ہے جو اللہ کے واسطے مجاہدہ کرتا ہے اسے اللہ کا راستہ ملتا ہے۔

علمِ ولایت کے حصول کا ذریعہ محبت ہے۔ محبتِ الٰہی دو طریق سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک اجتبیٰ سے یعنی اللہ کی طرف سے بلا واسطہ محبت و کشش کے ذریعے، یا شیخِ کامل مکمل کی تاثیرِ نفس کے واسطے سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا طریق اِنابت ہے جسے سلوک کہتے ہیں۔ صحبتِ شیخ قوی طریقِ وصول الی اللہ ہے۔ بقول حضرت مجددؒ، اِنابت و ارادت راہِ مُریدان ہے۔ اور اجتبیٰ راہِ مُراداں ہے۔ ریاضات و مجاہدات راہِ انابت کے لئے شرط ہیں۔ لیکن راہِ اجتبیٰ میں مجاہدات کی شرط نہیں، البتہ مفید ہیں (مکتوب ۶ جلد سوم)۔

اللہ ہے، محمدؐ ہے، قرآن ہے۔ اِنھیں کے ماننے نہ ماننے سے سارے فرق (مُقرّب، مومن، کافر، مُشرک، منافق، مُرتد) بن رہے ہیں۔ علمی

سلوک انیت (میں پن) کو دُور کرتا ہے اور اپنی حقیقت کھل جاتی ہے کہ ہم تعین کے سوا کچھ نہیں۔ ہم وجود و انا سے عاری ہیں۔ البتہ دو انگل کی لنگوٹی سے لے کر ہزاروں لباس اُس کی عطا ہیں وبس۔ لاکھ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ صحیح۔ لیکن اپنی حقیقت تعین ہے اور ہماری ذات معلوم ہے۔ لہٰذا وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کو کبھی نہ بھولیں۔ جو لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں وہ زندقہ و الحاد میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے کو خدا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ ھُوَ الْبَاطِنُ کے ساتھ ھُوَ الظَّاھِرُ کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ جس میں رحمٰن کا حق ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن رحمانیت کے تحت کفار و منافقین کو اُن کے اقتضاءاتِ باطلہ کے اظہار کے لئے ڈھیل دی جاتی ہے۔ غلبہ دیا جاتا ہے۔ اور مومنین و مقربین پر شدائد گذر جاتے ہیں۔ اسم اعظم کے حصول اور مقام کُن پر فائز ہونے کے باوجود بڑے بڑے غوث، اقطاب دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ وہ حکمت کے تحت مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ استقامت دکھاتے ہیں۔ عشق و محبت کا حق ادا کرتے ہیں۔ اس راز سے صرف عارفین واقف رہتے ہیں جو اجتبیٰ کے مقام پر فائز رہتے ہیں۔ اسی رحمانیت کو نہ سمجھ کر اچھے اچھے چکر کھاتے ہیں۔ اور کفر، الحاد، شرک میں گر کر کہتے ہیں کہ دیکھ لیا۔ کچھ نہیں ہے۔

ایک بادشاہ کا ذکر ہے کہ اس کا جلوس گذر رہا تھا۔ ایک شاہ صاحب تماشائیوں میں کھڑے دھکے کھا رہے تھے۔ بادشاہ نے اِن شاہ صاحب کو چھیڑ چھاڑ کے لئے بلوایا۔ کوتوال فوراً آیا اور اعزاز کے ساتھ انھیں لے گیا۔ بادشاہ نے اِجتبیٰ کے متعلق سوال کیا کہ محنت و مجاہدہ کے بغیر ولایت کے اعلیٰ مقامات کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے جواب میں کہا۔ کیا اب بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اِن سب وزیروں عہدہ داروں

کو آپ کے پاس کسب و محنت سے باریابی حاصل ہے۔ یہ سب انابت کے مقام پر ہیں۔ اور میں یہاں کوشش کے بغیر، شاہی دعوت پر، اجتبیٰ کے تحت دربارِ قرب میں بلایا گیا ہوں۔ اب بادشاہ بھی نہیں پوچھ سکتا کہ میں کیوں یہاں آیا۔ وَاللّٰہُ یَجْتَبِیْۤ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَہْدِیْۤ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ (۴۲/۱۳) یعنی اللہ جسے چاہے رحمت سے کھینچ کر اپنے پاس بلاتا ہے۔ اور جو کوشش کر کے رجوع ہوتا ہے جھکتا ہے تو اس کو اپنی طرف ہدایت نصیب کرتا ہے۔

(۱۱) اُجرت والے۔ انعام والے

دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک اُجرت والے۔ دوسرے انعام والے انابت کی راہ اُجرت کی ہے۔ اور اجتبیٰ کی راہ انعام کی ہے۔ اکثر لوگ کھاتہ کھولتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے لیکن محدود معاوضہ ملتا ہے۔ ہر عمل کا بدلہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک شخص سب کچھ کر کے لادعویٰ رہتا ہے۔ کہتا ہے۔ مجھ سے جو بن سکا کیا۔ لیکن سرکار سے جو ملتا ہے مالک کا احسان ہے، اس کے بعد کریم اُسے بے حساب دیگا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ بعض سونے والے، کھانے والے، رات کے عبادت گذاروں، دن کے روزہ داروں سے بہتر ہونگے۔

یہی حال علم کے میدان میں بھی ہے۔ بعض لوگ علم کی پوٹلیاں بنا کر "انیت" (میں پن) دکھاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن تک کے متعلق ارشاد ہے وحی کی حفاظت میں عجلت نہ کرو۔ ہم وقت پر تازہ علم و بیان دیں گے۔ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ الخ (۲۰/۱۱۴) اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (۷۵/۱۹) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹) در اصل اپنے مقامِ

جہل کا ادراک رکھنا اور علیم کی طرف متوجہ رہنا علم کی گٹھڑیوں پر غرہ سے بہتر ہے۔ یہ نکتہ سمجھ میں آئے تو علم کے دریا بہیں گے۔ اگرچہ بظاہر اس کے پاس کچھ نہ ہو گا۔ لیکن وقت پر منّ اللّٰہ علوم کے خزانے کھلیں گے۔

(۱۲) شَفَاعَت

قرآن میں کئی جگہ شفاعت بالاذن کا ذکر ہے لیکن مُعرضین شفاعت کو نہیں مانتے۔ آخر ان الفاظ کا مرجع (ماذون) تو ہو گا۔ اگر کوئی ہو گا تو بدرجۂ اولیٰ انبیاء، اولیاء ہوں گے کہ دوست اور مقرب کی شفاعت ہی مقبول ہوتی ہے۔ اور خاتم النبیین صلعم کو تو شفیعِ اعظم ہونا چاہیئے۔ نص اور قرینہ یہی کہتے ہیں۔

(۱۳) وسیلہ کا ادب

دین میں ایمان اور وسیلہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ایمان کی مثال شہ رگ کی اور وسیلہ کی مثال قلب کی ہے۔ اگر قلب میں قوت ہو یعنی وسیلہ و ربط قوی ہو تو ڈاکٹر آپریشن کر سکتا ہے۔ صحت و قوت کی امید ہو سکتی ہے۔ ورنہ نہیں ان دونوں کو سنبھالنا ضروری ہے۔

جہاں جلی معصیت ہو اور سخت تعزیری احکام موجود ہوں وہاں انبیاء اولیاء کا واسطہ دے کر تائید کے لئے دُعا کرنا سخت بے ادبی ہے مار پڑنے کی بات ہے۔ اگر ہم نے گناہ کے جلی ہونے کے بارے میں اپنی لاعلمی کی بناء پر واسطہ دیا تھا تو معذرت کرنا چاہیئے۔ اس قسم کا واسطہ دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بیت الخلاء میں نماز پڑھے خصوصًا حضور انورؐ اور اہلبیت کے معاملے میں بہت احتیاط و ادب لازم ہے۔ البتہ عام طور پر گناہوں کی معافی کے لئے یا مظلومیت کی حالت میں تائید کے لئے واسطہ پیش کرنا جائز ہے۔ اسی لئے قرآن نے وسیلہ، واسطہ چاہنے والوں کے لئے

اولین شرط ایمان و تقویٰ رکھنا ہے۔ نہ کہ جلی معاصی پر وسیلہ سے تائید حاصل کی جائے۔ حکم ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ (۶) واسطہ کو کھیل تماشا نہ بنائیں۔ بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔ البتہ جلی معاصی میں ابتلا پیش آجائے تو استغفار کرتے رہیں۔

(۱۴) ادبِ رسولؐ

بعض لوگ پیارے محمدؐ کہتے ہیں جو نامناسب ہے۔ ہمارے پاس ادب محبت پر مقدم ہے۔ حضورؐ کے سامنے مارے خوف کے بڑے بڑے غوث اقطاب کے پتے پانی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار محبت کے غلو میں کہہ جانا اور بات ہے۔ نہ یہ کہ ہمیشہ کہتے رہیں۔

(۱۵) نواب احمد نواز جنگ مرحوم کا ربطِ رسالت

نواب احمد نواز جنگ کی فاتحہ۔

سوم کے دن ڈاکٹر مقبول علی صاحب سے فرمایا۔ علاؤالدین صاحب کے عام اخلاق بہت خوب تھے۔ اسماعیلیہ فرقے کے وہ برائے نام رکن تھے۔ اُن کے عقائد سُنیوں جیسے تھے۔ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے، ملتے جلتے۔ بڑی چیز یہ کہ ان کا ربطِ رسول اللہؐ کے ساتھ اچھا تھا۔ اصل چیز قلب ہے محض رگ پٹھے اچھے ہوں تو آدمی کام کا نہیں جب تک اس کا قلب اچھا نہ ہو۔ رسالت اور مدینے کے ساتھ ربط اچھا ہو۔ اور یہ بات علاؤالدین صاحب میں تھی۔ مرد ہونا شرط ہے۔ بعد کو توازن نہ بھی ہو تو کام چلتا ہے۔ ربطِ رسالت مردانگی ہے۔ رہا گناہ، اس کے لئے توبہ ہے۔ وہ تو ابتدا ہی سے ہے۔ حضرت آدمؑ سے لغزش ہوئی۔ توبہ کی۔ گناہ بھی کیا رحمت ثابت ہوا کہ مرحوم و مغفور ہوئے۔ انھیں کی اولاد میں حضور رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَؐ

کا ظہور ہوا۔ انسان کی عظمت اسی میں ہے جس کو ملائکہ تک نہ سمجھ سکے یہ مظہرِ جلال و جمال ہے۔ اِدھر شیطان گھبراتا ہے۔ اُدھر فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ نے اسے علمِ اسماء دیا اور ظلوم و جہول کہہ کر شاباشی دی۔ ملائکہ پر سجدہ واجب ہوا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا سُبْحَانِیْ مَآ اَعْظَمَ شَاْنِیْ بھی تو ہے۔ فرمایا۔ سبحانی کہنا کمال نہیں کمال تو عبدیت کے اظہار میں ہے کہ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ (۱۵/۱) قرآن ہے۔

(۱۶) مسلمانوں کی مشکلات کا واحد حل

مسلمانوں کے موجودہ مشکلات کے حل کے متعلق عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ گویا سائنٹیفک تعلیم، فراوانیِ دولت و ثروت و کثرتِ تعداد کے ذریعہ ہماری مشکلیں دور ہو جائیں گی۔ لیکن قرآنی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ اور حضورؐ اور صحابہ کی عملی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ کس طرح دنیوی وسائل کی کمی اور قلتِ تعداد کے باوجود، اور علوم و فنون اور تعلیم ظاہری کے بغیر مسلمانوں نے دس برس کے قلیل عرصے میں علمِ صحیح اور نسبتِ رسالت و اتباعِ رسولؐ کے ذریعے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ کر دنیا میں اپنی عظمت و جلالت کا ایسا سکہ بٹھا دیا کہ آج دنیا حیران ہے۔ درحقیقت اب بھی ہماری ساری مشکلات کا حل رسالت کے زندہ قوی ربط میں مضمر ہے۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ اسلام دماغی علوم اور اسبابِ ظاہری کا مخالف ہے۔ بلکہ اس کا امتیازی معیار قلبی و روحانی ترقی ہے۔ اور صحابہ کی ایمانی زندگی اس کا آئینہ تھی۔ چنانچہ صراط الحمید حصہ دوم ص۱۰۱ پر حضرت تحریر فرماتے ہیں:- "عالمِ اسلام میں جو انحطاط پھیل گیا ہے اس کے رفع کرنے کی تدابیر تو بے شمار ہیں لیکن سب تدبیروں کی

ایک تدبیر ہے۔ وہ اختیار کی جائے تو سب تدبیریں کام آئیں۔ اور سب بگڑے کام بن جائیں۔ تنِ مردہ میں جان پڑ جائے۔ وہ تدبیر یہ کہ مسلمانوں کے دلوں میں رسول اللہ کی محبت و عظمت زندہ ہو جائے تو ان کو توحید کا نشہ آئے۔ عبدیت کا پتہ چل جائے تو امانت و خلافت کا حوصلہ آئے۔ غرض کہ ربطِ رسالت قوی ہو تو دنیا۔ دین۔ اللہ سب کچھ مل جائے ——
بحالتِ موجودہ رسالت کا ربط ضعیف ہے۔ رسمی ہے۔ روایتی ہے۔ تاریخی ہے۔ دل سے تعلق بہت کم ہے نتیجہ یہ کہ توحید بھی ضعیف ہو گئی۔ قولی ہے خیالی ہے۔ استدلالی ہے۔ ایمانی توحید جو رسالت سے ملتی ہے اس کا زور کہاں۔ جب رسالت سے ربط نہیں، توحید میں جان نہیں تو پھر دین و دنیا میں اسلام کا فیضان کہاں سے آئے جو کچھ میسر ہے اللہ کا رحم و کرم ہے۔ لیکن اس کے فضل سے بہت کچھ امید ہے قرآن موجود ہے محفوظ ہے رسول اللہ سے اللہ ملے تو پھر سب کچھ اپنا ہے"۔

(۱۷) محبتِ نبوی ﷺ

جلسہ میلاد النبی سنہ ۱۳۴۸ھ منعقدہ حیدر آباد میں

(۱) محبت کے مراتب

فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک نہایت قیمتی فطری جذبہ رکھا ہے جس کا نام محبت ہے۔
اس کا خاصہ یہ ہے کہ جس سے متعلق ہو جائے بس اس کی دھن بن جاتی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں سوجھتا اسی کے تصور، تذکرے اور تلاش میں انسان لگا رہتا ہے۔ اس کا تعلق ادنیٰ چیزوں (زن، زر، زمین وغیرہ) سے وابستہ ہو تو ادنیٰ محبت سمجھی جاتی ہے اگر اس کا رخ اعلیٰ (اللہ، رسول اللہ، اولیاء اللہ) کی طرف ہو تو اعلیٰ محبت شمار ہوتی ہے مختصر یہ کہ جتنا محبوب اعلیٰ ہو اتنی محبت عالی اور اسی نسبت سے محب اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔

(ب) محبت کے محل

جب محبت فطری ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا بہترین محل استعمال کیا ہو۔ کس سے محبت کی جائے اور کیوں کی جائے۔ اگر ہم انسانی فطرت و نفسیات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان تین چیزوں سے محبت کرنے پر فطرتاً مجبور ہے (۱) حسن و جمال (۲) فضل و کمال (۳) بذل و نوال۔
اگر کسی حسین مہ جبین کا سامنا ہو جائے تو نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ اگر معلوم ہو کہ ایک بہت بڑا صاحب فضل و کمال آیا ہے تو لوگ نہ صرف اس کے کمالات بلکہ خود اس کو دیکھنے کے لئے ہجوم کرتے ہیں چاہے وہ کالا پیلا ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی ہم پر کسی قسم کا احسان کرے۔ مثلاً ہم کو یا ہمارے بچوں کو ڈوبنے سے بچالے تو ہم اس محسن کے گرویدہ ہو جائیں گے۔
محبت اصل ہے۔ عظمت سمجھ میں آجائے اور محبت حاصل ہو جائے تو اتباع کی طرف دل بے اختیار مائل ہو جاتا ہے۔ لارڈ بائرن انگلستان کا مشہور شاعر تھا۔ اپنی شعر گوئی اور جادو بیانی کی وجہ سے مقبولِ خاص و عام تھا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم کہ انگریز نوجوان آئینے لے کر اس کی طرح چہرہ، بال اور لباس درست کرتے اور حرکات و سکنات میں اس کی اتباع کی کوشش کرتے۔

(ج) حضور کا حسن و جمال

اس نقطۂ نظر سے اگر ہم غور کریں تو حسن و جمال کے متعلق قرآن کہتا ہے! اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (۱۸/۱۱) نورِ محمدی کے متعلق ارشاد ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

نُوْرٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیْنٌ (۶/۱۵) یعنی اللہ کے پاس سے نور (محمدﷺ) آیا اور کتاب
مُبین بھی یعنی روشن بیان کرنے والی کتاب۔ چنانچہ حدیث ہے۔ اَنَا مِنْ
نُوْرِ اللّٰہِ وَالْخَلْقُ کُلُّھُمْ مِنْ نُّوْرِیْ (طبرانی) جب ہجرت کر کے آپ
مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے حُسن و جمال کو دیکھ کر مدینے کے بچے
بچیاں بے اختیار نغمہ زن ہوئیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا ۔۔ فَاخْتَفَتْ مِنْهُ الْبُدُوْرُ
مِثْلَ حُسْنِكَ مَا رَأَیْنَا ۔۔ قَطُّ یَا وَجْهَ السُّرُوْرِ

(۸) حضورؐ کا فضل و کمال

فضل و کمال پر غور کریں تو حضورؐ کی شان میں ارشاد ہے۔ اِنَّكَ لَعَلٰی
خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۲۹/۴) جس کی محبوبیت ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ
یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا
تَسْلِیْمًا (۲۲/۴) جس کی شہرت ہے۔ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۳۰/۱۹)
جس کی سیر ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ ......
لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (۱۵/۱) جس کا مشاہدہ ہے۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ
وَمَا طَغٰی لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی (۲۷/۱) جس
کا عروج ہے۔ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (۲۷/۵) جس کی اطاعت گذاری
ہے۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (۵/۵) جس کے افعال
ہیں۔ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (۹/۱۶) جس کے
آثار ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ
اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (۲۶/۹) جن کی انگلی کا اشارہ ہو تو اِنْشَقَّ الْقَمَرُ
(۲۷/۸) جس پر فیض و عطا کا یہ عالم کہ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ

فَتَرْضٰی (۳۰/۱۸) جس کے صفات ہیں۔ رَسُوْلٌ کَرِیْمٌ بِالْمُؤْمِنِیْنَ
رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ اور پھر جس کی ذات ہے۔ اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ
مَّیِّتُوْنَ (۲۳/۳)۔ وہ تو وہ ان کے خادموں کی یہ آن بان ہے۔
وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُتَّقُوْنَ۔ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۲۴/۱)

(۹) حضورؐ کا بذل و نوال

اسی طرح حضورؐ کے بذل و نوال لطف و احسان پر غور فرمائیے۔
ایک طرف اللہ تعالیٰ اپنی رحمتِ عام کا اس طرح ذکر فرماتا ہے۔ وَرَحْمَتِیْ
وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (۹/۹) دوسری طرف اپنے حبیبؐ کی رحمتِ عام کے
متعلق اعلان فرماتا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ
(۱/۷) غلامانِ محمدیؐ کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص کا حال یہ کہ کَانَ
بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا (۲/۲۲) اور حضور انورؐ کا اپنے غلاموں پر خصوصی
رحمت کا یہ عالم ہے کہ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ
رَّحِیْمٌ (۱۱/۵)

عجب ربط ہے۔ عجب فرق ہے۔ عجب عروج ہے۔ عجب نزول ہے۔
عجب توحید ہے۔ عجب رسالت ہے۔ عجب ہستی ہے عجب نیستی ہے۔
پھر لطف یہ کہ تضاد نہیں بلکہ لازم و ملزوم ہے۔ غرض بقول حضرت سعدیؒ

بَلَغَ الْعُلٰی بِكَمَالِهٖ ۞ كَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِهٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِهٖ ۞ صَلُّوْا عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ

اس خصوص میں درود ملاحظہ ہو۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ
عَلٰی قَدْرِ حُسْنِهٖ وَجَمَالِهٖ وَفَضْلِهٖ وَكَمَالِهٖ۔ وَ

بِذْلِهٖ وَ نَوَالِهٖ۔ وَ فَقْرِهٖ وَ سُؤَالِهٖ۔ وَ فَوْزِهٖ وَ مَالِهٖ۔
وَ عَلٰی اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ وَ بَارِكْ وَ سَلِّمْ (للرفی)

(و) اتباع کی جان، حُب و ادب

اس سے ثابت ہوا کہ جذبۂ محبت کا بہترین محل اللہ تعالیٰ اور اس کا محبوبؐ ہیں۔ چنانچہ حکم الٰہی ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۳/۳۱) (کہہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب بنالے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دیگا) لیکن واضح رہے کہ اتباع کی جان محبت و تعظیم اور ادبِ نبوی ہیں۔ جس کے نتیجے میں خود بخود اتباع کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ اتباع رسمی ہے صرف اتباع کی صورت ہے۔ جس ذاتِ گرامی کی اتباع کا ثمرہ محبوبیتِ الٰہی اور مغفرت و رحمت ہو تو اصل متبوعؐ کتنا محبوب ہوگا۔ انصاف شرط ہے۔ لہٰذا حضورِ انورؐ ہمارے لئے بہترین نمونۂ علم و عمل ہیں۔ ہر امر میں ہر وقت آپ متبوع ہیں (امامِ وقت ہیں) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۲۱/۲۱) آپ کی ہر ہر ادا پیاری ہے اور اس قدر پیاری ہے کہ کوئی اُس کی نقل اُتارتا ہے تو اس پر بھی پیار آتا ہے۔ اتباع کے تو بے شمار مدارج ہیں۔ صدیقین۔ شہداء۔ صالحین لیکن ادنیٰ سے ادنیٰ کو شرفِ غلامی نصیب ہوجائے تو صاف بشارت ہے۔ قُلْ یٰعِبَادِیَ...... لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (۳۹/۵۳) اس سلسلے میں حضرت کی ایک تحریر کا اقتباس درج ذیل ہے۔

دینِ اسلام کی بڑی نعمت توحید ہے۔ اور توحید کی کنجی رسالت ہے

اور رسالت کا سرتاج کون ہے؟ خاتم النبیین۔ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ۔ حضرت کی اتباع اور تعظیم و محبت، بس یہی رسائی اور دریافت کے ذریعے ہیں۔ تعظیم و محبت کے بغیر اتباع رسم ہی رسم ہے۔ اور اتباع کے بغیر تعظیم و محبت سراسر نامکمل بلکہ ناقص۔ لیکن یہ بخوبی روشن ہے کہ محبت ہی اصل محرّک ہے۔ تعظیم محبت کی مصلح ہے۔ اور اتباع دونو کا ماحصل۔ پس لازم ہے کہ مسلمان کا دل رسولِ کریم کی محبت و عظمت سے سرشار رہے۔ اس سے اتباع خود بخود مطلوب و محبوب ہوجائے گی۔ سبحان اللہ و بحمدہٖ۔

(ز) محبت کی پہچان اور طریقِ علاج

محبتِ رسولؐ کی پہچان یہ ہے کہ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ۔ عام تجربہ و مشاہدہ ہے کہ جس چیز سے محبت ہو انسان اس کا بہت ذکر کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا ہے کہ رات دن میں حضورؐ کا ذکرِ مبارک ہمارے دل و زبان پر کتنا رہتا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ چیز نصیب نہیں ہے تو پیدا کریں اور ترقی دیں۔ اس کا قرآنی طریق یہ ہے کہ صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳/۵۶) پر عمل کریں۔ درود و سلام و نعت کی مداومت کریں۔ عاشقانِ رسول کی صحبت اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کی سچی محبت، ادب و تعظیم نصیب کرے جس کا ثمرہ توحیدِ نبوی ہو۔ آمین بطفیلِ حبیبِ ربّ العالمین (تقریر ختم شد)

(۱۸) بصیرتِ محمدیؐ

اصل چیز زاویۂ نظر کی درستی ہے۔ قرآن کا اصول عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲/۱۰۸) ہے۔ ہم کو رسول اللہ اور آپ کے متبعین اولیاء اللہ

کی بصیرت و نظر حاصل کرنی چاہیئے ۔ فطری صلاحیت اور اچھی صحبت سے بصیرت پیدا ہوتی ہے ۔ اللہ کی توفیق و فضل ضروری ہیں ۔ انّیت اور نفسانیت سے خالی رہیں ۔ ورنہ نورِ علمِ الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا ۔ کارک بند شیشی سمندر میں ڈالو تو اس میں ایک بوند پانی نہیں آئیگا ۔ ہر ایک کی نظر حتیٰ کہ کافر کی نظر اپنے محل و اقتضاء کے لحاظ سے درست ہی ہے لیکن بصیرتِ محمدی کے مطابق نہیں ہے ۔ ہر ایک جیسا دیکھتا ہے ویسا کہتا ہے ۔ اور وہ بھی ایک حقیقت ہے ۔ مثلاً کوئی بمبئی جائے ۔ گندی موریاں اور گندی گلیاں دیکھتا پھرے اور کہے کہ بمبئی تو بہت غلیظ شہر ہے ۔ یا کسی مکان میں جائے اور صرف بیت الخلاء ہی کو دیکھے اور کہے کہ مکان میں نری غلاظت ہے تو وہ اپنے نقطۂ نظر اور مشاہدہ کے لحاظ سے صحیح ہے ۔ لیکن وہ تنگ نظر کہلائے گا ۔ کیونکہ اس نے بمبئی کے مالا بار ہل، کھلے بنگلے، اچھے محلے نہیں دیکھے ۔ کسی مکان کے دیوان خانے اور چمن کو نہیں دیکھا ۔ ورنہ اچھی رائے بھی قائم کر سکتا تھا ۔ اسی طرح معترضین رسولوں اور اولیاء اللہ کے نزول (تثلیث) کو دیکھ کر عروج و فوقیت کا انکار کرتے ہیں ۔ حالانکہ انبیاء کا نزول غوث اقطاب کے عروج سے بڑھکر ہے ۔ بعض لوگ بعض اولیاء اللہ کی سلوک سے پہلے کی بد اعمالیوں کا ذکر کر کے بدظنی پھیلاتے ہیں لیکن کسی کے کبھی بیمار ہونے سے کیا اس کی صحت و قوت کے اعمال کا انکار لازم آتا ہے ۔ اس عالم میں اگر کوئی شخص تنگ اور غلط زاویۂ نظر اختیار کرے گا تو دوسرے عالم میں اسی نقطۂ نظر میں ترقی اور وسعت ہوگی ۔
وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ

سَبِيْلًا (۱۵/۸) ۔

ہدایت و گمراہی کے بے شمار مدارج ہیں ۔ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (۱/۲) ۔ قرآن اور رسولؐ ہی سے ایک طرف مومنین ہدایت کے مقامات حاصل کر رہے ہیں تو دوسری طرف اسی سے بعض لوگ اللہ رسول اللہؐ، اولیاء اللہ کے متعلق بدترین خیالات لے رہے ہیں ۔ وسوسوں میں مبتلا ہو رہے ہیں ۔ عارفین کے قلوب پر بھی وساوس وارد ہوتے ہیں چنانچہ بعض عرفاء نے کہا ہے ۔ "ہمارے دل میں اتنے بڑے وسوسے آتے ہیں کہ شیطان کے دل میں بھی کیا آتے ہونگے" لیکن قلب کے وسوسوں میں مبتلا ہو جانے اور قلب پر وسوسوں کے گذرنے میں بڑا فرق ہے ۔ سالکین کو وسوسوں سے گذرنا پڑتا ہے ۔ اس کی مثال ڈاکٹر کی سی ہے جو لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرتا ہے ۔ اور غلاظتوں اور بیماریوں میں بیٹھا رہتا ہے لیکن اس کی غرض ہوتی ہے ۔ مطالعہ ۔ حصولِ علم اور دوسروں کی اصلاح ۔ نہ کہ خود بیمار پڑنا ۔ اسی طرح عارفین بڑے ڈاکٹر ہوتے ہیں ۔ وہ وساوس سے گذرتے ہیں لیکن وساوس میں مبتلا نہیں ہوتے ۔ وساوس ان کے عقیدے کی شکل اختیار نہیں کرتے وہ گنہگاروں سے ہمدردی رکھتے ہیں ۔ انھیں مختلف لوگوں کے وساوس کا علم ہوتا ہے جن کو دیکھ کر وہ بصیرتِ محمدیؐ کے مطابق ان کے نقطۂ نظر کی تصحیح کی کوشش کرتے ہیں ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اولیاء اللہ بعض وساوس کے تابع ہو کر کسی گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں ۔ ایسی صورت میں ان کے دعوئ تقدس کو توڑنا منشائے الٰہی ہوتا ہے ۔

(۱۹) ظاہر و باطن فرمایا ۔ کھانسی کے باوجود آج کل سردیوں

میں برف، لیمو، موسمی، دہی کھا رہا ہوں تو فائدہ ہو رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اشیاء کے اثر و صفت کو کیا کہیں۔ دراصل جب اشیاء کا وجود ہی مستقل نہیں، تو آثار صفات (سردی، گرمی) کہاں مستقل ہو سکتے ہیں۔ گو عادتِ الٰہی یہی ہے۔ لیکن اللہ کے حکم و تجلی پر توکل ہونا چاہیئے۔

بعض لوگ بڑے لحیم، شحیم، صحت مند ہوتے ہیں۔ لیکن جوہرِ مردانگی سے محروم۔ عالمِ ظاہر کی طرح عالمِ باطن کا بھی یہی حال ہے بعض لوگ علمیت کی چربی بہت رکھتے ہیں۔ یعنی قرآن خوانی، عربی ادب، تفسیر وغیرہ کی تفصیلات میں مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن کی روح اور محبت کی قوت (نسبتِ نبویؐ اور نسبتِ اولیاء) سے محروم ہیں۔ گویا مردانگی ندارد۔ اس کے بعد حیات آفرینی کے آثار کیسے نمایاں ہونگے۔

(۲۰) حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ

بظاہر بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضرؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔ یاد رکھو۔ کوتوال شہر کی ہر تفصیل سے واقف ہوتا ہے۔ وہ اس کے فرض اور شررشتہ کے لوازم کے لئے ضروری ہے اور وزیرِ اعظم ایک حد تک عملاً ان تفصیلات کا علم نہیں رکھتا لیکن اُس کے دائرے سے کوتوال خارج نہیں۔ حضرت خضرؑ کی ماموریت (ولایت) کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ (صاحبِ شریعت رسول) کو اس محل پر سکوت ضروری تھا۔ اس سے حضرت موسیٰؑ کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔

(۲۱) اسباب اور اولیاء اللہ سے ربط

اسلام نے ترک کی تعلیم نہیں دی ظہور کے مرتبے میں اسباب اور اولیاء اللہ کی طرف توجہ اور طلب لازمی ضروری

ہے۔ اور منشائے الٰہی ہے۔ البتہ علمِ صحیح ہونا ضروری ہے۔ چاہے اسباب کے تعلق سے ہو، چاہے اولیاء اللہ کے تعلق سے۔ یعنی اشیاء بذاتہ میت ہیں، فاعلِ حقیقی نہیں۔ اِن سے کسی قسم کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ یہ باطنی علم ہے۔ البتہ معمولی اشیاء ہوں یا اولیاء اللہ۔ ہر ایک میں نور اور قوت و فعل من اللہ آ رہا ہے۔ کسی میں ایک درجہ کسی میں کروڑ درجے۔ مدارج کا فرق ہے۔ اولیاء اللہ بڑے بڑے اسماء کے مظہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سے استفادہ کے لئے زیادہ توجہ کی جاتی ہے

(۲۲) صاحبِ خدمات اولیاء اللہ

قطب، غوث اُسی کو کہتے ہیں جس پر ربوبیت کے اسرار کھل جاتے ہیں اور وہ ربوبیت کی تفصیلات سے متحقق ہوتا جاتا ہے۔

بعض اہل اللہ مامور اور صاحبِ خدمات ہوتے ہیں۔ وہ آئندہ ہونے والے اسرار بیان فرماتے ہیں۔ دراصل باطن ظاہر کو متاثر کرتا ہے۔ اہل اللہ اہلِ باطن ہیں۔ جو کچھ اس عالم میں گذر رہا ہے۔ قلبِ مومن پر پہلے گزرنا لازم ہے۔ حیدرآباد کی حد تک حضرت یوسف صاحب شریف صاحبؒ مُتعلب ہیں۔ سب احکام یہاں سے جاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ میرے ایک دوست حضرت کے خادم محمّد علی شاہ صاحب مرحوم، حضرت کے ایماء سے آئندہ ہونے والے مختلف واقعات اور اسرار مجھ سے بیان کر دیتے تھے۔ اسی طرح علی گڑھ میں میرے ایک مہربان بزرگ حضرت عبداللہ شاہ صاحب قبلہؒ زبردست کشفِ کونی رکھتے تھے۔ اہلِ خدمت، صاحبِ حکومت تھے۔ کشفِ قبور، کشفِ اجنّہ زبردست تھا۔ پہلی جنگِ جرمنی کے حالات نقشہ لیکر قبل از قبل بتاتے جو کچھ عرصہ بعد ظہور میں آتے۔

اولیاء اللہ کے پاس دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک اکھاڑہ۔ دوسرا شفاخانہ۔ خواص کو اکھاڑہ میں جہاد کے لئے تیار کیا جاتا ہے عوام کا علاج کرکے گھر روانہ کیا جاتا ہے۔ اولیاء اللہ سے دعائیں کرانا عقیدت کی جان ہے۔

(۲۳) اولیاء اللہ کا فیضان

توحیدِ افعالی کا تعلق چونکہ عمل سے ہے۔ اس لئے ہر کوئی یہاں گرتا ہے، مار کھاتا ہے۔ البتہ صفات و ذات دل خوش کن ہیں جہاں میٹھی باتیں چلتی ہیں۔ اولیاء اللہ کے فیضان کی مثالیں بالکل ایسی ہیں جیسے بارش کا سمندر سے بخار، بادل بن کر نکلنا اور برس جانا۔ آثار مختلف ہوتے ہیں۔ مختلف صورتوں سے پانی سمندر ہی سے آتا ہے لیکن کیا بارش اور بادل کو دیکھنے سے سمندر کے فیضان کا انکار ہوگا۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی صورت سے اللہ ہی کے افعال ظاہر ہو رہے ہیں۔ جنہیں بصیرت نہ ہو وہ نہیں دیکھ سکتے۔ جیسے ایک عامی بادل اور بارش کو دیکھ کر سمندر کے پانی کو نہیں پاتا۔ لہٰذا کسی کو سمجھانا مشکل ہے۔ شرحِ صدر ہو تو بات سمجھ میں آئے۔ حیرت ہے کہ یہ لوگ اولیاء اللہ کے انکار میں کیسے پرورش پاتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو خیال سے ضیق ہوتی ہے۔ دراصل اچھی آب و ہوا کا باشندہ غلیظ آب و ہوا میں مرجائیگا اور غلاظت کا کیڑا اچھی آب و ہوا میں مرجائے گا۔

اللہ رسول تو بہت بڑے ہیں۔ اولیاء اللہ بجلی کے اسٹیشن ہوتے ہیں ان کی قوتوں کا ٹھکانا نہیں۔ چاہیں تو ایک آن میں عالم کو الٹ دیں۔ یہ قدرت اسی بندے کو نصیب ہوتی ہے جس کا ادراک ہو کہ مجھ میں انگلی

ہلانے کی بھی قوت نہیں لیکن وہ ادب، اقتضاء اور منشائے الٰہی کے تحت خاموش رہتے ہیں۔ جس پر بے بسی کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ عبدیت دکھاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان سے ڈھیلے کے نیچے مرتبے والے کمالات دکھاتے ہیں۔ لوگوں کو حیران کر دیتے ہیں۔ ماموریت کے لئے بڑے دل و جگر اور قوت برداشت کی ضرورت ہے۔

اسلام میں مرکز یعنی اللہ، رسول سے راست تعلق پر زور دیا گیا ہے تاکہ دیگر ادیان کی طرح ذیلیات یعنی نیچے کے روابط میں اولیاء اللہ کی نسبتوں کو غلط طور پر سمجھ کر شرک و کفر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ لیکن جب کلمۂ طیبہ کے ذریعے مرکز سے اچھا ربط قائم ہو جائے تو اولیاء اللہ کے ذریعے استفادہ مانع توحید نہیں ہوتا۔ شہیدوں کی حیات اور ان کو رزق دیا جانا قرآن کے نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے۔ انبیاء، صدیقین تو شہداء سے اوپر کے مقامات پر فائز ہیں۔ اس لئے ان کی حیات بعد الموت اور رزق دیا جانا محتاج بیان نہیں ہے تاہم اللہ تعالیٰ کے ارشاد لَهُم مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۲۴) (وہ جو چاہتے ہیں اپنے رب کے پاس پاتے ہیں) سے نہ صرف حیات بعد الموت کا ثبوت ملتا ہے۔ بلکہ یہ قدرت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں رزق کے علاوہ وہ سب کچھ ملتا ہے جو وہ چاہتے ہیں۔ اس میں خاص عالم کی تقیید نہیں۔ بلکہ اطلاق ہے ہر دو عالم کے لئے۔ اور یہ چیز فیضان کے اس ربط کو بھی حاوی ہے جو اولیاء اللہ کی ارواح سے اس عالم کے رہنے والوں کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ خود حدیث سے اہلِ قبور سے سلام و کلام ثابت ہے۔ اور آج کل ایجادات، ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ کی وجہ سے یہ چیز اور بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے

۲۴- مہلت میں حکمت

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتنا قتل و خون ہو رہا ہے لیکن اتنے بڑے اولیاء اللہ کچھ نہیں کرتے۔ یہ چیزیں بہت نازک ہیں عوام سمجھ نہیں سکتے کہ ان میں کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ یزید کے زمانے میں مسجد نبویؐ میں تین دن تک گھوڑے بندھے رہے۔ خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ فوراً کچھ نہ ہوا۔ بعد کو ہوا۔ بعض دفعہ ظلم کو ڈھیل دے کر پایۂ تکمیل کو پہنچنے کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ حکمت کے تحت ان پر حجت تمام ہو کر سزا دی جائے اور فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۷/۱۱) صادق آئے۔ اصل میں یہ مسئلہ اقتضاءات کا ہے۔ اس علم کا سمجھنا مشکل ہے۔ ایک طرف کہا جاتا ہے۔ اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت کرتا۔ دوسری طرف کافروں کی تخلیق اور پرورش عمل میں آ رہی ہے اور پھر تبلیغ کا حکم ہوتا ہے تاکہ مسلمان اپنا اقتضا پورا کریں۔ حضرت نوحؑ سب کافروں سے عالم کو پاک کرنے کی دعا کرتے ہیں جو قبول ہوتی ہے۔ اور حضورؐ کافروں کی ہدایت کی دعا کرتے ہیں اور یہ بھی قبول ہوتی ہے۔ بہرحال دعا بھی ہے۔ بددعا بھی ہے جہاد بھی ہے قتل و شہادت بھی۔ ہر ایک کا محل ہے۔ اور اس محل کے اقتضاء کے تحت ہر چیز درست ہے۔ البتہ ایک دوسرے کے تقابل سے فرق سمجھ میں آ رہا ہے۔ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۲/۵)

۲۵- استعانت عن الاولیاء کی مثال

مشہور شاعر مولانا امجد حیدر آبادی سے فرمایا۔ میرے والد صاحب کی آنکھوں کا آپریشن ایک دفعہ ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بیکار ہو گئیں۔ آپریشن کے بعد دوسرا آپریشن عموماً نہیں ہوا کرتا۔ دلی کے ڈاکٹر قریشی آمادہ نہ تھے۔ والد صاحب نے فرمایا۔ میری ذمہ داری پر کرو۔ نوے سال کی عمر میں جب آنکھیں نری خشک تھیں آپریشن کیا گیا۔ اور نہایت کامیاب رہا۔ خود ڈاکٹر نے حیرت کی اور کہا کہ فن کے لحاظ سے کامیابی

کا قطعاً امکان نہ تھا۔ یہ بالکل کرامت ہے۔ ڈاکٹر نے مجھ سے توجیہ پوچھی۔ میں نے کہا۔ آپ حضرات ظاہری اسباب میں حکمت کی حد تک خوب جانتے ہیں۔ لیکن اس کے آگے ایمان کا مقام ہے۔ اللہ عزیز بھی ہے۔ قدیر بھی ہے۔ پھر بھی آپ لوگ کہتے ہیں کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ درخواست ہی نہیں دیتے تو منظوری کیسے ملے گی۔ میں نے ان سے کہا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے حضرت قطب صاحبؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت چراغ دہلیؒ اور حضرت باقی باللہؒ کے پاس حاضریاں دی تھیں اور عرض کیا تھا حضرت آپ کے پاس سے تو ہم کو بصیرت ملتی ہے۔ بصارت تو حیوانی چیز ہے۔ حکمت میں ڈاکٹروں کے پاس گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ہم قدرت کے تحت آپ کی دعا سے کاربرآری چاہتے ہیں۔ مدد فرمائیں۔ چنانچہ بفضلِ الٰہی ایسی مدد حاصل ہوئی کہ سب دنگ ہو گئے۔

(۲۶) حکومت عالم اور مومن

قرآناً یہ امر مسلّم ہے کہ حضور انورؐ کے پاس سے عالم میں حکومت تقسیم ہوتی ہے۔ حکومت ہو یا کچھ اور۔ جب تک مومن کامل کے قلب پر خطرہ نہ گذر جائے اس کا ظہور اس عالم میں نہیں ہو سکتا۔ غدر کے زمانے میں ایک بزرگ ملا محسنؒ نے ہمارے والد صاحب سے پوچھا۔ کیا انگریزوں کا حاکم جوان عورت ہے۔ اس کو دربارِ رسالت سے ہندوستان کی حکومت عطا ہوئی ہے۔ چنانچہ واقعات کے خلاف انگریزوں کو ناامیدی کی حالت میں کامیابی ہوئی۔

اس عالم میں خاص خاص اولیاء اللہ کو حکومت سے ربط رہتا ہے اگر رحمانیت کے تحت ان کی حمایت مختلف حکومتوں کو حاصل نہ ہو تو ان کا قیام

ناممکن ہوجائے۔ حکمت کلی کے لحاظ سے یہ ربط ضروری ہے۔ البتہ حکمت جزوی میں نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ میں اختلاف چلتا ہے۔ ان میں سے جو اولیاء اللہ رحیمیت سے قوی ربط رکھتے ہیں اور رحمانیت سے ضعیف۔ وہ رحیمیت کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے مومنین کی حمایت میں زور دکھاتے ہیں۔ لیکن بعض ان دونو اسماء رحمٰن و رحیم کے مظہر ہوتے ہیں۔ جامعیت رکھتے ہیں۔ ان کا مقام بڑا ہوتا ہے۔ ان میں توازن ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کے مقابلے نفس سے خالی ہوتے ہیں منشائے الٰہی کی تعمیل ہوتے ہیں۔ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ ہلاک ہوتے ہیں۔ حکمتِ کلی اور نظم و نسق کا علم حاصل ہو تو معلوم ہوگا کہ جیلر کا قاتلوں، باغیوں کو کھلانا اور مہتمم عجائب خانہ کا اژدھوں کو پالنا کتنی بڑی سرکاری ڈیوٹی ہے۔ ورنہ جاہل کہے گا کہ جیلر قاتل یا باغی کی کیوں حمایت کر رہا ہے اور مہتمم سانپوں کو کیوں پال رہا ہے۔

اولیاء اللہ مومنین کی کیوں نہ مدد کریں جب کہ وہ کافروں تک کی مدد کرتے ہیں۔ لیکن وہ امر کے تابع ہیں۔ سب کو ربوبیت کا فیض اولیاء کے ذریعے باطن سے مل رہا ہے۔ اس کے لئے اولیاء کے پاس کافروں کا حاضر ہونا اور استعانت کرنا بھی لازمی نہیں۔ بلکہ اسم رحمٰن کے تحت ان کا اقتضا پورا کرنے کے لئے وہ خود مدد کرتے ہیں۔ اور رحمۃ للعالمین کے تحت رہ کر ان کو حکومتیں، دولتیں، قوتیں عطا کرتے ہیں۔

(۲۷) حق و باطل کا باطنی نظم

فرمایا۔ باطل پرست آج کل شیطانی قوتوں سے بہت کام لے رہے ہیں اور اپنے شیاطین سے استمداد کر کے قوتیں حاصل کر رہے ہیں

حق و باطل دونوں کو تخلیق میں قوت اللہ ہی کے پاس سے ملتی ہے۔ پہلے کے اولیاء اللہ باطل پرستوں کے اس باطنی نظم سے کافی واقف رہا کرتے تھے اور اُن کے خلاف حق کی قرآنی قوتوں سے کام لیتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔ حق کی قوت تو باطل سے ٹکر ہونے ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ حکمتِ الٰہی ہے۔ اسی لئے باطل سے کبھی گھبرانا نہ چاہیئے۔ بلکہ حق کی قوت کے مشاہدے اور اس سے کام لینے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیئے

اس وقت عالم میں دراصل حق و باطل، اسلام و کفر کی جنگ ہے۔

اس لئے انبیاءؑ کے اصول کے تحت ہمیں آیتوں کے ذریعے متوجہ الی اللہ ہونا چاہیئے تاکہ حق کی قوت سے باطل کو شکست ہوجائے۔

(۲۸) نسبت

اللہ والا نسبتوں کی موٹر میں چلا جاتا ہے۔ جو ٹکراتا ہے پاش پاش ہوجاتا ہے، چاہے اُس میں معمولی آدمی ہی کیوں نہ سوار ہو۔

جو رسول اللہ ﷺ سے اور اہلِ بیت سے نسبت توڑے وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ جو اِن نسبتوں کو توڑے اُسے دنیا میں ذلیل انسانوں سے ربط قائم کرنا پڑتا ہے یہ مشاہدہ ہے۔

ایمان میں صفائی ہو۔ ادب اور ربط اچھا ہو تو اولیاء کی نسبت سے تقویت ہوتی ہے۔ نسبت کیا ہے۔ ایک نگراں کار ہے۔ مثلاً بچے کا نگراں کار جو بچے کو ہر وقت گرنے سے روک لیتا ہے۔

نسبت دو دھاری تلوار ہے۔ اس کا اچھا استعمال دشمن کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے اور غلط استعمال اپنے لئے۔

حضرت شاہ عبدالحق محدثؒ فرماتے ہیں۔ بڑا عمل یہ کر کر کسی اللہ والے

کے دل میں جگہ پیدا کرلے۔

نسبتِ سجادگی یا نسبتِ اولیاء اللہ کوئی ذاتی صفت یا فعل نہیں۔ اللہ کے فضل سے نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جسے نسبت حاصل ہو اس پر اس نعمت کی حفاظت کا فرض عائد ہوتا ہے۔ اس کو اپنی زندگی اور علم و عمل ایسا رکھنا چاہیئے کہ نسبت پر کوئی حرف نہ آئے ورنہ مار پڑتی ہے اکابر کی شان میں بے ادبی کرنے پر بڑے بڑے علم والوں پر بڑے چکر پڑ جاتے ہیں۔ غلط علم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خود مکتفی ہونے کا خیال اور کسی نسبت کی عدم ضرورت کا خیال عرفان و عبدیت کے علم کے منافی ہے

(۲۹) نسبت اور ترک نسبت

یادرکھو! نسبتیں سب سے بڑی نعمت ہیں۔ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا کہیں مقام نہیں۔ ایک تعیّن ہیں اور بس یعنی عدم و جہل۔ لیکن نسبتیں بفضلہ سر پر سایہ کیئے ہوئے ہیں۔ جن کے واسطے سے رحمتیں مل رہی ہیں۔ انبیاء تک رحمۃ للعالمین صلعم کی نسبت سے مستفیض ہیں

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا (۲۲/۳)

(مومنین کو خوش خبری دیجئے کہ اُن کے لئے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے)

اس آیت سے ظاہر ہے کہ مومن کے لئے حضورؐ کی نسبت فضلِ کبیر ہے۔ محمدؐ و احمدؐ کے بغیر فضل ہوتا کہاں۔ لیکن حیرت ہے کہ بعض لوگ فضلِ محمدؐ اور فضلِ احمدؐ کے نام کو شرک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسی آیت سے ثابت ہے کہ فضلِ محمدؐ میں ہی فضلُ اللہ ہے اور یہی توحید ہے۔

نسبتیں ہر وقت سایہ کئے ہوئے ہیں لیکن خوف رہتا ہے کہ کہیں بادل کی طرح ہٹ نہ جائیں۔ اسی لئے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا

پڑھتے ہیں۔ دوسری طرف اندیشہ رہتا ہے کہ اللہ کسی ذرہ سے نہ لپٹا دے کہ اس کے بندے بن کر رہ جائیں۔ یہ لوگ اکابر سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اور ہمیں توحید ایسی معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کے صدقے میں بفضلہ ہم عالم سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ہم کو نسبت میں توحید اور اُن کو نسبت میں شرک نظر آتا ہے۔ غلامی بڑی چیز ہے۔ لیکن ان لوگوں کو حضورؐ کی غلامی ہی میں شرک نظر آتا ہے۔ اللہ شرح صدر کرے تو سمجھ میں آئے۔

(۳۰) نسبت اور فضل

فیضانِ علمی کے وقت بھی نفس و شیطان اور فیضِ الٰہی میں تمیز کی ضرورت ہے۔ یہ تمیز اُسی وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ نسبت قوی ہو۔ جسمانی دوری روحانی فیضان کو مانع نہیں۔ عمل میں میں پن (انانیت) نہ آئے۔ سب فضل جانے۔ چاہے فضل اندر سے آئے یا باہر سے۔ ذاتُ اللہ (فضل والے) پر نظر رہے۔ یہی استادی کی بات ہے۔ کام سے مطلب رہے۔ اس کے بعد نہ ذکر کرے نہ تعریف کا امیدوار ہو تو مردانگی ہے۔

(۳۱) پہلوانی اور نسبت علیؓ

مسلمان پہلوان ہمیشہ اللہ اللہ کیا کرتے تھے۔ محض جسمانی زور کافی نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے ساتھ روحانی زور اور ہیبتِ حق رکھتے تھے۔ نسبت والے ہوتے تھے۔ اور بڑے بڑوں پر غالب آتے تھے۔ 'یا علیؓ' کہہ کر دنگل میں کودتے تھے، دل ہلا دیتے تھے۔ علی اسمِ الٰہی بھی ہے۔ اور حضرت علیؓ اسم علی کی تجلی بھی ہیں۔ اور شجاعت آپ کا خاص وصف ہے۔ کشتی، بنوٹ سکھاتے وقت حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ

اور حضرت غوثِ اعظمؒ کی نیاز دلائی جاتی ہے۔ قرآن کا حلف لیا جاتا ہے
کہ ظلم کی حمایت نہیں کی جائے گی۔ اور عورت، بچے، بوڑھے، بیمار پر وار
نہیں کیا جائے گا۔ نیت فسادکی نہ ہو۔ شرافت لازمی ہے۔ جنات و
شیاطین بھی حضرت علیؓ کا نام لینے پر قریب نہیں آتے۔

(۳۲) نسبت والے کی ذمہ داری

نسبت کے اسرار بہت نازک ہیں۔ نسبت والے
پر بڑی ذمہ داریاں رہتی ہیں۔ ورنہ نسبت کٹ کر مار پڑتی ہے۔ اگر
اولیاء اللہ کی شان میں نسبت والے کے سامنے کوئی گستاخی کرے
اور وہ خاموش رہے تو جواب طلب ہو جاتا ہے کہ کیوں جواب نہیں دیا
اور اپنی نسبت کو کیوں ذلیل کیا۔ اگر جواب دینے سے فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے
تو معذوری ہے۔ معذوری کی حالت قابلِ لحاظ ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن
میں بڑی سخت تنبیہ ہے۔ اِذَا سَمِعْتُمْ آیَاتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا
وَ یُسْتَھْزَءُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِی
حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ۔ اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُھُمْ (۵/۴)۔ جب اللہ کی نشانیوں
کے ساتھ کفر کیا جائے اور ٹھٹھا کیا جائے تو ان لوگوں کے پاس مت
بیٹھو جب تک کہ وہ اور بات شروع نہ کر دیں کہ اس حالت میں تم بھی ان
ہی جیسے ہو جاؤ گے) جتنا بڑا مقام اور عہدہ ہوگا اتنا ہی خطرہ ہوگا۔
لیکن نسبت والے کی حفاظت بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ نسبت والے کو
اپنے اعمال ٹھیک رکھنے چاہئیں تاکہ فیضان خوب ہو۔ پہلوان کو لطف
دشمن سے لڑنے میں آتا ہے۔ کمانڈر کو لطف میدانِ جنگ کے خطرات
میں آتا ہے۔ ورنہ مفت کی تنخواہ میں کیا لطف۔

ایک صاحب نے کہا مسلمانوں پر بڑی بلائیں آرہی ہیں۔ فلاں سجادہ
صاحب پر بڑی مصیبت آئی۔ فرمایا۔ فطرت یہ ہے کہ اپنا بچہ غلطی کرے
تو دوہری سزا۔ یا ملازم کا بچہ وہی غلطی کرے تو کم سزا دی جاتی ہے یا اس
پر توجہ نہیں کی جاتی۔ سخت سزا کا مقصود اپنے بچوں کی اصلاح ہوتا ہے
سزا و جزا ہر دو طرف یہی قانونِ فطرت کارفرما ہے۔ چنانچہ حضورؐ کی
ازواج مطہرات کے متعلق ارشادِ باری ہے۔ غلطی پر دگنا عذاب ہوگا
اور نیکی پر دگنا ثواب ملیگا۔ یُضٰعَفْ لَھَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ
...... وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِھَا اَجْرَھَا مَرَّتَیْنِ (۲۲)

(۳۳) مصیبت میں نسبت کا فیض

بعض لوگ بعض اولیاء اللہ کے متعلق
کہتے ہیں۔ اتنی بڑی نسبتوں کے باوجود اتنی بڑی مصیبتیں ان پر کیوں
آئیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس انتظام سے وہ غافل ہیں کہ آزمائش وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ
(۲/۳) کی بھٹی کے بغیر اِن اعلیٰ مقامات کا حصول اور ان میں استحکام ممکن ہی
نہیں۔ اسی میں اِنَّا لِلّٰہِ کا علم پختہ ہوتا ہے۔ اسی بھٹی کے ذریعے کچے
اور پکے برتنوں (منافق و مومن) میں تمیز پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ نقوش
تو کچے برتنوں میں بھی آتے ہیں۔ البتہ رنگ، روغن، پختگی پکے برتنوں کا
حصہ ہوتی ہے۔ لیکن خوبی یہ رہتی ہے کہ جو کام ظاہر و باطن کے لحاظ
سے ہزاروں میں ہونا چاہیئے یہاں کوڑیوں میں ہوتا ہے۔ اور جس
مصیبت کی شدت کی وجہ سے جان نکل جانی چاہیئے۔ اس میں برائے
نام بار ڈال کر عظیم الشان نعمتیں دی جاتی ہیں۔

(۳۴) قبر کی حقیقت

ایک صاحب نے کہا۔ قبور مٹی کے ڈھیر

ہیں۔ اہلِ قبور کچھ نہیں کرسکتے۔ مرگئے۔ ختم ہوا۔ فرمایا۔ اگر قرآن پر ایمان رکھتے ہو تو معلوم ہوگا کہ کسی کامل کے قدم کا کسی قبر پر جانا کیا آثار پیدا کرتا ہے۔ حضورؐ کو رأس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی قبر کے متعلق حکم ہوا۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ (۱۰) (اور اُن میں کوئی مرجائے تو اُس کی کبھی نماز (دعا) نہ پڑھ اور نہ اُس کی قبر پر کھڑا ہو) یہ تھا حکم کفار و منافقین کی قبروں کے متعلق لیکن مومنین کے قبور کی شان کا کیا کہنا کہ خود بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ صلعم اکثر جنّت البقیع تشریف لے جاتے اور السّلام علیکم یا اَهْلَ الْقُبُوْرِ فرماتے اور دعا فرماتے اور سالانہ شہداءِ اُحد کے قبور پر تشریف لے جاتے۔ اگر قبر کوئی چیز نہیں۔ مہمل ہے۔ ڈھیر ہے تو یہ حکم اور یہ عمل کیوں۔ وہ صاحب اس پر بہت متاثر ہوئے اور مان گئے۔

بظاہر قبر ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ میّت کا قبر سے ہر وقت تعلق بھی ہوتا ہے۔ لیکن ہم میں اور میّت میں عوالِم کا فرق و بُعد ہے۔ اِس کے باوجود سلام ہے۔ کلام ہے۔ اہلِ قبور میں سے جو اس عالم سے ربط رکھتے ہیں وہ ایک حد تک برزخ کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ زیادہ نہیں۔

۳۵۔ تنِ مثالی روح کا عمل مطلق ہے اور جسم کا مقیّد۔ تنِ مثالی ان جسم اور روح کے درمیان برزخ ہوتا ہے۔

تنِ مثالی جسم کے مقابلہ میں لطیف اور روح کے مقابلہ میں کثیف ہوتا ہے۔ اور اُس کا زمان و مکان اِس جسم کے زمان و مکان سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کو یوں سمجھو کہ جہاں ہمارا خیال وہیں ہم۔ ورنہ ہمارا بدن ڈھانچہ سے بڑھ کر نہیں۔ خواب کی حالت برزخی ہے جو بے پایاں سمندر کے مانند ہے۔ انسان خواب میں ہر جگہ

موجود ہوتا ہے اور ہر چیز گزرتا ہے۔ ایک سکنڈ میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ کئی سال کے کام مثلاً شادی و غم، صحت و بیماری سب گذر جاتی ہے۔

میرے ایک دوست بعض وقت حالتِ بیداری میں تنِ مثالی کے ساتھ دوسرے عالم کو چل دیتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ جسم سے نکل کر سیر کر رہے تھے۔ اُن کو اپنے بدن میں واپس آنا ناممکن ہوگیا۔ اور انھیں اندیشہ ہوا کہ مجھے مردہ سمجھ کر لوگ دفن کردیں گے بمشکل بہت دیر بعد بدن میں سما سکے۔ مجھ سے کہا۔ یہ حالت رُک جائے تو بہتر ہے میں نے ایک آیت بتائی تو فائدہ ہوا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک کمرہ میں سو رہا تھا۔ دوستوں نے دیکھا میں نے اپنے جسم سے نکلکر دوسرا جسم اختیار کیا۔ دوستوں سے باتیں کیں۔ باہر گیا اور پھر آکر اُسی جسم میں جو سو رہا تھا داخل ہوگیا۔ یوروپ میں ایک معلّمہ تھی۔ جہاں اُس کو کوئی خیال آیا وہیں موجود ہو جاتی۔ کرسی پر جماعت میں بیٹھی اور اُسی آن باہر چمن میں موجود ہوتی۔ تنِ مثالی پر یوروپ کی جدید تحقیق یہ ہے کہ تنِ مثالی کے ساتھ کوئی شخص آسمانوں پر گھوم سکتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی بڑی روحانی قوت مثل حضرت عیسیٰؑ اُسے سنبھالے۔ بعض اولیاء اللہ مثلاً حضرت ابن عربیؒ نے اِسی تنِ مثالی کے ساتھ سیّاروں میں جاکر حالات دیکھے اور لکھے۔ اگر ہم پر ایسے احوال گذریں تو پریشان نہ ہوں۔ ہمیں ہر محل پر سنبھالنے والی قوت رسول اللہ کی ذاتِ مبارک ہے۔ یا حضرت غوث اعظمؓ ہیں جن کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے۔ ہم رسول اللہ کو اُن لوگوں کی طرح رسول نہیں سمجھتے جو کہتے ہیں کہ آپ چودہ سو برس پہلے توحید بتا کر قرآن دے کر چلے گئے۔ بلکہ آپ اب بھی ہر محل پر ہماری مدد فرماتے ہیں۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۱/۲) کی شان تازہ ہے۔ ہر آن کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ تزکیہ فرماتے ہیں۔

۳۶۔ عالمِ برزخ اسلام نے عالمِ نزع اور عالمِ برزخ کے متعلق بہت علم دیا ہے

علماء کا متفقہ مسئلہ ہے کہ عالم برزخ کھلنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اسی لئے نزع کے وقت فرعون کے اٰمَنْتُ بِرَبِّ مُوْسٰی وَھَارُوْنَ کہنے کے باوجود فرعون کے کفر پر علماء کا اتفاق ہے۔ عالم برزخ کے کھلنے سے پہلے توبہ کام دیتی ہے۔ وہ عالم بعض پر چند منٹ پہلے، بعض پر چند گھنٹے پہلے، بعض پر ایک ایک ہفتہ پہلے کھل جاتا ہے۔ ہر ایک کو اس کا علم رہنا لازمی ہے۔ ورنہ انسان اُس عالم کے کھلنے پر وہاں کی شکلوں، فرشتوں وغیرہ کو دیکھ کر جہالت و نادانی سے حیرانی میں پڑ جاتا ہے۔ اللہ بچائے۔

حضرت یوسف صاحب شریف صاحب کے پاس ابدالِ وقت محمد علی شاہ صاحب رہتے تھے۔ مجھ پر ہر ہفتہ ملتے۔ عالم مثال ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ درگاہ شریف کے ایام پر آئندہ ہونے والے واقعات مجھ سے بیان فرماتے۔ ایک دفعہ حیدرآباد میں طاعون زوروں پر تھا۔ وہ ایک دن آئے اور کہا۔ ہاتھی کب تک تنکے گھاس کھائیگا۔ اسے تو گری کی ضرورت ہے۔ اور بفضلہ ابھی حضور اکرمؐ کے غلام بڑی بڑی گریاں ہیں۔ میں نے منشا سمجھ لیا۔ جاتے وقت کہنے لگے غالباً یہ آخری ملاقات ہے۔ دوسرے روز پلیگ میں مبتلا ہو گئے۔ میں پہنچا اور ایک اچھے قوال سے خاص نعتیں پڑھوائیں تو خوش ہو گئے۔ حضورؐ کی یاد کی وجہ سے ٹھنڈک ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد انتقال کر گئے۔ چہرہ پر بشاشت، جسم نرم۔ چہرہ پر پسینہ کی بوندیں تھیں جو خاص مقبولیت کی نشانی ہیں۔ وزیر اعظم سر اکبر حیدری نے بوندیں لے کر اپنے منہ پر پوچھ لیں۔ ایک نعمت حاصل کر لی۔

ایک صاحب کا انتقال ہوا۔ درگاہ یوسفینؒ کے قریب انہیں دفن کیا گیا۔ محمد علی شاہ صاحب نے کہا، ان کی قبر کھولو۔ قسمیہ کہتا ہوں کہ ان کا جسم اجمیر شریف پہنچ گیا۔ اگر غلط ہو تو میں لکھ دیتا ہوں۔ اسی قبر میں مجھے زندہ دفن کر دینا۔

ایک صاحب نے انتقال کے وقت ناز شروع کیا۔ یا رسول اللہؐ ہم آپ کے تشریف لائے بغیر اس دنیا سے نہیں جائیں گے۔ چنانچہ حضورؐ تشریف لائے۔ وہ اِس سرفرازی پر روئے۔ بعد کو اس انعام پر ہنسے اور وصال ہو گیا۔

۳۷ - کشفِ قبور

بعض کا کشفِ قبور قوی ہوتا ہے۔ راستہ میں اہلِ قبور روک کر کہتے ہیں۔ فاتحہ پڑھ کر جاؤ۔ تاکہ ہمیں سکون ہو۔ راستہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اکثر لوگ اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر جبری ربط پیدا کرنا چاہتے ہیں جو بہت نامناسب ہے۔ اخلاقاً دنیا میں بھی کسی کے گھر جا کر باہر آنے پر مجبور کرنا بُرا سمجھا جاتا ہے۔ یہی کیا کم فضل ہے کہ زیارت کی توفیق ہوئی، سلام کیا۔ اب وہ جیسا سمجھیں گے ملیں گے۔ دعا دیں گے۔ کاربراری کا انتظام کریں گے۔ کشفِ قبور کی ایسی کوشش میں اکثر دھوکے ہوتے ہیں۔ شیطان آ کر ملے تو تمیز نہیں ہوتی۔ اور اُس کو حضرت قبلہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ عام طور پر صاحبِ مزار سے ملاقات نہ ہو اور ظاہرا فیض نہ ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بیکار کام ہے یہ مُردے ہیں۔ اسی اصول پر کوئی دنیا میں کسی کے گھر جا کر، مل کر، اپنی مراد پوری کرا کے تو دکھا دے۔ یہ ناممکن ہے۔ البتہ اگر وہ چاہیں تو ملاقات کریں۔ ہمارا اُن کو بلانا، مجبور کرنا بے ادبی ہے۔ بلکہ مار پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اصل میں زیارت کی سعادت بڑی چیز ہے کہ ملاقات کا فرض ادا کیا۔ اس کا فوری فیضان یہ کہ محبت، عقیدت پیدا ہوتی ہے۔ قلب میں سکون کی خاص کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اور ان

کا فیضان مختلف طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اُن کی دعا اور رفاقت سے کار برآری ہو جاتی ہے۔ ملنا لازم نہیں۔ وہ چاہیں تو اپنے ملازم کو کام کی تکمیل کے لئے اشارہ کر دیں یا دُعا کر دیں لیکن ان سیدھی ایمانی باتوں کے بجائے بعض پیر صاحبان اپنے مریدوں کو دادا پیر کی قبر کشف قبور اور خوابوں، کرامتوں کے تماشوں میں لگا دیتے ہیں جس میں اکثر دھوکے ہوتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ایمان بالغیب پر مرتبے اور ترقیاں ملتی ہیں۔ آثار طلبی تو کافروں کی علامت ہے۔ رفاقتِ اولیاء کی آیتوں پر ایمان رکھیں۔ شک نہ کریں۔ اکثر لوگ مجھ سے کشف و خواب بیان کرتے ہیں۔ میں اہمیت نہیں دیتا۔ سمجھتے ہیں ان کو یہ چیز حاصل نہیں۔ جب ہم کہتے ہیں۔ ہم کچھ نہیں اور نہ کمال رکھتے۔ تو بھی اُنھیں کُرید رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتباراتِ ایمانیہ کی کیا اہمیت ہے۔ کہ انھیں کمالات میں چین نہیں اور ہمیں بے کمالی میں سکون حاصل ہے۔

(۳۸) اہلِ قبور سے ربط اور بُت پرستی کا فرق

بعض لوگ اہلِ قبور سے ربط و تکریم اور بُت پرستی دونوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ انھیں نہ موجودہ بُت پرستوں کا علم ہے اور نہ قدیم بت پرستوں کا۔ بُت پرستوں کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ مختلف صفات مثلاً ربوبیت، تخلیق، تخریب، علم، قدرت، دولت وغیرہ کو ایک ایک تعین اور صورت میں محدود و مقیّد مانتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر ایک بُت بِالذّات کسی صفت کا حامل ہے نہ صرف یہی بلکہ صفت کا لزوم اُسی صورت و تعیّن میں مانتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی تعلیم کے لحاظ سے کوئی چیز مستقل بالذّات نہیں۔ اور نہ

کسی چیز میں کسی قوت و اثر کا لزوم ہے۔ حتیٰ کہ اللہ کا رسول بھی عَبْدُہٗ و رَسُوْلُہٗ ہے۔ شفاعت و عطا وغیرہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہیں۔ اللہ کی قدرت، عطا، حول و قوت و اثر کا ظہور بندوں میں مربوب کی حیثیت سے ہوتا ہے اور اُن سے جو کارسازی ظہور میں آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے مانی جاتی ہے لیکن بُت پرستوں کے نزدیک یہ امور ان ہی تعینات کی مرضی پر منحصر ہیں۔ لازم ہیں۔ اسلام اور کفر میں یہی عظیم الشان فرق ہے۔ یہ اسلام کا اثر ہے کہ بُت پرستی کی یہ تعبیر کی جا رہی ہے کہ ہمارا مندر بھی آپ کے کعبہ کی طرح قبلۂ توجہ ہے۔ اور بُت آپ کے قبروں کی طرح ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں کہ وہ بُت کی طرف توجہ نہیں کرتے اور کسی روح کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی رسوم کی ادائی سے قبل سونے یا پتھر کی مورت کو کوئی تقدس حاصل نہیں ہوتا لیکن مذہبی رسوم کی ادائی کے بعد وہ بُت اس روح کا عین ہو جاتا ہے اور اُن میں دُوئی نہیں ہوتی۔

(چنانچہ اِنفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر ص ۱۲۰-۱۲۱ پر ڈاکٹر تارا چند ایم۔ اے، ڈی فل تحریر فرماتے ہیں۔ "خالص تخلیق کی دوسری شکل وِیُوہا ہے یعنی خدا کا اوتار لینا (جسم اختیار کرنا) اس میں سے دو قسمیں ممتاز ہیں۔ پہلی خاص شکل یہ کہ وشنو خود کسی اعلیٰ برتر جسم میں اوتار لیتا ہے۔ اور ثانوی شکل یہ کہ کسی ایسی روح میں جو معمولی جسم میں مقید ہو، وشنو کی قدرت و طاقت نفوذ و سرایت کر جائے۔ اوتار کی دیگر شکلیں اَنترَیَمی اور آرچ ہیں۔ اَنترَیَمی کی حیثیت تمام ارواح کے اندرونی حاکم کی ہے۔ اور آرچ سے وشنو کا وہ ظہور مراد ہے جو مورتیوں میں ہوتا ہے۔")

اس کے برخلاف قبور تو اللہ کے بندوں کی ہوتی ہیں جہاں قرآن و حدیث کے لحاظ سے زندگی ہوتی ہے اور سلام و کلام ہوتا ہے۔ معترضین اہل قبور سے ربط اور اُن کی تکریم کو قبر پرستی سے تعبیر کرتے ہیں اور تعظیم و تعبّد میں فرق نہیں کرتے حالانکہ حضور نے فرمایا۔ اَلسَّلَامُ علیکم یا اہلَ القبور۔

زیارت گاہوں کے جو برکات ہیں، انوار ہیں، باطنی احوال ہیں،

(۳۹) زیارات وہ اپنے اپنے ربط کی بات ہے۔ قلب کی کیفیت ہے۔

کس طرح کوئی بیان کرے اور کس سے بیان کرے۔
انکار کرے تو اُسے
ع کجاست محرمِ رازے کہ شرحِ دل بکنم۔ نامحرم سے کہنا بات کھونا ہے۔
ڈبونا ہے۔ کوئی جانتا ہو یا کم از کم مانتا ہو تو دید و شنید کی گفتگو میں کوئی مضائقہ نہیں۔
سوئیہ تخلیہ کی بات ہے زیارت و حضوری کے خاص آداب ہیں۔ اخلاص، عقیدت اور ادب
بہر صورت لازم ہے۔ دل جتنا صاف لائیگا بس اُتنا ہی عکس آئے گا۔ جیسی نظر ویسی دید۔
جیسی طلب ویسی یافت۔ ع دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر۔
بہر حال رُوحانی فیوض و برکات کی بحث بہت نازک ہے جس پر گذرے وہی جانے
ع :۔ لذتِ مئے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی۔ (صراط الحمید للبرنی صد ۵۶ جلد اول)۔
اس سلسلے میں تفصیل کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ مُحدّث دہلوی رحؒ کی کتاب
(للمؤلف حلیم)
"ہمعات" کا باب نسبتِ اُویسیہ ملاحظہ طلب ہے۔
فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سالِک کو کسی خاص روح
سے خصوصی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس طرح کہ سالک نے اُس بزرگ کے
فضائل سُنے اور اُس سے غیر معمولی محبّت ہو گئی۔ چنانچہ اس محبت کی وجہ
سے سالک اور اس بزرگ کی روح کے درمیان ایک کشادہ راہ کھُل جاتی
ہے۔ یا یہ ہوتا ہے کہ یہ روح جس سے سالک کو مناسبت پیدا ہو گئی۔
اس کے مرشد یا آباؤ اجداد میں سے کسی بزرگ کی روح تھی۔ اور اُس بزرگ
کی روح میں ان لوگوں کے لئے جو ان سے منسوب ہیں، ارشاد و ہدایت
کی ہمت موجود ہے۔ یا یہ کہ سالک اپنے فطری جذبہ یا جبلی تقاضے
سے جس کا سمجھنا مشکل ہے کسی خاص روح سے مناسبت

پیدا کر لیتا ہے۔ چنانچہ سالک اس بزرگ کو خواب میں دیکھتا ہے اور مستفید
ہوتا ہے۔ جس شخص کو طبقہ مشائخ صوفیاء سے نسبتِ اویسی حاصل ہو جاتی
ہے، ضروری ہے کہ اُسے اس نسبت کی وجہ سے صوفیاء کی اُن ارواح
سے عشق و محبت پیدا ہو اور وہ فنا فی المشائخ ہو جائے......
اس حالت میں فنا فی المشائخ کی یہ کیفیت اس کی زندگی کے ہر ہر پہلو
میں مؤثر ہوتی ہے۔ لیکن فنا فی المشائخ کی اس نسبت سے ہر شخص میں
ایک سی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ فنا فی المشائخ کی نسبت کے سلسلے میں
مشائخ کے عرسوں کا قیام۔ اُن کی قبروں کی پابندی سے زیارت کرنا،
وہاں جا کر فاتحہ پڑھنا اور اُن کی ارواح کے نام سے صدقہ دینا، اُن کے
آثار و تبرکات، اُن کی اولاد و متعلقین کی تعظیم و تکریم کرنا۔ یہ سب اُمور
داخل ہیں۔

(۴۰) شہداء اور صدیقین کے آداب زیارت شُہداء و صدیقین

کو اس عالم شہادت سے بہت زبردست تعلق ہوتا ہے۔ شہداء میں تلوین
بہت ہوتی ہے۔ اور صدیقین میں تمکین (ایک حالت پر قرار) ہوتی ہے۔
شہداء کا معاملہ بہت نازک ہے۔ وہاں بہت ادب و لحاظ کرنا پڑتا ہے،
اُن پر جلالی شان غالب رہتی ہے۔ کیونکہ وہ قتل ہو کر ایک آن میں اِس عالم
سے اُس عالم میں منتقل ہوئے۔ اس لئے شہداء کے قبرستانوں میں بہت
رعب اور حرارت رہتی ہے۔ بعض جگہ تو راتوں میں گھوڑے، چمکتی تلواریں،
اور جنگ کے مناظر نظر آتے ہیں اور لوگ ان کو اصلی حالت میں دیکھ کر
ہیبت کھاتے ہیں اور غلط رائے قائم کرتے ہیں۔ اُن کے پاس جمعرات

کا دن خاص ہوتا ہے جبکہ سب جمع ہوتے ہیں۔ اور جلوس نکلتے ہیں۔ رات ۱۲ تا ۲، دن کے بارہ بجے اور طلوعِ آفتاب سے آدھ گھنٹہ بعد تک اُن کے مزاروں پر رہنا مناسب نہیں۔ احتیاط طلب ہے۔ مغرب کے بعد جھٹ پٹے کے وقت شہداء کو اس عالم کی طرف بہت توجہ رہتی ہے۔ بچوں کو ایسے وقت اُن کے پاس لے جانا مناسب نہیں۔ ورنہ اُس عالم سے ربط پیدا ہو کر توازن بگڑنے کا اندیشہ ہوگا۔ شہداء کو بچے اور صفائی مرغوب ہوتے ہیں۔ بچوں پر روحانیت خود بخود غالب رہتی ہے اور حیوانیت مغلوب۔ قرآن میں شہداء کی شان میں بہت سی آیتیں ہیں تاکہ لوگ ادب سیکھیں اور نقصان نہ اُٹھائیں۔ اُن کی زندگی کی بہت تشریح کی گئی ہے۔ لیکن جاہل کہتے ہیں۔ کیا شہداء صدیقین سے بڑھ گئے۔ اصل مقصد نہیں سمجھتے۔ کیونکہ صحبت ہے نہ سمجھ۔

(۴۱) آدابِ زیارت کی تفصیل

دنیا میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو طبیعت، منشا، اوقاتِ فرصت وغیرہ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اس طرح اولیاء اللہ سے ملنے کے بھی خاص آداب ہیں۔ بعض ملاقات پسند کرتے ہیں۔ بعض نہیں۔ بعض کے پاس اجازت سے جانا پڑتا ہے۔ کسی زائر میں نیک نیتی اور خیر طلبی ہے تو عقل نہیں۔ بے محل آجاتا ہے۔ سوتے سے اُٹھانے پر ناگواری ہوتی ہے لیکن حیوان سمجھ کر معاف کیا جاتا ہے۔ بلاوجہ ہر ایک سے ملتے پھرنا مناسب نہیں۔ ایسا شخص فضل و سعادت کے بہانے اپنی انانیت کا اظہار کرتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں کہ بڑے بڑے اولیاء اللہ سے مل سکتے ہیں۔ ایسے شخص کا کوئی مقام نہیں۔ ہرجائی ہونے سے کسی ایک کا ہونا بہتر ہے

ہر جگہ اولیاء اللہ نے روایات قائم کر رکھی ہیں جو بہت عام ہیں کہ کس دن کس وقت، کن لوازم کے ساتھ ملنا چاہیئے، عورتوں کا مزاروں پہ نہ جانا بہتر ہے کیونکہ اُن کی طہارت مشتبہ رہتی ہے۔ سب سے اونچی بات یہ ہے کہ قلبِ سلیم خود محسوس کرتا ہے کہ کونسی چیز اولیاء اللہ کو پسند ہے اور کب۔

(۴۲) ایصالِ ثواب (فاتحہ)

ایصالِ ثواب میں تو کلام نہیں۔ خواہ وہ اطعامِ طعام ہو یا تلاوتِ قرآن لیکن اس کے واسطے کوئی وقت، دن، تاریخ اور مدت اور کوئی طور طریق مخصوص و معین نہیں ہے۔ حسبِ موقع جب چاہیں ایصالِ ثواب کر سکتے ہیں۔ تاہم ہر کام کا ایک موقع اور سلیقہ ہوتا ہے۔ اگر اس کو لازم نہ سمجھا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ باقی نہیں رہتا۔ سویم، چہلم، چھ ماہی، برسی محض رسمی طور پر یہ تاریخیں رائج ہیں۔ بنظرِ سہولت یہ مقرر کی جائیں تو مضائقہ نہیں کہ ہر کام کا کوئی نہ کوئی وقت ہوتا ہے۔ ورنہ ان میں کوئی لزوم نہیں ہے۔ لزوم سمجھنا غلط ہے۔ علیٰ ہذا ایصالِ ثواب کے موقع پر تقریب رچانا۔ کنبہ برادری جمع کرنا۔ دعوت کرنا۔ استطاعت نہ ہو تو قرض دام کرنا۔ اور اس تقریب کو لابد سمجھنا۔ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ یوں بنظرِ تعلقات و بصورتِ گنجائش احباب و اقربا شریک ہوں تو یہ ایک معاشرتی صورت ہے۔ اور عدمِ گنجائش کی حالت میں یہ بھی فضول ہے۔ کارِ ثواب کی آڑ میں اسراف کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تو بعض لوگ بے زار ہو کر کارِ ثواب ہی سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ لیکن افراط و تفریط دونوں صورتیں مضر ہیں۔ اچھا کام اچھے طریق پر کرنا صراطِ مستقیم ہے۔

یہ کوئی اپنی خودستائی نہیں بلکہ حدیث شریف ہے کہ برنی کھجور بہت

۱۳۵۲ھ

بہتر ہے۔ مدینۂ منورہ میں بڑی مقبولِ خاص و عام ہے۔ ۱۰ محرم
کو کھجور کے کئی ٹوکرے منگوائے۔ حرم شریف میں بیٹھ کر حضرت امام حسینؑ کی
فاتحہ دی۔ بابُ النساء پر تبرک تقسیم ہوا۔ عشرہ محرم کو پھر حرم شریف میں
بابُ النساء پر (شربت کی) سبیل لگی۔ نامِ حسینؑ پر لوگ ٹوٹ پڑے۔
۱۲ محرم کو مدینۂ طیبہ میں حلیم پر سیدُ الشہداءؓ کی فاتحہ ہوئی۔ یہاں حلیم بھی
بہت عمدہ پکاتے ہیں۔ مکان پر شب بھر حلیم پکا۔ کچھ احباب میں اور باقی غریبوں
میں تقسیم ہوا۔ ہم کو تو کسی نے روکا نہ ٹوکا۔" (صراط الحمید حصہ دوم للبرقی
ص ۲۷-۱۵۰-۱۸۶) (ماہ محرم ۱۳۸۰ھ میں اس خادم کو بھی مسجدِ نبویؐ اور
مدینۂ طیبہ میں بلا روک ٹوک ان نیازوں کی سعادتیں حاصل ہیں۔ (ربنا
تقبل منا المؤلف حلیم)

(۴۳) نیاز کی تخصیص و تعمیم

بعض کج فہم نیاز، نذر، فاتحہ، ایصالِ ثواب کو شرک، بدعت، حرام قرار دیتے
ہیں۔ اور ان میں بعض کھاتے بھی ہیں تو ہچکچاتے ہوئے، گویا فعلِ حرام کے
مرتکب ہو رہے ہیں۔ نیاز کا اصول یہ ہے کہ فاتحہ، نیاز دینے میں اگر جملہ نام
لئے جائیں تو ہر ایک کو برابر ثواب پہنچتا ہے۔ اگر ایک بزرگ کے نام سے نیاز
دیں تو ایک ہی کو ثواب پہنچتا ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ
کا مسلک بہت فطری ہے کہ تعمیم میں ہر ایک کو برابر ثواب پہنچتا ہے۔ لیکن
تخصیص میں جن بزرگ کے لئے ایصالِ ثواب کیا جائے اُن کو خاص مسرت
ہوتی ہے جو تعمیم میں نہیں ہوتی۔ گویا کہ ربط کی تعمیم میں وہ قدر نہیں ہوتی جو
تخصیص میں ہوا کرتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی ہماری دعوت خصوصیت سے
کرے تو ہم کو داعی سے خاص مسرت و خصوصیت ہوگی اور اہتمام کے ساتھ

جانا لازمی سمجھیں گے۔ لیکن اگر بہتوں کی دعوت ہے تو ہم جی چاہا تو جائیں گے
ورنہ نہیں۔ اور ہم کو داعی کی طرف خاص توجہ اور اُس سے تخصیص نہ رہے گی
دفتر سوم مکتوب ۲۸ میں حضرت مجددؒ یوں فرماتے ہیں۔
جب میت کے لئے صدقہ کی نیت کریں تو اوّل آنحضرت صلعم کے لئے
ایصالِ ثواب کی نیت سے ہدیہ کا ایک حصہ جدا کریں۔ بعد ازاں اس میت
کے لئے ایصالِ ثواب کریں۔ کیونکہ حضورؐ کے حقوق تمام حق داروں کے
حقوق سے بڑھ کر ہیں۔ اور آپ کے طفیل اور وسیلہ سے فاتحہ قبول ہونے کی
امید ہے۔ ایصالِ ثواب میں اگر بغیر شرکت کے کسی ایک بزرگ کے نام پر نیاز
دی جائے تو وہ اپنی طرف سے اس نیاز کو تحفہ اور ہدیہ کے طور پر حضور انور صلعم
کی خدمت میں خود پیش کریں گے اور اُس کے وسیلے سے حضورؐ کے پاس سے
برکات و فیوض حاصل کریں گے۔ اس طرح شرکت میں ایک درجہ ثواب ہے۔ اور
عدم شرکت اور تخصیص کی صورت میں دو دو درجے"۔
فرمایا۔ قبرستان میں کسی ایک بزرگ کے پاس زیارت کے لئے جائیں
تو بعض حضرات میں ایسا ملکہ ہوتا ہے کہ تعمیم کے باوجود تخصیص کو باقی رکھتے
ہیں۔ اور بعض تعمیم میں تخصیص کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ بعض تخصیص و تعمیم
دونوں کو ساتھ چلاتے ہیں۔ یہ اپنا اپنا ذوق ہے۔
دعوت کا فطری اصول اس عالم میں بھی یہ ہے کہ مہمانِ خاص کے عزیز،
دوست بلکہ خدام تک نہ چھوٹنے پائیں۔ پھر کیسی شرمندگی کی بات ہوگی اگر حضورؐ
کی نیاز میں ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیت اطہارؓ کو شامل نہ کریں۔
ایک صاحب نے کہا۔ ایصالِ ثواب کے مستحق غربا اور گنہگار ہیں، نہ کہ
انبیاءؑ و اولیاءؒ۔ فرمایا۔ انسانی فطرت ہے کہ کوئی فقیر مسکین آتا ہے تو حسبِ حال

اس کو تھوڑا بہت دے کر رخصت کرتے ہیں لیکن اگر کوئی بزرگ، استاد، لیڈر یا قائد مہمان ہو تو خاص اہتمام اور تعظیم و تکریم کے ساتھ ضیافت کرتے ہیں۔ نذر پیش کرتے ہیں۔

(۴۴) چیالنج

حق و باطل کے تصفیے کے لئے کسی جذباتی چیالنج کو حضرت نامناسب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک بڑے صاحبِ کشف بزرگ نے کچھ اہلِ تبرّی کو ایسے تصفیہ کے لئے چیالنج دیا۔ اس پر فرمایا۔ یہ مسنون طریقہ نہیں کہ مقابلہ کے ذریعے تصفیہ کیا جائے۔ ورنہ حضورؐ اور اکابر اس پر عمل کرتے اور دشمن عذاب و لعنت میں فوراً گرفتار ہو جاتے۔ ہمارا کام صبر و استقامت ہے کیونکہ اس عالم میں باطل کے اقتضاءات کو ڈھیل دی گئی ہے۔ ہمارے اصول کے لحاظ سے ان پر لعنت بھی نہیں بھیج سکتے

(۴۵) حضرت علیؓ کا دین میں مرتبہ

ناچیز نے عرض کیا۔ کیا وجہ ہے کہ حضرت علیؓ ہی سے باطنی علوم کا فیضان چلا حالانکہ دیگر خلفاء راشدینؓ اور صحابہؓ موجود تھے فرمایا۔ واقعہ تو یہی ہے۔ البتہ حضرت خواجہ نقشبندؒ کا سلسلہ حضرت صدیق اکبرؓ تک پہنچتا ہے۔ بڑے بڑے صحابہ صدیقیت کے مقام پر فائز تھے۔ ممکن ہے اوروں سے بھی سلسلے چلے ہوں جو بعد کو ختم ہو گئے۔ باطنی فیوض کا سرچشمہ خاص حضرت علیؓ باب العلم ہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کا قرآنی جواب تو صرف ایک ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (۴/۲۱) اللہ کا فضل ہے۔ جسے چاہا دیا۔ اس خاندان کو خاص شرف بخشا کہ فیضانِ نبوتؐ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی اولاد کے ذریعے عالم میں پھیلا۔ اکثر اکابرِ دین حضرت علیؓ ہی کی اولاد (سادات) میں ہوئے

حضرت علیؓ کو تعلیم و تبلیغ سے طبعی مناسبت تھی۔ رسول اللہؐ کے ساتھ بچپن سے آخر وقت تک لپٹے رہے۔ اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا کی نعمت سے سرفراز رہے۔ حضورؐ نے آپ کے متعلق یہ بھی فرمایا تیرا گوشت میرا گوشت اور تیرا خون میرا خون ہے۔ میں جس کا مولیٰ ہوں۔ علیؓ اُس کا مولیٰ ہیں۔ بچپن سے حضرت علیؓ اُن کے والد حضرت ابو طالبؓ اُن کی والدہ فاطمہ بنتِ اسدؓ، پھر حضرت فاطمہ خاتونِ جنتؓ، پھر حسنینؓ قمرینؓ سب حضورِ انورؐ سے لپٹے ہوئے تھے۔ ان پر کل وقت معیّت و عنایت رسولؐ کی انتہا تھی۔ اسی لئے سب سے زیادہ فیضان کا منبع یہی بنے۔

حضورِ انورؐ کی اولاد صرف حضرت فاطمہؓ سے چلی۔ حضرت خدیجہؓ میں فدائیت اور محبوبیت، حضرت عائشہؓ میں علم و محبوبیت کی تجلّی تھی۔ بعض لوگ شیعوں کی ضد میں حضرت فاطمہؓ کے بجائے حضرت عائشہؓ ہی سے محبت کرتے ہیں۔ اُنھیں ربط معلوم نہیں۔ اسی لئے میں نے حضورؐ سے عرض کیا۔ ازواجِ مطہراتؓ، صحابہ کرامؓ، اولیائے عظامؒ کے جو مقامات و مرتبے آپ کے نزدیک ہیں مجھ پر محقق ہوں۔ اور مجھے بھی آپ کے علم و ربط کے لحاظ سے محبت ہو۔ بفضلہ دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ ہر دربار میں حاضر ہونے پر ایسا معلوم ہوا کہ گویا ہم اُسی در کے ہیں۔ ہر صحابیؓ نے اپنی موزونیت و اقتضاء کے لحاظ سے دین کی خدمات انجام دیں۔ حضرت صدیقؓ نے ارتداد و افتراق سے دین کو بذریعہ جہاد بچایا۔ حضرت عمرؓ نے حکومت میں خوب توسیع دی۔ اسلام کی خوب اشاعت کی۔ حضرت عثمانؓ نے بے دریغ مال اسلام پر صرف کیا۔ اور حضرت علیؓ نے فیضانِ باطنی کے ذریعے تبلیغِ اسلام کی۔

(۴۶) حضرت خاتونِ جنّت رضؓ کے اعمال

حضورِ انورؐ کا حضرت خاتونِ جنّت رضؓ کو یہ فرمانا کہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے لئے تمہارے عمل کام آئیں گے۔ یہ فرمان انتہائی قرب کو ظاہر کرتا ہے لیکن بعض لوگ اسے پڑھکر جہالت و نادانی سے حضورؐ کے شفیع نہ ہونے کو ثابت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ اے فاطمہ! تمہارا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ میں بھی بیچ میں نہیں ہوں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ وہ مقام قرب ہے جہاں اللہ تعالیٰ سے حضرت خاتونِ جنّت رضؓ کا ربط ایک خاص نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ بیچ میں نہیں ہیں۔ اس کا منشا ہرگز شفاعت کا بُطلان نہیں بلکہ انتہائی قرب کا اظہار ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک وزیرِ اعظم پورے ملک میں حکومت کر رہا ہے۔ ملک میں سب مخلوق کو نفع یا نقصان پہنچا رہا ہے لیکن اپنے بیٹے کا معاملہ آنے پر کہتا ہے۔ تمہارے لئے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم جانو اور بادشاہ جانے۔ ایسی صورت میں غور کرو۔ بادشاہ کی محبت و توجہ کس درجے وزیر کے بیٹے پر ہوگی۔ لازماً انتہائی توجہ کرے گا۔ اور اُسی کی خاطر بطور خود اس کی پرورش و ترقی کا انتظام کر دے گا۔

(۴۷) (الف) حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ

جہاد دراصل امرِ الٰہی کی تعمیل کا نام ہے۔ نہ محض لڑنے کا، نہ محض خاموش رہنے کا۔ قرآن میں ہر مقام اور ہر مرتبہ کی تعلیم ہے۔ لوگ نادانی سے اکابر پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ حضرت امام حسنؓ آرام پسند، صلح

پسند تھے۔ لڑے نہیں۔ اور چھوٹے بھائی حضرت امام حسینؓ کی شجاعت کی تعریف کرتے ہیں۔ اُنہیں نہیں معلوم کہ قرآن میں کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (پ۵) یعنی (جنگ سے) ہاتھ روکو، نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو، کی بھی تعلیم ہے اس محل کی مناسبت سے منشا پاکر حضرت امام حسنؓ خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ اور جہاد سے رُک گئے۔ دولت و ثروت کی بنا پر خوب زکوٰۃ دیتے تھے۔ خیر خیرات کرتے تھے۔ اس کے برخلاف جَاھِدُوْا کے حکم کے تحت حضرت امام حسینؓ نے جہاد فرمایا۔ اور آیات وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ (پ۲) کا حق ادا کر کے اس کے مصداق بنے۔ اس لئے دونوں کے مرتبے بلند ہیں۔ دونوں نے قرآن کا حق ادا کیا۔ قرآن ہر ایک کی فطرت کے مطابق علم دیتا ہے۔ انسان فطرت کا آئینہ ہے۔

(ب) نسبتِ حسینؓ

حضرت امام حسینؓ بڑی قوی نسبتوں کے جامع ہیں۔ راہِ حق میں آپ نے بے نفسی، فدائیت اور قربانی پیش کی۔ اس کی وجہ سے اِن نسبتوں کی قوت دوبالا ہو گئی اور محبوبیت پر محبوبیت۔ تاریخی و واقعاتی اعتبار سے سب کا اتفاق ہے کہ عبدیت کی سب سے جامع آیات وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ کا حق آپ کے سوا اُمّت میں اس درجہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ اسی سے اُمّت میں آپ کی رفعت ہے۔ فوج کا فخر کمانڈر پر ہوتا ہے۔ سب تو کمانڈر نہیں ہوتے۔

(ج) سجدۂ امانت

سجدۂ حسینؓ امانت کا وہ آخری سجدہ تھا جو منجانب صدیقین، شہداء، صالحین اُمّت بطور فرضِ کفایہ آپ نے پیش فرمایا۔ بظاہر سرِ مبارک خاک پر تھا حالانکہ وہ عرش سے بالا تھا۔ کیونکہ اس وقت کا سجدہ عرش پر تھا۔ عرش پر سر رکھیں تو ظاہر ہے عرش سے بالا ہوگا۔ حضرت نے جہاد کے لئے جلال کی تلوار

اس مرتبہ کی یافت اور اس مقبولیت کی سرفرازی کُلّی طور پر حضرت امام حسینؓ کے واسطے مخصوص تھی کہ پنجتن پاک میں سب سے چھوٹے ہیں۔ سب کے پیارے ہیں۔ راج دُلارے ہیں۔ سُبحان اللہ (اقتباس از صراط الحمید للبرنی جلد اول ص ۸۴) ۔ سمجھیں تو دل والوں کو استقامت کا سبق مل جائے علم والوں کو عبدیت کی شان نظر آجائے۔ حسینؓ کی محبت کہیں سے کہیں پہنچائے

اُموی اور عباسی خلفاء کے زمانے میں گیارہ بڑے بڑے ائمہ (سادات) میں سے اکثر کو شہید کیا گیا تو بالآخر بڑی شان سے حضرت غوث اعظمؓ حضرت امام حسنؑ کی اولاد میں تشریف لائے۔ جس طرح حضرت اسمٰعیل میں حضورؐ انور تشریف لائے۔ آپ جلال کی تلوار ثابت ہوئے۔ جس جس نے آپ کی شان میں ذرا بے ادبی کی، بڑے بڑے مقامات کھو دیئے۔ حتیٰ کہ ایمان بچا لے جانا مشکل ہو گیا۔ حضرت دراصل بے ارادتی کے مقام پر فائز تھے۔ فرماتے ہیں۔ اگر کوئی دعا اپنی ارادت سے میں نے عمر بھر میں مانگی تو وہ یہ تھی۔ یا اللہ! مجھے ایسا رکھ کہ تیرے سوا مجھے کوئی نہ جانے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے عالم میں حضرت غوث اعظمؓ کے ڈنکے بج گئے اور جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ آپ جلالِ الٰہی کی ایک تلوار ہیں جو فرش سے عرش تک چلی گئی ہے۔ اور ہزاروں بدعقیدہ آپ سے ٹکرا کر ختم ہو رہے ہیں۔ جہنم واصل ہو رہے ہیں۔ اسی لئے قادری نسبت سے کوئی ٹکر نہ لے ورنہ خاتمہ خراب ہو جاتا ہے۔

غور کیجئے تو خاندانی حیثیت سے حضرت رسول کریم کی حضرت ابراہیمؑ سے جو فیضانی نسبت واقع ہوئی ہے، اسی قسم کی نسبت حضرت غوث اعظمؓ کو حضرت رسولِ کریمؐ سے حاصل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو صاحبزادے

اُٹھائی تھی جس میں شہادت واقع ہوئی۔ حضرت جبرئیلؑ نے آپ کا سر سنبھالا۔ اس شہادت پر قیامت برپا ہونا لازم تھا۔ جب حضرت شعیبؑ کی اونٹنی کی ٹانگ کاٹنے پر قہر و جلال کے ساتھ عذاب آیا تو حضورؐ کے محبوب نواسے کے ساتھ یہ غضبناک واقعہ پیش آنے پر قیامت ہونی تھی لیکن حکمت کے تحت ظالموں کو مہلت دی گئی۔ اس شہادت کے آثار ہر دو عالم کے لئے ظاہر ہوئے۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ رَحۡمَۃٌ (۲/۲)

(۴۸) حضرت امام حسینؑ اور حضرت غوثِ اعظمؓ

فرمایا۔ اسلام میں دو نسبتوں سے ٹکر لینا نہایت خطرناک ہے۔ یہ زہر ہلاہل ثابت ہوتی ہیں۔ ایک حسینی نسبت۔ دوسری قادری نسبت۔ حسینی نسبت میں راہِ حق میں مظلومیت کی انتہا ہے۔ اس لئے محبوبیتِ الٰہی کی بھی انتہا ہے۔ چنانچہ محبت، کرم، جلال کی ساری نسبتیں اُس طرف منعطف ہوتی ہیں۔

آپ سید الشہداء ہیں کہ صبر و توکل تسلیم و رضا کے تمام مقامات عجب آن بان سے عجب تزک و شان سے طے کر کے اپنے نانا کی اُمتِ مرحومہ کے واسطے عبدیت کے راستے آسان کر دیئے۔ اللہ کی راہ میں صداقت کی چاہ میں، مال جائے، آل جائے، آبرو جائے، جان جائے۔ ہر قدم پر سید الشہداء دل بڑھانے اور راہ دکھانے کے واسطے موجود ہیں۔ خالق ان پر صلوٰۃ بھیجتا ہے۔ مخلوق ان پر سلام بھیجتی ہے۔ ان کے ہاں رحمت برستی ہے۔ کربلا میں ہدایت بستی ہے۔ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ .... وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ (۲/۳) ۔ اس حقیقت کی تجلی، اس مقام کی استقامت،

ہیں۔ بڑے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل اور چھوٹے صاحبزادے حضرت اسحٰق دونوں نبی زادے ہیں۔ اور نبی ہیں لیکن چھوٹے صاحبزادے کی نسل میں انبیائے بنی اسرائیل کا خوب سلسلہ چلتا ہے اور مدت تک بڑے صاحبزادے کی نسل خمول میں رہتی ہے۔ حتیٰ کہ بنی اسمٰعیل میں رسول کریم تشریف لاتے ہیں تو بنی اسرائیل کے طرفداروں کو ناگوار گذرتا ہے یہاں تک کہ رسول کریم کے نسب سے انکار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ انکار و مخالفت آج تک جاری ہے۔ علیٰ ہذا خاندانی حیثیت سے حضرت رسولِ کریم کا فیضانِ نبوت حضرت امام حسن رض اور حضرت امام حسین رض علیہما السلام ان ہی دو ائمہ کے ذریعے عالم میں پھیلا کہ دونوں آلِ نبی اولادِ علی رض ہیں چھوٹے صاحبزادے کی نسل میں ائمہ کرام کا سلسلہ چلا۔ اور خوب چلا۔ مگر بڑے صاحبزادے کی نسل مدت تک خمول میں رہی۔ حتیٰ کہ حسنی رض فیضان کا چشمہ اُبلا اور ایسا اُبلا کہ ماشاء اللہ۔ پھر بھی حضرت غوثِ اعظم کو ائمہ کرام سے غیر سمجھ کر جس طرح انکار و مخالفت کی نوبت پہنچی سب کو معلوم ہے۔ اور آج تک انکار و مخالفت جاری ہے۔ خلاصہ یہ کہ فیضان ابراہیمی اور فیضانِ محمدی دو دو صاحبزادوں کے ذریعے جس طرح نسلاً بعد نسلٍ عالم میں نمودار رہا۔ اس میں عجب مشابہت بلکہ مماثلت ہے۔ اور کیوں نہ ہو ملتِ ابراہیمی اور ملتِ محمدی دونوں ایک ہیں۔ (اقتباس از صراط الحمید للبرنی ص ۵۹)

حضرت غوث اعظم رض کی زندگی

(۴۹) حضرت غوث اعظم کا دبدبہ

میں رعب، دبدبہ، سطوت، نمایاں رہے۔ سلاطین و اُمرا کانپتے تھے۔ اولیاء، غوث، اقطاب تھرتھراتے

تھے۔ جب غوث، اقطاب آتے تو دروازے پر عرض کرتے۔ اَلْاَمَانُ یَا غَوْثَ الزَّمَانْ تو حضرت فرماتے اَمَانٌ لَّکُمْ۔ تب اندر داخل ہوتے۔ آج بھی باطنی کیفیت کا یہی عالم قائم ہے۔ اولیاء اسی طرح عرض کرتے ہیں۔ حضرت سے بعض لوگ عرض کرتے۔ حضرت۔ کچھ تو نرمی کیجئے۔ اتنی شدّت سے لوگ گھبرا جائیں گے۔ تو حضرت فرماتے۔ نہیں۔ اس محل کا اور اس زمانہ کا اقتضا ہی ایسا ہے کہ نرمی نہ برتی جائے کیونکہ ابتداء سے اب تک اولیاء اللہ کو ذلیل کیا گیا۔ گیارہ ائمہ میں سے اکثر کو یا تو شہید کیا گیا یا زہر دیا گیا لہٰذا میں غیرتِ الٰہی کی ایک تلوار ہوں۔ جو ذرا بھی بے ادبی کریگا کٹ جائیگا۔ غیرتِ الٰہی میں بندے کا اختیار نہیں۔ اسی لئے آپ کا لقب ہی سَلَّابُ الْاَحْوَالْ ہے۔ ذرا سی بے ادبی پر معارف چھین جائیں دین و دنیا برباد ہو جائے۔ اللہ محفوظ رکھے۔ (آمین)

ایک بڑے ولی اللہ نماز جمعہ کے لئے گھوڑے پر سوار ہوئے۔ اُنھیں کشف ہوا۔ ابھی حضرت غوثِ اعظم رض نماز کو روانہ نہیں ہوئے۔ فوراً اتر پڑے اور جب حضرت سوار ہوئے تو پھر یہ سوار ہو کر مسجد گئے۔ یہ تھا ادب اور یہ بھی حضرت کی رفعت۔ حضرت سیّد احمد رفاعی رح ہم عصر تھے۔ حضرت غوثِ اعظم رض کی اجازت کے بغیر کسی دعوت میں شریک نہ ہوتے۔ خلیفۂ وقت کے ولی عہد کی شادی ہوئی۔ سب اکابر کو دعوت دی گئی۔ لیکن حضرت نے شرکت نہیں فرمائی۔ اور حضرت احمد رفاعی رض بھی منشا پا کر نہ گئے۔ ختمِ ضیافت پر معلوم ہوا کہ حضرت غوثِ اعظم رض تشریف نہیں لائے تو خلیفہ نے اسی وقت دولہا کے سر پر خوانِ نعمت رکھوا کر بھیجا اور کہلایا خادم بھی حاضر ہوتا لیکن انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔

حضرت کے قدم باعثِ سعادت ہوں گے۔ اس انکسار پر حضرت اپنے ساتھ حضرت احمد رفاعی کو لے کر پہنچے۔ خلیفہ اور ولی عہد نے خادموں کی طرح کمر کس کر کھانا کھلایا۔ یہ تھی حضرت غوثِ اعظم رضہ کی جبروت و سطوت۔ سرکش عباسیوں سے معاملہ پڑا تھا جن کی سرکوبی ضروری تھی۔ ولایت میں آپ کا مقام یہ کہ آپ کو قَدَمِیْ هٰذِهٖ عَلٰی رَقَبَةِ کُلِّ وَلِیِّ اللّٰہ کی شان عطا ہوئی۔ آپ کے خطبات کا طرز بھی پُر ہیبت ہے۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں محل و وقت کا اقتضا ایسا تھا کہ حضرت خواجۂ اعظم رح اجمیری نے اصلاح کے لئے محبت کا راستہ اختیار فرمایا۔ جب کہ بغداد میں رعب کی پالیسی تھی۔ لیکن حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح کے زمانے میں رعب کا اقتضا آیا۔ پھر نظام الدین محبوب الٰہی رح کے زمانے میں محبت کا غلبہ رہا۔ لیکن آپ کے رعب سے بھی چھ سلاطین کی گردنیں جھکی رہیں۔ پھر حضرت نصیر الدین چراغ دلی رح کے زمانے میں رعب داب رہا۔

حضرت مجدد الف ثانی رح فرماتے ہیں کہ اس راستہ میں تمام اقطاب و نجباء کو فیوض و برکات حضرت غوث اعظم قدس سرہ ہی کے وسیلہ شریف سے پہنچتے ہیں (مکتوب ۲۳ جلد سوم)۔

مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں۔ "اولاً ائمہ اثنا عشر بالترتیب واسطۂ فیضِ ولایت تھے لیکن اب حضرت غوثِ اعظم رضہ واسطۂ فیض ولایت ہیں۔ یوں تو امت میں بہت سے کامل اولیاء گذرے لیکن آپ کے برابر کرامات کسی سے ظاہر نہیں ہوئے۔ جب میں (حضرت مجدد رح) نے حضرت غوث اعظم کا یہ فرمودہ سنا کہ میں قضائے مُبرم تک میں اللہ کے حول و قوت سے تصرف کرتا ہوں" تو مدت تک یہ بات میرے ذہن میں رہی چنانچہ

یہ مقام مجھ پر بھی منکشف ہوا۔ (مکتوب ۲۱۷ جلد اول) حضرت غوث اعظم رضہ کی ذرہ نوازی کا یہ عالم کہ فرمایا۔ اگر میرے غلام کا ستر چین میں بھی کھلے تو میں اُسے ڈھکتا ہوں۔

حضرت مجدد الف ثانی رح اپنے رسالہ مبداء و معاد میں فرماتے ہیں۔ اس عروج آخر میں جو مقاماتِ اصل میں عروج ہے (مجھ درویش کو) حضرت غوث اعظم محی الدین شیخ عبدالقادر قدس اللہ سرہ الاقدس کی روحانیت سے مدد حاصل رہی۔ اور حضرت نے قوتِ تصرف سے ان مقامات سے گذار کر اصل الاصل تک پہنچایا۔ اور اس مقام سے پھر اس عالم (نزول) تک واپس فرمایا جس طرح ہر مقام (عروج) سے واپس فرماتے رہے۔

یہ بے ادب اللہ کی قدرت کیا سمجھیں گے۔ رسول اللہ کو کیا پہچانیں گے۔ جب کہ انہیں غلامانِ رسول کی قدرت دیکھنی سمجھنی نصیب نہیں۔ نہ صلاحیت ہے نہ نظر ہے اور نہ ایمان۔

۵۰۔ حضرت غوث اعظم کا پرتو

مُرشدی و مولائی حضرت مولانا الیاس برنی رح کی زندگی میں اپنے آقا حضرت غوثِ اعظم رضہ کی نسبت کا پرتو خاصا نمایاں تھا۔ غیر معمولی رعب و جلال عطا ہوا تھا۔ بڑے بڑے وزراء، اُمراء، عہدہ دار، مشائخین، علماء آپ سے مرعوب رہتے۔ حاضری حوصلہ طلب تھی۔ ایک طرف مزاج میں بے حد شفقت، نرمی، ملائمت تھی۔ تو دوسری طرف دبدبہ اور ہیبت کا یہ عالم کہ بڑے بڑوں کو بے تکلف ہونے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اچھے اچھے ماہر تقریر، گفتگو یا بحث کے منصوبے بنالاتے لیکن دو منٹ میں سب سوچا ہوا رفوچکر ہو جاتا۔ لطف یہ کہ بظاہر رعب داب، ہیبت کے لوازم نہ تھے۔ مثلاً بہت بڑا عہدہ یا لباس۔ حشمت و شان وغیرہ۔ وزراء تک سے ورانڈے

میں سادگی سے ننگے سر، کرتہ، پاجامہ، سلیپر پہنے ہوئے ملتے۔ چپراسی تک سے خوب ہنسی خوشی شفقت سے گفتگو فرماتے۔ لیکن اگر حضرت خاموش ہو جاتے تو کسی کو بولنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پھر اس رعب کے ساتھ مقبولیت کا یہ عالم کہ کثرت سے لوگ فدا رہتے آپ سے محبت رکھتے بلکہ ملنے کے مشتاق رہتے۔ ماشاءاللہ

عام طور پر بڑے لوگ تقریبوں میں جلسوں میں تعظیم اور سلام کے متمنی رہتے ہیں۔ بڑوں کو سلام کرتے ہیں اور چھوٹوں سے سلام وصول کرتے ہیں۔ لیکن حضرت کی اُفتادِ طبع اِس کے خلاف تھی۔ مجلس میں جہاں موقع ملتا بیٹھ جاتے، جو سامنے آتا آزادی سے مل لیتے۔ بعضوں کے نفس موٹے ہوتے اُن کی اصلاح کے مدِنظر نہ ملتے، چاہے وہ وزیرِ اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ یا اگر ملتے تو کچھ تُرشی چھوڑ دیتے تاکہ نشہ اُتر جائے۔ اِس سلسلے میں ایک دفعہ اِس ناچیز نے گفتگو کی تو فرمایا۔ اِس زمانے کا اور اِس محل کا اقتضا ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جس کے تحت ہم نے ایسی زندگی بسر کرنی شروع کی ہے۔ اللہ حافظ ہے۔

(۵۱) یا پیر غوث الاعظمؓ

فرمایا۔ ہمارے سلسلے کے ایک بہت بڑے بزرگ حضرت کمال الدین شاہؒ نے حضرت غوث اعظمؓ کی شان میں نہایت بلند پایہ نظمیں لکھی ہیں۔ جن کو بڑے حضرت قبلہ (حضرت کے دادا پیر) مستانہ وار جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ "یا پیر غوث الاعظمؓ" لیکن بعض وہابی منش صوفیوں کے نزدیک یہ شرک ہے۔ حضرت غوث الاعظمؓ دراصل اسماء و صفاتِ الٰہی کی خاص تجلی ہیں جس پر یہ نظر نہیں کرتے۔ کیونکہ وہاں حضرت کی عظمت سمجھ میں آئیگی جو ان کے خیال میں شرک ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ یہی لوگ اپنی اَنّیت قائم رکھ کر وجود کی یافت و شہود کا مراقبہ کرتے ہیں اور اَنا الحق کہتے ہیں تو اس میں اُنھیں شرک نظر نہیں آتا۔ حالانکہ اِس اَنا الحق کہنے میں اُن کی اَنّیت پنہاں رہتی ہے۔ اور یہ شرک ہے۔ "یا شیخ

عبدالقادر جیلانی شَیْئاً لِلّٰہ" کا وظیفہ تو اولیاء اللہ میں مشہور و رائج ہے

(اپنے رسالہ "مسائلِ نزاعی در بارۂ مولود شریف، عُرس و سماع، فاتحہ، ندائے غیر اللہ وغیرہ" میں حضرت شاہ محمد امداد اللہ دیوبندی مہاجر مکیؒ (جو بہت سے اکابر علمائے ہند کے پیر و مرشد ہیں) مسئلہ ندائے غیر اللہ کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں۔ للمؤلف حلیم)

"جو ندا نص میں وارد ہے مثلاً یا عِبَادَ اللہِ اَعِیْنُوْنِیْ (ترجمہ۔ یا بندگانِ خدا میری مدد فرمایئے) وہ بالاتفاق جائز ہے اور یہ تفصیل حقِ عوام میں ہے۔ اور جو اہلِ خصوصیت

. . . .

میں، اُن کا حال جدا ہے۔

اور حکم بھی جدا کہ اُن کے حق میں یہ فعل عبادت ہو جاتا ہے۔ جو

. . . .

خواص میں سے ہوگا خود سمجھ لے گا، بیان کی حاجت نہیں۔ یہاں سے معلوم ہو گیا حکم وظیفۂ "یا شیخ عبدالقادر شَیْئاً لِلّٰہ" کا۔ لیکن اگر (حضرت) شیخ کو متصرفِ حقیقی سمجھے تو مُنجر اِلی الشرک ہے۔ ہاں اگر وسیلہ و ذریعہ جانے۔ یا اِن الفاظ کو با برکت سمجھ کر خالی الذہن ہو کر پڑھے تو کچھ حرج نہیں۔ یہی تحقیق ہے اِس مسئلہ میں۔"

(۵۲) عطیۂ قادریہ

بفضلِ تعالیٰ بغداد شریف میں آستانۂ عالیہ قادریہ پر حاضری نصیب ہوئی تو دل کی تمنا تھی۔ دعا بھی کریں تو ماشاءاللہ متعدد اسمائے غوثیہ مدتوں سے مروی و مقبول ہیں۔ لیکن کچھ ایسے اسماء اس ناچیز کو بھی عطا ہوں جن سے اپنے ذوق کے موافق حضرت پیرانِ پیر غوثِ اعظمؓ کی شان کا عرفانی مُرقع جو مُعنًا مرتب و مربوط ہو۔ ذہن میں آکر دل میں سما جائے کہ قادری فیضان کا دائرہ وسیع ہو۔ اور اللہ رسولؐ کے ساتھ مقربین کے مقام و مراتب سے بھی رابطہ ترقی کرے۔ الحمدللہ! اسمائے غوثیہ کی تمنا اور دعا بعد

کو جلد پوری ہو گئی۔ چنانچہ خاص احباب میں ان کی تقسیم بھی ہوئی اور امسال یازدہم شریف کی مبارک تقریب میں یہ عطیہ بطور تحفہ پیش ہے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔

خادم محمد الیاس برنی قادری

بیت السلام۔ سیف آباد۔ حیدرآباد

۱۱ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ م ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء (مطبوعہ رقعہ کی نقل)

(۵۳) اسمائے غوثیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ (شوریٰ ع۲) وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (حج ع۱۰)

نوٹ:- **اسمائے غوثیہ** کے مطبوعہ رقعے کے پہنچتے ہی حضرت پیر سید ابراہیم نقیب الاشراف بغداد شریف، حضرت پیر جمال الدین بغدادی (بمبئی)، حضرت پیر سید یوسف گیلانی بغدادی پیر آف وانا۔ وزیرستان اور حضرت پیر سید ابو النصر حموی بغدادی اور دیگر اولیائے وقت نے نہایت مسرت کا اظہار فرمایا۔ مبارک باد دی بلکہ لکھا کہ آئندہ سے ہم اپنے مریدین کو اسمائے غوثیہ عطا کریں گے۔ یہ سب حضرات اور مدینہ طیبہ اور بغداد شریف میں صاحبزادگانِ والا شان اور دیگر اولیاء اللہ اکثر فرماتے تھے۔ اس وقت آپ حضرت غوث اعظم کے سب سے بڑے محب اور سب سے بڑے محبوب ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (عنکبوت ع۷) اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۱/۱۲)

سَيِّدُنَا وَسَنَدُنَا وَمَوْلٰنَا ۔ اَلْغَوْثُ الْاَعْظَمُ

(۱) اَلسَّيِّدُ مُحْيُ الدِّيْنِ نُوْرُ اللّٰهِ (۲) اَلصِّدِّيْقُ مُحْيُ الدِّيْنِ اَمِيْنُ اللّٰهِ

(۳) اَلْمُحْسِنُ مُحْيُ الدِّيْنِ اَمَانُ اللّٰهِ (۴) اَلْمُخْلِصُ مُحْيُ الدِّيْنِ وَلِيُّ اللّٰهِ

(۵) اَلْمَحْبُوْبُ مُحْيُ الدِّيْنِ صِبْغَةُ اللّٰهِ (۶) اَلْمَخْدُوْمُ مُحْيُ الدِّيْنِ مُرَادُ اللّٰهِ

(۷) اَلْقَادِرُ مُحْيُ الدِّيْنِ اَمْرُ اللّٰهِ (۸) اَلسُّلْطَانُ مُحْيُ الدِّيْنِ سَيْفُ اللّٰهِ

(۹) اَلْقُطْبُ مُحْيُ الدِّيْنِ اٰيَةُ اللّٰهِ (۱۰) اَلْغَوْثُ مُحْيُ الدِّيْنِ حُجَّةُ اللّٰهِ

(۱۱) اَلْفَقِيْرُ مُحْيُ الدِّيْنِ عَبْدُ اللّٰهِ

فَضْلُ اللّٰهِ فَضْلُ اللّٰهِ فَضْلُ اللّٰهِ

اَلصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْهِ بِعَدَدِ كَلِمَاتِ اللّٰهِ

اٰمِيْنَ اَلْخَادِمُ مُحَمَّدُ اِلْيَاس الْبَرْنِي الْقَادِرِيُّ (مطبوعہ رقعہ کی نقل)

(۵۴) مسلمان کم، کافر زیادہ کی مصلحت

ناچیز نے عرض کیا۔ مسلمان کم، کافر زیادہ کی کیا وجہ ہے۔ اور آیۃ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (۹/۱) اور حدیث سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ کا کیا مطلب ہوگا۔ فرمایا۔ اصل چیز کمیت و تعداد نہیں۔ بلکہ کیفیت ہے۔ قلت و کثرت کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں۔ روئے زمین پر انسانوں کے مقابل میں جراثیم اور حشرات الارض کی کتنی کثرت ہے۔ حکمت کے تحت اپنے محل پر جو ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے۔

یادرکھو۔ تھوڑا سونا ہزاروں من پیتل اور رانگے سے بہتر ہوتا ہے اور یہی حال کوہِ نور ہیرے اور کوئلوں کا ہے۔ اسی طرح حق باطل پر غالب ہوتا ہے۔ اور ایک نور کا مقابلہ ہزاروں ظلمتیں نہیں کر سکتیں۔ ایک ولی کا عمل دوسرے ہزاروں انسانوں کے عمل سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ صراطِ مستقیم سب سے بڑی نعمت ہے۔ اللہ نصیب کرے تو قدر ہوتی ہے مگر دوسرے لوگ باطل میں کیسے سرگرداں ہیں۔

اب رہا رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ کا مسئلہ۔ رحمت کے بغیر نہ جمال کے مظاہر وجود میں آسکتے ہیں نہ جلال کے۔ حضورؐ انور کی ذاتِ مبارک اس رحمت کے ظہور کا واسطہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۱۷/۷) شیطان اور اس کے تابعین بھی تو عالمین کا جزو ہیں۔ جو حضور کے صدقے میں وجود کی رحمت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ لیکن ہدایت کے فیض سے محروم ہیں۔ (ختم شد)

فصل پنجم

قرآن۔ بیعت و ارشاد۔ سلوکِ علمی۔ سلوکِ ذکری

۱۔ **قرآن اور علم** ۔ فرمایا۔ اسلام قرآن کا پیام ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء و صفات، اور ان کے مظاہر انبیاء اور کائنات کے حقائق و روابط اور ان کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ انسان مقصدِ کائنات ہے۔ اور اس نظام کی جان ہے۔ اسلام کے معنی اللہ تعالیٰ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور اس کے قوانین کی تعمیل ہے جو فطرت کے مطابق ہیں۔ پس اسلام کی بنیاد صحیح علم و عمل پر قائم ہے تاکہ ہم اس کے ذریعہ راہِ ترقی پر گامزن ہو کر اپنے مقاصد کو پا جائیں۔ "اسرارِ حق" میں حضرت تحریر فرماتے ہیں "علم کے بے شمار مدارج ہیں۔ بلحاظِ وسعت و بلحاظِ عمق"۔ تنگ نظری اور سطحیت سے یہی مدارج اختلافات بلکہ اضداد کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ سب ایک ہی زینہ کی سیڑھیاں اور ایک ہی راستہ کی منزلیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن کی صداقت کی بڑی علامت یہ بیان فرماتا ہے کہ اس میں ذرا سا بھی اختلاف نہیں۔ دیگر مخلوقات پر انسانی برتری و فوقیت کی بنیاد علم ہی ہے۔ اور علم ہی کی تحصیل، حفاظت اور اشاعت کے لئے پڑھنے لکھنے پر اسلام کا زور ہے۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۳۰/۲۱)

علم کے مدارج اعلیٰ ترین خالص علم وحی سے شروع ہو کر فکر

خوض، اور ظن تک نزول کرتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنی زندگی میں کشف و القا یا شرحِ صدر کا کبھی کبھی تجربہ ہوتا ہے جس سے علم وحی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ جیسے ہلکی باریک کرن سے روشن سورج کا۔ لیکن وحی کا علم اچانک، قطعی، انتہائی روشن، یقینی اور اعلیٰ ہوتا ہے جس کا دماغ سے تعلق نہیں ہوتا۔

وحی کے بعد غور و فکر کا درجہ ہے جس پر قرآن کا بے حد زور و اصرار ہے لیکن اس کا دائرۂ عمل معیّن ہے۔ ایک تو یہ کہ وحی پر ایمان رکھتے ہوئے آیاتِ اللہ میں قلب کو مشغول رکھ کر تدبّر و تذکر کرے۔ نہ یہ کہ فکر کو وحی کا مقام دیدے اور وحی کا انکار کرکے فکر کے ذریعہ اُن خاص مسائل کے حل کی کوشش کرے جو وحی کے لئے مختص ہیں، جیسے فلسفی کیا کرتے ہیں۔

البتہ فکر کو کائنات اور اُس کے طبعی قوانین و عملیات کی تحقیق میں استعمال کر سکتے ہیں۔ جن کے اکتشافات پر سائنسی علوم کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔ ترجمہ:۔ (۱) ہم نے اس مبارک کتاب کو تیری طرف اتارا ہے تاکہ لوگ اس کی باتوں پر دھیان دیں اور غور کریں اور عقل والے سمجھیں (۲۳/۱۲)

(۲) آسمان اور زمین کا بنانا، رات اور دن کا بدلتے رہنا اس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے اور آسمان زمین کی پیدائش میں دھیان کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب۔ تو نے یہ عبث نہیں بنایا۔ (۴/۱۱)

اس آخری آیت سے واضح ہوتا ہے کہ مذہبی ذہنیت، سائنسی اکتشافات کے ہرگز خلاف نہیں۔ بلکہ مذہبی ذہنیت سے سائنس کا صحیح ذوق پیدا ہونا لازمی ہے اور یہ کہ جو سائنس دان، سائنس کے دائرۂ عمل میں صحیح نقطہ نظر

پیدا کرے گا وہ لازماً مذہب کا قائل ہو جائے گا۔ اس طرح قرآن کے لحاظ سے وحی اور فکر دونوں اپنے اپنے دائرۂ عمل میں علم کے صحیح معتبر ذرائع تسلیم کئے جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف جب فکر اپنے میدان کو چھوڑ کر وحی کے دائرہ میں داخل ہو جاتی ہے اور اُن اعلیٰ مسائل کو حل کرنا چاہتی ہے جو وحی کے لئے مختص ہیں تو وہ بھٹک جاتی ہے اور خوض میں سرگردان ہو جاتی ہے جو یا وہ گوئی اور کھیل تماشے سے بڑھ کر نہیں۔ چنانچہ حکم ہے۔ فَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (۷/۱۴)۔

اخیر میں ظن یعنے گمان و قیاس کا درجہ ہے۔ چاہے صحیح ہو یا غلط۔ انسانی فطرت کا عام میلان اس ظن کی جانب ہے اور یہ غلط فیصلوں کا بڑا ذریعہ ہے۔ اسی لئے قرآن وحی کے مقابل ظن کو ناپسند کرتا ہے۔ ارشاد باری ہے۔ یہ اکثر اٹکل پر چلتے ہیں۔ اٹکل صحیح بات میں کام نہیں کرتی۔ (۱۱/۹)

مختصر یہ کہ ایمان ہی وحی کے علم کے حصول کا آسان ترین ذریعہ ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف روحانیت میں ایمان کی ضرورت ہے بلکہ مادیت اور دنیوی علوم میں بھی ایمان ضروری ہے۔ انسانی معلومات کے خزانوں کے مقابل روزمرہ کی ضروریات کے متعلق بھی ہمارے معلومات برائے نام ہوتے ہیں۔ اس لئے استفادہ کے واسطے لازماً ہم کو دوسروں کے معلومات پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ آج کل سائنس و تہذیب جس قدر ترقی کر رہے ہیں۔ اُسی قدر ہمارا ایمان اور بھروسہ دوسروں کے معلومات اور تجربات پر بڑھتا جا رہا ہے۔ لہٰذا اعلیٰ برتر زندگی میں اور بھی گہرے ایمان

کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن وحی یا ایمان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ اندھی قبولیت یا تقلید نہیں۔ بلکہ اُس کے ساتھ ہر آن غیر محدود تازہ نور آتا ہے جسے شرحِ صدر کہتے ہیں۔ جس کے ذریعہ انبیاء اور اُن کے متبعین کو حکمت وخیر کثیر ملتا ہے۔ علم لامحدود ہے علم حیات و نور ہے۔ جہل موت وظلمت کا نام ہے۔ انبیاء کرام مومنین کو نہ صرف کتاب وحکمت کی تعلیم فرماتے ہیں۔ بلکہ اُن کے قلوب کا تزکیہ کر کے ان کو حکمت کے صحیح استعمال کے قابل بناتے ہیں قرآن کا ہر ایک کلمہ اور ہر ہر حرف تصوّف ہے۔ لیکن تعجب وافسوس ہوتا ہے کہ آج کل تصوّف کی تائید میں کوئی آیت تلاش کی جاتی ہے۔ قرآن میں تصوّف کے لئے صدق کا لفظ آیا ہے اور صوفیوں کے لئے صدّیقین وصادقین کا۔ اصل علمِ قرآنی کا بحرِ زخار حضور انور کی ذاتِ مبارک ہے۔ تمام عالم کو اور غلاموں کو صرف سوئی کی نوک برابر تر کر کے علم دیا جا رہا ہے اس خیال سے کہ کہیں ڈوب نہ جائیں۔

اس خصوص میں حضرت کی کتاب "اسرارِ حق" سے چیدہ چیدہ چند ضروری مفید مطلب معلومات درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

" دینیات کی غرض وغایت تیقّن اور تقرّبِ باری تعالیٰ ہے۔ اس سے وہ حقائق معلوم ہوتے ہیں جو بوجہ اپنی رفعت ونزاکت کے عقل کی رسائی سے بالاتر ہیں۔ اور بالعموم فوق الفطرت کہلاتے ہیں۔ وحی والہام دینیات کا سرچشمہ ہیں۔ اور یقین وایمان اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ۔ عقلیات کی موشگافیاں اور کارگذاریاں بھی کافی حیرت ناک اور قابلِ داد ہیں۔ لیکن یہ مسلّم ہے کہ اس کا دور دورہ تحتانی مادّی طبقات تک محدود ہے روحانیات کے اعلیٰ طبقات میں اس کے پَر جلتے ہیں۔ عقلیات کے دو

خاص شعبے ہیں۔ حکمت (سائینس) اور فلسفہ "۔

اسی کتاب میں پروفیسر فلسفہ مولوی عبدالباری ندوی صاحب کے افادات بھی نقل کئے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

بیکن کہتا ہے، فلسفہ کا قلیل اور سطحی علم الحاد کی طرف مائل کر دیتا ہے لیکن اس کا گہرا علم مذہب سے قریب کر دیتا ہے۔

نیوٹن کا اعتراف ہے کہ عالمِ فطرت کی یہ نیرنگیاں واجب الوجود (اللہ) کے ارادہ کے علاوہ کسی اور شئے سے ظاہر نہیں ہو سکتیں۔

ٹنڈل کہتا ہے۔ سائینس قریبی علل سے پردہ اُٹھا سکتی ہے۔ لیکن علّتِ اُولیٰ (اللہ) کا پتہ لگانا سائنس کے دائرۂ بحث سے قطعاً خارج ہے

ہکسلے امام حکمیات (سائنس) کہتا ہے۔ کسی شئے کی بھی کامل توجیہہ و تعلیل نہیں ہو سکتی۔

غرض کہ سائینس کا مذہب کی حد میں داخل ہونا اس سے زیادہ محال ہے، جتنا ریل کا پانی میں، یا جہاز کا خشکی پر چلنا ہے۔ سائنس کا جو منتہائے پرواز ہے وہ مذہب کا نقطۂ آغاز ہے۔ سائنس کی بحث وتحقیق کا تعلق تمام تر فطرت (نیچر) کے واقعات ومشاہدات اور تجربات سے ہے اور مذہب کی بنا یکسر فوق الفطرت اور تجربہ ومشاہدہ کی دسترس سے ماوراء چیزوں پر ہے۔ مثلاً خدا، روح، حشر ونشر وغیرہ۔ مذہب اسی ظلمات (جہل) میں اعتقاد وایمان بالغیب کی مشعل سے رہنمائی کرتا ہے۔ کیونکہ عقل وحکمت کا ٹمٹماتا چراغِ ہدایت اس بحرِ ظلمات میں داخل ہوتے ہی گل ہو جاتا ہے۔ لیکن گرید ہے کہ فطرت (نیچر) سے نکل کر فوق الفطرت کے اسرار سے پردہ اُٹھایا جائے جو عقلِ انسانی کے لئے شجرِ ممنوعہ ہے

مذہب کی بنیاد ایمان و اعتقاد پر ہے۔ فلسفہ کی تعمیر قیاس و استدلال پر
ہے۔ مذہب میں عقل آرائی فلسفہ بن جاتی ہے۔ متکلمین مذہب کے نادان
دوست ہیں۔ یہ مذہب و عقلیات کی تطبیق یا تردید کی الجھن میں مبتلا
ہو گئے۔ علمِ کلام ہی نے عقل و مذہب کی باہمی نفرت کے خیال کو پھیلایا
اور اسلام کو نقصان پہنچایا۔

۲۔ قرآن اور نفسیات حضرت نے فرمایا۔ جی چاہتا ہے کہ
ایک کتاب اس عنوان پر لکھوں کہ قرآن
میں شروع سے اخیر تک نفسیات ہی نفسیات ہے۔ اس میں صرف فطرت اللہ
کا بیان ہے۔ یہ جذباتِ فطرت کا آئینہ ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف پہلو،
رخ اور کیفیات بیان کئے گئے ہیں۔ شکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں نیچے کے
اعتبار سے نفسیاتِ انسانی کے چند پہلوؤں کو بیان کیا ہے تو یورپ والے
وجد کرتے ہیں اور اس کی نفسیات کو بے حد اہمیت و عظمت کی نظر سے دیکھتے
ہیں، داد دیتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے اگر قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو
معلوم ہو گا کہ اس میں فطرت اور نفسیات کے کتنے اعلیٰ اعتبارات بیان
کئے گئے ہیں جو حیات کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

۳۔ قرآن اور فطرت قرآن اللہ کا کلام ہے اور عالم اللہ کا خلق،
اللہ کے کلام اور کام، قول و فعل میں مطابقت
ہے۔ چنانچہ عالم میں جو کچھ ظہور ہے وہ قرآن کے مطابق ہے۔ چاہے
کفر ہو یا اسلام۔ روس ہو یا امریکہ۔ اس لئے قرآن کا دعویٰ ہے کہ
فطرت اللہ پر فطرۃ الناس بنائی گئی ہے۔ آج کل دنیا نفسیات اور
مطالعۂ قدرت کی طرف بہت مائل ہے۔ کیوں نہ ان کو قرآن سے انسانی

کُلٌّ فِی کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (۱۲)
فطرت سمجھائیں کہ قرآن مبین میں سب کچھ ہے۔
میری زندگی میں قرآنی تصورات کے سوا مجھے کسی اور نظریہ نے کبھی اپیل نہیں کیا۔ قرآن
سے ہر شخص کو اس کی استعداد کے لحاظ سے فائدہ پہنچتا ہے۔
ایک دفعہ ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ اور اس نے خلافِ مذہب تصورات
بیان کئے۔ میں نے کہا، ان تصورات میں تو بہت وسعت ہے۔ اور اس کی مزید تفصیلات
ہیں۔ چنانچہ میں نے علمِ باطل کی تفصیلات جو بیان کیں تو وہ حیران ہو گیا اور مجھ سے
کہنے لگا کہ اس کے باوجود آپ کی دینداری کا یہ رنگ کیا۔ میں نے کہا، یہ تو آپ نے
ایک پہلو دیکھا ہے، اس کے بعد میں نے باطل کی تفصیلات کے مقابلہ میں اسلام کے
اعتبارات بیان کئے تو وہ بہت متاثر ہوا۔ اور کہنے لگا کہ اب تک میں اندھیرے
میں تھا۔ اب نور و ظلمت کے تقابل کے بعد حق کھل گیا۔

۴۔ قرآن کا فیضان جب تک قرآن ہمارے جذبات، ادراکات، احساسات،
بلکہ روزمرہ کے معاملات کے ساتھ مطابقت نہ کرے،
اپیل نہ کرے اس وقت تک قرآن نہیں کھلتا اور نہ اس کی اہمیت و عظمت سمجھ میں
آتی ہے۔ اور وہ نری عقیدت بنا رہتا ہے۔ قرآن کی ہدایت، نورانیت اور انشراح
کی شعاعیں تو خاص طور پر وسوسوں، شکوک و شبہات میں کھلتی ہیں۔ جس کے بعد
سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اس کا لطف تو روزمرہ کے علم و عمل میں آتا
ہے۔ لہٰذا چوبیس ۲۴ گھنٹے قرآن طاری رہے۔
قرآن مطلق علم دیتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اسے مقید سمجھ
رکھا ہے۔ اس میں ہر مرتبہ اور ہر محل کے لئے ہدایت ہے۔ موقع محل پہچاننا لازم
ہے جو عارفِ کامل کا کمال ہے۔ دو دو مراتب بلکہ کبھی کئی مراتب کے علوم بیک
وقت جمع ہوتے ہیں۔ ایمان شرط ہے۔ محرومین نے قرآن کو حضور کے زمانہ اور

چند واقعات کی حد تک محدود کر دیا۔ حالانکہ قرآن زمان و مکان و صوت کے ساتھ محدود و مقیّد نہیں۔ ہر زمانہ کے لئے ہے۔ یہ اُس کا دعویٰ ہے۔ یہ بات شرحِ صدر سے کھلتی ہے، حکمت کے تحت سمجھ میں آتی ہے اور نورِ بصیرت حاصل ہوتا ہے۔ جس کے بعد تقلید سے ہٹ کر اطلاقیت کھلنے لگتی ہے اور سینکڑوں چیزیں سمجھ میں آتی ہیں۔ بعض لوگ شرحِ صدر کے قائل نہیں۔ کہتے ہیں نور چکھا دو، نور کا لڈو بنا کر کھلا دو۔ جو چیز بصیرت اور شرحِ صدر کی ہے کہتے ہیں کہ بصارت سے دکھا دو۔ وہ جاہل ہیں۔ مادّی علوم تک میں مبادیات پڑھنے اور اُن پر ایمان لانے کے بعد صحیح ذوق اور خاص حال حاصل ہوتا ہے۔ جس کے بعد چیزیں کھلنے لگتی ہیں۔ اسی طرح قرآنی آیات پڑھ کر وہ کیوں شرحِ صدر اور ذوقِ قرآنی کے قائل نہیں ہوتے۔ اس کے لئے اہلیت، کلچر اور پسِ منظر کی ضرورت ہے۔

قرآنی آیات کے علم کے بعد بھی موقع محل کے لحاظ سے ایک حکیم کی طرح نسخہ ترتیب دینا پڑتا ہے۔ قرابادین پڑھنے اور ادویہ سے واقف ہونے کے بعد جب تک مرض کی پہچان نہ ہو، نسخہ مفید نہیں پڑتا۔ اس لئے ہر محل پر ورد کے لئے حکمت کے تحت آیات کا انتخاب ضروری ہے۔

۵۔ قرآن سے فیض و قوت

قرآن خوانی کے متعلق بخاری شریف کی حدیث ہے مَنْ لَمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَیْسَ مِنَّا۔ یعنے جو قرآن کو خوش آوازی (قرأت) سے نہ پڑھے وہ ہمارے طریق پر نہیں۔ قرآن قول ہے اور رسول اللہ عمل ہیں، اسماء کے مظہر ہیں۔ اُن آیات میں بہت زیادہ قوت ہے جس میں حضورؐ کا یا قرآن کا ذکر ہو۔ سارے اولیاء اللہ متفق ہیں کہ حضورؐ ہی قرآنِ مجسّم ہیں۔ آیات کی مثال تار کی سی ہے۔ ولی اللہ کی تلقین جسے نسبت کہتے ہیں ایسی ہے کہ بجلی کے تار کو بجلی کی رَو سے جوڑ دے، جس کی وجہ سے قمقمۂ قلب میں نور آتا ہے اور قرآن

کھلنے لگتا ہے۔ قرآن کی ہر آیت لاعلاج امراض کے لئے شفا ہے۔ اس کے علم و عمل کا تو بڑا درجہ ہے لیکن قرآن کو اللہ کا کلام مان کر پڑھنا، سننا، دیکھنا بلکہ رکھنا بھی باعثِ خیر و برکت ہے۔

سورۂ فاتحہ میں تسخیر و تکثیر ہے۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کو اس سے خاص ربط ہے۔ سورۂ اخلاص میں تفرید و تجرید ہے۔ حضرت پیرانِ کلیرؒ کو اس سے خاص ربط ہے۔ چنانچہ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کو محبوب بنا کر حق تعالیٰ نے خلق کی طرف واپس فرمایا۔ اور پیرانِ کلیرؒ کو تفرید میں اپنے لئے منتخب رکھا۔

۶۔ قرآن، ہرآن

ایک صاحب نے سلسلہ کی تعلیم کی تدوین کا خیال ظاہر کیا تو فرمایا۔ اسلام کی تعلیم تیسؔ پاروں میں محفوظ و مدوّن ہے۔ اسی کو موقع محل کے لحاظ سے تازہ بہ تازہ پیش کریں۔ لیکن اگر ایک کورس بنا کر رٹا یا کریں تو وہ حافظ کی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ بنوٹ اور شطرنج کی طرح ہر وقت نئی چال چلیں تو بےزاری نہیں ہوتی۔ ہر وقت نیا علم، نیا بیان آتا رہے تو دلچسپی رہتی ہے ورنہ لوگ بےزار ہو جاتے ہیں۔ آپ ہی فرمائیے کہ قرآن میں کیا حضورؐ کو یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ اسے یاد کرنے کی فکر نہ کرو۔ یاد کر کے مت رکھو۔ ہم خود آپ کو علم و بیان دیں گے۔ بلکہ بھول جائیں تو اس سے بہتر دیں گے۔ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (۲۹/۱۴) مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (۱/۱۳)

۷۔ قرآن کی جاذبیّت

میرے ماموں حافظ نور الحسن صاحب بہترین خوش الحان قاری تھے۔ آواز بہت بلند، اُس میں غیر معمولی اثر و کشش تھی۔ مسلمان تو مسلمان ہندو تک متاثر ہوتے۔ بہت سے راجے مہاراجے انکو بلاتے۔ ایک ریاست کا راجہ سورۂ رحمٰن سن کر ایک ہزار کا نذرانہ پیش کیا کرتا تھا اور کہتا تھا

قرآن سُن کر مجھے بے حد سکون ملتا ہے۔ دوسرے راجہ بھی چار چار پانچ پانچ سو نذرانہ دیا کرتے۔ محض قرآن سے اشتغال اور حُسنِ صوت کی حفاظت کی خاطر ساری عمر شادی نہیں کی۔ جب وہ مسجد میں قرآن سناتے تو بعض غیر مسلم اجازت لیکر سیڑھیوں کے پاس بیٹھتے اور بیبیاں چھتوں پر جانمازیں بچھا کر شریکِ تراویح ہو جاتیں۔

(۸) حُروفِ مُقطّعات

فرمایا۔ اللہ کا شکر ہے کہ چند دنوں میں چودہ حروفِ مقطعات کا علم قرآنی آیات کے تحت ملا۔ یہ سب علم چند نشستوں میں عطا ہوا۔ ایک ایک حرف کا علم پانچ، پانچ، دس دس منٹ میں ملا۔ حالانکہ عمریں صرف ہوتی ہیں، ایک حرف کا علم نہیں ملتا۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔

اوراد کی کتابوں میں جو اوراد دیکھنے میں آئے، وہ عام طور پر قرآنی آیات پر مشتمل نہیں ہیں۔ مؤلفین کے اپنے الفاظ میں پائے گئے لیکن اپنا تو یہ ذوق ہے کہ جو کچھ بھی لیں قرآن سے لیں۔ یقین ہے کہ اکابر کو مقطعات کا علم تھا۔ جو ضبطِ تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کل حروف اٹھائیس ہیں جن میں قرآن لکھا گیا ہے۔ خیال آیا کوئی ایسی آیتیں ملیں جن میں جملہ حروف ہوں۔ بفضلہٖ ہمارے اوراد کی کتاب "حِزبُ اللہ" میں ساتواں حزب مرتب ہو گیا۔ جس کے ظاہری و باطنی اعتبارات سے اندازہ ہو گا کہ مسلمانوں کے لئے کافروں کے مقابلے میں کیا رحمت و حفاظت ہے۔

(۹) قرآن خوانی کے دو طریقے

قرآن خوانی کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلسل اوّل سے آخر تک تلاوت کریں۔ گویا پورے اسلحہ خانہ میں داخل ہوئے۔ دوسرا طریقہ یہ کہ اس کی خاص آیتوں

کا مقصد اور محلِّ استعمال معلوم کر کے پڑھیں۔ یہ ایسا ہے کہ گویا اسلحہ خانہ سے اپنے کام کی چیزیں۔ بندوق، تلوار، چھری حاصل کی اور شکار میں کام لیا۔

۱۰۔ اذکار کی گنتی

سارا قرآن ذکر اللہ ہے۔ قرآنی اصول یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ ذکر کرے گا اتنی فلاح حاصل ہو گی۔ لیکن تعداد میں بھی حکمت ہے۔ (۷۰) کا عدد کُن کا۔ (۷۷) مَولیٰ کا۔ (۶۶) وکیل کا۔ (۱۳) کا عدد جلالی ہے۔ (۱۴) کے عدد میں نبوت کے اعتباراتِ عالیہ ہیں۔ دین میں نفسیات اور استعداد کا بڑا لحاظ ہے لیکن بعض مرشدین نفسیات کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے۔ ذوقِ ایمانی پیدا کرنے کے بجائے اذکار کی گنتی پر زور دیتے ہیں۔ اور ایسی پابندیاں بتاتے ہیں کہ مرید گھبرا کر بھاگ جاتا ہے۔ ہر ایک کی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے بتانا چاہیئے۔ جتنا بن پڑے جب بن پڑے، جس حال میں بن پڑے۔ پڑھو۔ کیونکہ ذِکْرُ اللّٰهِ غَیْرِ ذِکْرِ اللّٰهِ سے بہتر ہے۔ حکم ہے۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (۲۹/۱۴) یعنے جتنا ممکن ہے قرآن سے پڑھو۔ یہاں تک کہ قرآن بیٹھے لیٹے پڑھنے کی اجازت ہے۔ اسلام دینِ رحمت ہے۔ عملی ہے۔ اللہ بندہ کے لئے آسانی چاہتا ہے۔ بیماری میں روزوں تک کی قضا کی اجازت دیتا ہے۔

(۱۱) مختلف آیات کا ورد

آج کل معاندین و مخالفین کے مقابلے کے لئے مختلف محاذ پر مختلف آیات کا ورد حسبِ منشائے قرآن کرنا چاہیئے اور اس کی بصیرت ہونی چاہیئے۔ شکستہ دل، رقیق القلب لوگوں کو آیۂ کریمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ؕ پڑھنا چاہیئے۔ اسی طرح ایک جماعت

تحفظ کے لئے، ایک معرکہ کے لئے، ایک نصرت و فتح کے لئے خاص آیتیں پڑھے۔ رات کا وقت بہتر ہے۔ علاج کے اور بھی طریقے ہیں۔ مالدار لوگ مصیبت زدوں کی مالی امداد کریں۔ دوسرے صبر کی تلقین کریں کہ دل اسلام سے بندھا رہے۔ ہر ایک اپنا فرض ادا کرے۔

(۱۲) جلالی اوراد جس اسمِ الٰہی کا ورد کیا جائیگا اس کا فیض حاصل ہوگا۔ اسمِ رزاق کا ورد کیا جائیگا تو رزق کا اور اسمِ کریم کا ورد کیا جائیگا تو کرم کا۔ اِس طرح اسمِ ذوالجلال کا ورد کریں تو جلال سے ہماری تائید ہوگی۔ میں مختلف جلالی آیات پڑھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کے آثار جلد ظاہر فرماتے ہیں۔ میں دیکھ کر گذر جاتا ہوں۔ پیچھے نہیں پڑتا۔ یہی اصول ہونا چاہیئے۔ جلالی اوراد پڑھنے سے حرارت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اللہ محفوظ رکھتا ہے۔ ابھی میں نے ایک ورد پڑھا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو ممکن ہے بے قابو ہو جاتا۔ کیوں نہ ہو بہتر سے بہتر بندوق بھی ہو تو گولی چلانے پر نال پر گرمی آنا لازمی ہے۔ بعض لوگ جلالی اوراد پڑھتے ہیں۔ اس کے اہتمام اور اپنی صلاحیت سے واقف نہیں ہوتے۔ نقصان اٹھا کر مجذوب ہو جاتے ہیں۔ جلالی اوراد کی حرارت کی وجہ سے لوگ گائے کے گوشت وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن میں کسی چیز کا پرہیز نہیں کرتا۔ بلا اہتمام پڑھنے پر بھی بفضلہ حفاظت ہوتی ہے۔

۱۳- ورد کی بیاٹری ایک صاحب کی انتہائی مالی پریشانیوں میں اُن کے لڑکے کو ایک ورد عطا فرمایا۔ اور افشاء نہ کرنے کی تاکید فرمائی۔ افشاء کریں تو لوگ وسوسے ڈالتے ہیں۔ قلب کی تختی صاف رہنا بہتر ہے۔ دل میں عقیدہ ہو تو

اس کی مثال عمدہ زرخیز زمین کی سی ہے۔ عقیدہ نہ ہو تو گویا کنکریلی پتھریلی زمین ہے۔ جس میں کاشت ناممکن ہے۔ نیک عمل کی جان نسبت اور وسیلہ ہے۔ قرآن میں ہے۔ توبہ و استغفار سے کارسازی کے بادل قوت سے اٹھتے ہیں۔ درود پڑھکر رسول اللہؐ کی نسبت اور وسیلہ سے اپنا معروضہ اللہ کی درگاہ میں پیش کریں تو اللہ کی طرف سے منظوری کی تجویز حضور ہی کے وسیلہ سے صادر ہوگی۔ میں نے آج تم کو ورد کی بیاٹری دی ہے۔ بیاٹری تمہارے زیادہ پڑھنے سے چارج ہوگی۔ جتنا زیادہ پڑھو گے اتنی قوت بیاٹری میں آئے گی۔ نسبتِ محمدیؐ بڑی چیز ہے۔ طاق عدد محبوب ہے۔ اِس ورد سے باطل میں کام نہ لیں کیونکہ حق باطل کی تائید نہیں کرسکتا۔ حق نور ہے اس کے آتے ہی باطل کی ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔ اللہ محمدؐ کا نام دیکھنے میں مختصر ہے، اثر میں بڑا۔ کیفیت پر جائیں، کمیت پر نہیں۔

۱۴- اجازتِ اوراد اوراد کی اجازت ایسوں کو دینا چاہیئے جن کا یہی منشا ہو۔ نااہل کو نعمت دینا ناقدری ہے۔ نعمت چھن جانے کا اندیشہ ہے۔ جواب طلب ہو سکتا ہے اگر کوئی شائق، مخلص ہو تو اوراد بتانے میں بخل نہ کریں۔ ناقدرے کے لئے دعا بھی نہ کریں۔ دنیا میں ہم بھی کسی کی سفارش کسی عہدہ دار کے پاس اُس وقت تک نہیں کرتے، جب تک کہ اس عہدہ دار سے اُس شخص کا ربط ٹھیک نہ ہو۔ ورنہ نقصان پہنچ جاتا ہے۔

(۱۵) قرآن و حدیث پورا اسلام قرآن میں مرتکز ہے۔ ہر مسئلہ میں قرآن اپنا آپ مفسر ہے۔ تاریخ اور فقہ کے لئے (مثلاً نماز وغیرہ کے) تفصیلی مسائل میں البتہ حدیث کی ضرورت ہے۔

ورنہ دین کے سب اصول و عقائد قرآن مجید میں محفوظ ہیں ۔ قرآن نور ہے ۔ آنکھ شرط ہے ۔ اندھا کیا دیکھے ۔

قرآن کے مقابل حدیث لانے کی کبھی جرأت نہ کریں ۔ حدیث کی روایت قبول کرنے کے بارے میں حضرت عمرؓ انتہائی احتیاط کو لازم سمجھتے تھے ۔ اکابر میں بھی نقاطِ نظر کا اختلاف رہتا ہے ۔ کوئی حدیث پر زور دیتا ہے ۔ کوئی قرآن پر ۔ ایک اہلِ قرآن ہیں جو تفریطی ہیں کہ حدیث کی ضرورت نہیں سمجھتے ۔ ہم اُن میں نہیں ۔ اولیاء اللہ کے کلام میں بھی الحاقات ہیں ۔ حضرت غوث اعظم رضؓ کی بہت سی تحریرات ایک صدی بعد کی مرتب کردہ ہیں ۔ جن میں بہت سے اضافے کئے گئے ہیں ۔ اسی لئے ہر بات میں قرآن کو مقدم رکھنا چاہیئے کہ اس میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں اور نہ اس میں کوئی ردّوبدل ہو سکتا ہے ۔

(۱۶) (ا) قرآنی نقطۂ نظر اصل اصول قرآنی نقطۂ نظر کا قیام ہے جس سے جملہ چیزیں کھلنا شروع ہوتی ہیں ۔ لوگ اسے حاصل کرنے کے بجائے خارجی حالات اور اپنے نقطۂ نظر سے قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں ، یہی غلطی ہے ۔

یاد رکھو ! حقیقت ایک دائرہ ہے جس میں بہت وسعت ہے ۔ اسے محدود کرنا سخت جہالت ہے ۔ دائرہ کے (۳۶۰) درجے ہوتے ہیں ۔ کسی کی نظر اس حقیقت کے ایک درجے پر ہے تو کسی کی (۹۰) درجہ پر ۔ صرف مدارج کا فرق ہے ۔ اسی طرح آدمی ایک ہے کسی نے ہاتھ دیکھا کسی نے پیر یا چہرہ ۔ لیکن دیکھا ایک آدمی ہی کو ۔ اسی لئے اگر کسی کا نقطۂ نظر اسلام کے اندر قائم ہو جائے تو اس وسعت و رحمت کے لحاظ

سے اس کو اسلام سے خارج نہیں کہا جاسکتا ۔ چنانچہ حضرت امامِ اعظمؒ نے فرمایا ۔ اگر میں کسی میں (۹۹) حصے کفر دیکھوں اور ایک حصہ اسلام دیکھوں تو میں اُسے مسلمان سمجھونگا ۔ کافر کا نقطۂ نظر بھی جس قدر اسلام سے قریب ہوگا اُس قدر اُسے فائدہ پہنچے گا ۔

(ب) روح و قلبِ اسلام لیکن جس طرح روح و قلب پر انسانی زندگی کا مدار ہے ۔ اسی طرح توحید و رسالت پر ایمانی زندگی کا مدار ہے ۔ توحید و رسالت دین کے روح و قلب ہیں ۔ ان کے بغیر دیگر ارکان کی ادائی جسدِ بے روح کی مثال ہے ۔ دین کے دائرہ میں دوسری بڑی سے بڑی کوتاہیاں ہوں ، قصور ہوں ، گناہ ہوں ، تو ان کی مثال زندہ انسانی جسم میں بیماریوں کی سی ہے ۔ جب تک روح و قلب باقی ہیں اُسے مُردہ نہیں کہا جاسکتا ۔ اور ظاہر ہے کہ بیمار ہزاروں مُردوں سے بہتر ہے ۔

(ج) اختلاف رحمت بعض اکابر میں نقطۂ نظر کا فرق شدید اختلاف کی حد تک تھا ۔ لیکن ہم اس کو نفسانیت پر محمول نہیں کر سکتے ، احتیاط چاہیئے ۔ للّٰہیت کے تحت بھی ایسے اختلافات ممکن ہیں ۔ اگر کسی دو اشخاص کے نقطۂ نظر بہت بلند ہوں اور دونوں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ لیں تو صاف کہنا پڑے گا کہ دونوں برسرِ حق ہیں ۔ یہ عام خیال کہ حق پر صرف ایک ہی ہو سکتا ہے ، دو نہیں ہو سکتے ، بہت غلط ہے ۔ حقیقت میں بہت جامعیت ، رحمت و وسعت ہے ۔ اس لئے اگر کوئی دائرۂ حق کے اندر رہ کر اپنے نقطۂ نظر کے لحاظ سے ایک استنباط کر رہا ہے تو وہ حق پر ہے ، باطل پر نہیں ۔ دین میں نیتِ صحیح کے

تحت اِجتہادی غلطی اور اختلاف کو رحمت بتایا گیا۔ اِجتہاد میں اختلافِ رائے کی صورت میں کسی ایک رائے کے خطا یا صواب ہونے کا ظنِ غالب ہوسکتا ہے۔ اس اختلاف کی نوعیت حق و باطل کی نہیں ہوتی۔ اگر اجتہاد کو روا نہ رکھا جائے تو دین کا دائرہ محدود ہو کر رہ جائے گا۔

۱۷- میلادِ شریف اور مُرشد کے معنے

فرمایا۔ رسول دراصل علمِ الٰہی کے ذریعہ کو کہتے ہیں۔ اللہ نے رسوؐل کے واسطے سے قرآن دیا۔ قرآن سے رحمت کے آثار آرہے ہیں۔ میلادِ شریف کے معنی یہ ہیں کہ ہم رسولُ اللہ کا علم بیان کرتے ہیں۔ عمل بیان کرتے ہیں۔ خاص ماہِ ربیع الاول میں میلادِ شریف اس لئے رکھتے ہیں کہ حضورؐ جو علمِ الٰہی کی تجلی ہیں اس مہینہ میں اس عالم میں تشریف لائے ورنہ دوسرے مہینوں میں بھی رات میں یا دن میں کسی وقت بھی رکھ سکتے ہیں۔ حضورؐ کے علم کو حاصل کرنا، تقسیم کرنا اور اشاعت کرنا یہی اصل میلاد ہے۔

مرشِد کی بیعت کے معنےٰ ہاتھ کان کی مریدی نہیں بلکہ مرشد سے مرادِ علمِ قرآنی ہے۔

۱۸- پیری مُریدی کے متعلق اپنا مسلک

پیری مریدی کے مسلک کے متعلق مجھے اکابر سے توافق ہے، تخالُف نہیں۔ کسی ولی اللہ سے ربط پیدا کرنے کے لئے مریدی مُستحسن ضرور ہے۔ ولی کی پہچان یہ ہے کہ اس کی صحبت میں قرآن کھلے۔ اللہ رسولؐ کی محبت بڑھے اور علم و عمل کی اصلاح ہو۔ خلافت واجازت کے لئے بیعت ضروری ہے۔ تعلیم و تربیت

کے لئے لازمی نہیں۔ بعض مثالیں ایسی ہیں کہ کسی عارف کی کتاب پڑھنے سے ربط پیدا ہوگیا اور قرآن کھلنے لگا۔ بعضوں کو محض کسی مزار پر حاضر ہونے سے قرآن سے معنوی ربط پیدا ہوا۔ اور قرآن کھلنے لگا۔ بعضوں کو تو بغیر پڑھے اور بغیر کسی مزار پر گئے علمِ لَدُنّی عطا ہوا۔ اور ایسا شرحِ صدر ہوا کہ معارفِ قرآنی کھُل گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیری مریدی بعضوں کے لئے خاص اعلیٰ فیضان کے لئے بھی لازمی نہیں۔ عام خیال ہے اور واقعہ بھی ہے کہ بعض مرشدین نے مریدی کو جلبِ منفعت کا ذریعہ بنالیا اور اس رسم کو لازمی قرار دیا۔ لہٰذا مرشِدین کو آج کل کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہیئے تاکہ دین بدنام نہ ہو۔

اصل میں مقصود بالذّات اللہ، رسوؐل کی محبت اور اُس کی اشاعت ہے۔ اس کے لئے پیری مریدی کی بھی شکلیں ہیں۔ لیکن حضور انورؐ کی زندگی پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ حضورؐ عام بیعت نہیں لیتے تھے۔ خاص موقعوں پر بیعتِ جہاد لی۔ ورنہ عوام تو کلمہ پڑھتے۔ مسلمان بنتے۔ پیالہ کی شرط نہ تھی۔ علاوہ ازیں ہر زمانہ کا ایک اقتضاء ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کا مجھے یہ اقتضا معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ و تلقین کے لئے مریدی کا لُزوم نہ ہو۔ کیونکہ بعض پیروں کے طریق کار کی وجہ سے یہ طریقہ آج کل بہت بدنام ہوگیا ہے۔ اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ اس زمانہ کے اقتضا اور مصلحتِ دینی کے مدِنظر، تعلیم و تبلیغ کو اس کا پابند نہ بناؤں۔ میرے خیال میں اس زمانہ میں تقریر اور ملاقات سے زیادہ مفید تصنیف و تالیف ہے کہ ٹھنڈے دل سے غور کرکے ہر شخص رائے قائم کرسکتا ہے۔ لہٰذا اللہ رسولؐ کی محبت تصنیف و تالیف کے ذریعہ عام کریں جس میں وُسعت ہے، برکت ہے، فیض ہے۔ جس کے

دل میں اس سے محبت پیدا ہو، وہ ہمارا بھائی ہے، مُرید ہے۔ ہمارا مقصود حاصل ہو گیا۔ مرید کہلانا اور خود کو مرشد جتانا اور جتھا بنانا ضروری نہیں۔ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ عَلِیۡمًا (پ ۵) اللہ کا علم کافی ہے۔ لہذا اپنا اصول تعمیم ہے۔ تخصیص نہیں۔

ناچیز نے عرض کیا۔ کیا آپ سِرّ ظہور کی تلقین کے لئے بھی بیعت نہ لیں گے۔ فرمایا۔ یہ سب تخیّلات ہیں۔ کیا سِرّ تخلیق، سِرّ ظہور صرف کہنے سے سمجھ میں آتے ہیں۔ یا یہ شرحِ صدر، علمِ لدنی، نورِ ربانی، سے کھلتے ہیں۔ یہ تو دراصل کھلنے کی چیزیں ہیں۔ کہنے کی نہیں۔ اکابر کے حکمِ امتناعی کے خلاف بعض مشائخ ہر جاہل کے کان میں سِرّ تخلیق کہتے ہیں۔ نتیجہ اصلاح کے بجائے نہ صرف حیرانی، پریشانی، بلکہ کفر و نفاق و فساد ہوتا ہے۔ دعوتِ قرب عام نہیں، خاص ہے۔ اس کے لئے جاذِبہ کی شرط ہے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ اگر قرآن کے مطابق حقیقتِ محمدیؐ بتائیں، رَحۡمَۃٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ کا علم دیں کہ فرش سے عرش تک محمدؐ نظر آنے لگے تو بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں، شرک کہتے ہیں۔ لہٰذا محبتِ رسوؐل کی عام تعلیم اور خاص اشارے کافی ہیں جس سے توحید بطور انعام کھل جاتی ہے۔

۱۹۔ سجادگی و خلافت

اصل خلافت و سجادگی علم و عرفان کی ہوتی ہے۔ اصل چیز فیضانِ علم اور تعلیم و تبلیغ کی برکتیں ہیں جسے اللہ خود ظاہر فرماتا ہے۔ اللہ کا علم کافی ہے۔ اشتہار سے کیا حاصل۔ سجادگی و خلافت کا منشا انتظام یا تبلیغ ہوتا ہے خلافت میں سب خلیفہ برابر ہیں۔ چھوٹائی بڑائی کا خیال جہالت و تنگ نظری ہے جو سلوک کے منافی ہے۔ اللہ کو معلوم کون بڑا، کون چھوٹا، البتہ علم

و عمل کے لحاظ سے تبلیغ میں آثار آئیں گے۔ قدرت ظاہر کر دیگی کہ کون بڑا ہے۔ دوسری چیز انتظامی ہے۔ مثلاً جاگیر، صندل، عرس کے انتظامات۔ اگر خاندانی آدمی ہو اور انتظامی صلاحیت رکھتا ہو اور خلیفہ بھی ہو تو اُسے ترجیح دی جائے گی۔ اگر خلیفہ ہے لیکن انتظامی صلاحیت نہیں تو اصولاً انتظامی صلاحیت والے کو ترجیح دی جائے گی۔ تاکہ انتظام و اتحاد کا منشا پورا ہو سکے۔

سجادہ صاحب کو چاہیئے کہ اعلیٰ روحانی علم حاصل کریں۔ عرس کو رسمی نہیں، بلکہ ملّت کے مفاد کا ذریعہ بنائیں۔ عرسوں کی اصلاح کریں۔ اچھی تقریروں، عمدہ قوالیوں کا انتظام کریں۔ سلسلہ کی تصانیف کی حفاظت و اشاعت کریں۔ چھوٹے چھوٹے تعلیمی پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کریں۔ عرس کی دعوتوں وغیرہ میں نظم و ضبط برقرار رکھیں۔

۲۰۔ حضرت کمالُ اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا وصال حضرت مولٰنا محمد حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ سجّادہ نشین

حضرت مولٰنا محمد حسین شاہ رحؒ کا اپنی طرف سے حضرت غوثی شاہ رحؒ کو سجّادہ نامزد کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شمس العارفین، زُبدۃ الصّادقین، پیر و مرشد حضرت الحاج شاہ کمال اللہ قادری چشتی نقشبندی قُدِّسَ سِرُّہٗ نے بتاریخ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ یوم پنجشنبہ بوقتِ مغرب بمقام سرائے الٰہی۔ الٰہی چمن، واقع محلہ کاچی گوڑہ، حیدرآباد دکن وصال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔

حضرت علیہ الرحمہ کے سلسلے میں خلیفۂ اول ہونے کی حیثیت سے پیر بھائیوں

کی عام خواہش اور برادر مکرم الحاج غوثی شاہ صاحب خلیفۂ حضرت علیہ الرحمہ کا خاص اصرار تھا کہ میں حضرت علیہ الرحمہ کے بعد سجادگی کی خدمت انجام دوں۔ لیکن سلسلہ کی ضروریات اور انتظامات کے مدنظر یہ بہتر معلوم ہوا کہ سجادگی کی خدمت برادرم الحاج غوثی شاہ صاحب کے تفویض کی جائے۔ لہٰذا میں اپنی تحریک اور پیر بھائیوں کی تائید سے برادرم الحاج غوثی شاہ صاحب کو سجادہ قرار دے کر اطلاعِ عام کے واسطے اس کا اعلان کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس انتظام کو قبول فرمائے اور اس میں خیر و برکت دے۔ آمین ثم آمین۔ بفضلِ حبیبِ ربّ العالمین۔ والسلام

شرح دستخط حضرت مولانا محمد حسین صاحب ناظمِ عدالت و نیر تی سجادہ و خلیفہ

۴ر جمادی الاول ۱۳۵۱ھ روز سہ شنبہ

شرح دستخط حضرت غوثی شاہ صاحب

کاتب: حضرت مولانا الیاس برنی صاحب (خلیفۂ اول مولانا محمد حسین شاہ)

ناقل: خادم محمد عبدالحلیم الیاسی (یہ اعلان مقامی اخبارات رہبر دکن، صحیفہ وغیرہ میں شائع ہوا)

۲۱۔ تحتِ امر پیری مریدی

ناچیز نے عرض کیا۔ حضرت غوث اعظمؒ نے پیری مریدی کی۔ فرمایا حضرت نے ماموریت کے تحت یہ کام انجام دیا۔ اولیاء اللہ میں بعض ایسے بھی گذرے ہیں جنہوں نے باقاعدہ پیری مریدی نہیں کی۔ الّا اس کے کہ جو اس بات پر مامور ہوئے۔ جو اپنی ارادت و تدبیر سے جتھا بندی کرتے ہیں، ان کے کام زیادہ مقبول و محکم نہیں ہوتے۔ ایک تو عقل و تدبیر کے ذریعہ کام پھیلانا ہے۔ دوسرا تحتِ امر کام کرنا ہے۔ پہلے میں کام کے پھیلنے کا دھوکہ رہتا ہے، کام نہیں ہوتا۔ دوسرے میں بے ارادتی اور ماموریت

میں کام ہوجاتا ہے۔ بے سروسامانی اور تھوڑی سی سعی میں بھی وہ برکت ہوتی ہے کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔

۲۲۔ برادرانہ اساس پر پیری مریدی

آج کل پیری مریدی میں تحکم، تسلط نہیں چل سکتا۔ بلکہ یارانہ، برادرانہ اساس پر پیری مریدی کا فیض ہوسکتا ہے۔ وہ مرشدین شاذ ہیں جو تحتِ امر تقدس تحکم، تسلط رکھتے تھے۔ عام طور پر اپنی خرابیاں ظاہر کردیں تاکہ غلط فہمی نہ رہے۔ اس کے بعد جو ٹکے پکّا ہوگا مرشد جتنا زیادہ شیطان کے داؤ پیچ سے واقف ہوگا، اس کا مقام اتنا ہی بلند ہوگا۔ یا تو مرشد شر کی خاردار وادیوں سے گذرا ہو۔ یا عین الیقین کی حد تک شر اور شیطان کے متعلق اس کا علم ہو۔ اسی صورت میں وہ گنہ گار مریدوں سے مجانست حاصل کرسکتا ہے۔ بلکہ مرید بھی اپنے ساتھ اس کی مثلیت بلکہ فوقیتِ علم کے قائل ہوں گے اور اپنا ہمدرد سمجھیں گے

۲۳۔ موجودہ مُرشدین و مُریدین

آج کل اکثر مرشدین اپنے مریدین سے غیر مشروط اطاعت چاہتے ہیں کہ وہ زبان نہ کھولیں۔ نتیجہ نفاق ہوتا ہے۔ اُن کی آزادیٔ رائے سلب ہوجاتی ہے۔ بنیادی چیزوں کی حد تک زبان نہ کھولنا بجا ہے۔ لیکن اگر ہر چیز میں یہی عمل ہو تو کوئی نقاد پیدا نہ ہوگا۔ تنقیدی و اجتہادی قوت سلب ہوجائے گی۔ محض آخذ بن کر رہ جائے گا۔ نئی چیزیں پیدا کرنے والا اور دنیا میں جان ڈالنے والا نہ بن سکے گا۔ کیا وہ استاد اچھا ہے جو محض نقل کرنا سکھائے یا وہ جو آزادیٔ رائے قائم رکھے۔ اور قوتِ تنقید پیدا کرکے اپنے سے بہتر شاگرد بنا دے۔ مرشدین کی صحبت کا منشا کیا ہونا

چاہیئے۔ قرآن تو تعقّل و تدبّر پر زور دیتا ہے۔ بڑے مُفکّرین بنانا چاہتا ہے۔ نقل کا بھی ایک درجہ ہوتا ہے۔ جس کے لئے بعض مناسب ہوتے ہیں نہ کہ سب۔

۲۴۔ مرید کا اختلاف

ایک دفعہ بدر کے قیدیوں کو حضور فدیہ لیکر چھوڑنا چاہتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اختلاف تھا۔ چنانچہ وحی حضرت عمرؓ کی رائے پر اُتری۔ ایک دفعہ مہر کے تعین کے بارے میں ایک بڑھیا نے حضرت عمرؓ سے اختلاف کیا اور حضرتؓ نے مان لیا۔ اس سے مرید کے اختلاف اور اُس کی صحیح رائے کی اہمیت و لحاظ اور مرشد کی وسیع القلبی کا پتہ چلتا ہے، نمونہ ملتا ہے۔

۲۵۔ صحبتِ شیخ

یاد رکھو! صحبتِ شیخ کے بغیر قرآن نہیں کھلتا۔ اعلیٰ اعتبارات سمجھ میں نہیں آتے۔ صحبت کیمیا اثر ہوتی ہے۔ اسی لئے حکم ہے۔ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (۱۱/۱۲) یعنے سچوں کے ساتھ رہو۔ صحبت کی اتنی اہمیت نہ ہوتی تو صحابہ کا مرتبہ اتنا بلند کیوں ہوتا کہ غوث اقطاب بھی واقعتہً اپنے کو اُن کی جوتی کے تسمہ کے برابر نہیں سمجھتے۔ کیونکہ حضور کو اس عالم میں آنکھوں سے دیکھ کر دلوں میں پایا تھا۔ صحبت لازمی چیز ہے۔ نا اہلوں کو نہ صحبت ہے نہ صلاحیت و استعداد ہے اور نہ بے ادبی کی وجہ سے توفیق ہے۔ لیکن غوثیت، قطبیت، ولایت کی اعلیٰ شانیں سمجھنا چاہتے ہیں۔ صادقین کی صحبت اور خدمت سے استعداد بنتی ہے۔ استعداد نہ ہو تو صحبت کا علمی فیض جاری نہیں ہوتا۔ گو عقیدہ کا فائدہ پہنچتا ہے۔ انبیاء و اولیاء کی محبت اور ادب و تعظیم سے توفیق عطا ہوتی ہے۔

۲۶۔ تصوّرِ شیخ

فرمایا، ایک دوست کو تصوّرِ شیخ حاصل ہے۔ ہم نہ

اس کا انکار کریں، نہ اس پر اصرار۔ البتہ یہ چیز ہماری طبیعت کے مناسب نہیں۔ ایک دفعہ ان کے شیخ نے ایک آیت کی زکوٰۃ بتائی، انھوں نے مجھ سے آکر کہا کہ اس وِرد کو شروع کرتے ہی آپ کا تصوّر بندھ گیا۔ میں نے کہا۔ اب یہ چیز سرکاری ہے۔ مِنَ اللّٰہ ہے۔ بے ارادتی میں آئی ہے تو اس کے آثار بہت قوی ہونگے۔ گو اپنی طلب بھی محمود ہے لیکن اس کے آثار اتنے قوی نہیں ہوسکتے۔

"تصوّرِ شیخ کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض اس کو مُغایرِ اسلام سمجھتے ہیں۔ لیکن قرآن میں ہے۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ .... وَلَا تَعْدُ عَیْنٰكَ عَنْهُمْ (۱۵/۱۶) (تو اپنے کو اُن لوگوں کے ساتھ مقیّد رکھ جو صبح شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں۔ تیری آنکھیں اُن سے ہٹنے نہ پائیں)۔ اس سے صحبتِ شیخ، تصوّرِ شیخ اور فنا فی الشیخ کی سند ملتی ہے، یعنی اہل اللہ پر ایسی نظر جمائے کہ ہٹنے نہ پائے۔ ہلال تکنے والوں کی نظر پر نظر دوڑائے تو کیا عجب ہلال نظر آجائے۔ اور اُن کی آنکھوں کے ذریعہ شہود نصیب ہو۔ کسی پر آنکھ جم جانا۔ کسی کا نظر میں بس جانا بڑی بات ہے لیکن آنکھ کو راز دل سے ملتا ہے۔ دل ہی غافل ہو تو نظر کیا کرسکتی ہے۔" (مرأۃ الجیہ البرقی)

۲۷۔ تصوّرِ شیخ کی اہمیت اور تصوّرِ رسولؐ کی نعمت

ناچیز نے عرض کیا۔ اسماءِ رؤف و رحیم کے وِرد کے وقت بعض لوگ اللہ تعالیٰ کا خیال کرنے کے بجائے کسی مرشد کا خیال کرتے ہیں۔ فرمایا۔ سب سے زیادہ پابندِ شریعت نقشبندی لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کے پاس تصوّرِ شیخ لازمی ہے۔ چاہے اُس شیخ کو

اسماء سے مناسبت ہو یا نہ ہو۔ لیکن اِن اسماء کے وِرد کے موقع پر شیخ کو ان کا فیضان یا مظہر مانتے ہیں اور مستفید ہوتے ہیں۔ قادریوں چشتیوں میں تصوّرِ شیخ کی تعلیم پر زور نہیں۔ اصل راز یہ ہے کہ اگر اللہ کی طرف کوئی شخص بخوبی توجہ نہ کرسکے تو وہ شیخ کا واسطہ اختیار کرتا ہے۔ اسی بناء پر نقشبندیوں کے پاس فنا فی الشیخ، فنا فی الرسولؐ، فنا فی اللہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کسی کو ٹھنڈک مطلوب ہو تو وہ گلاب یا سبزہ زار کو دیکھتا ہے۔ اِن کے تصوّر و دید سے بھی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ جیسے کسی مکروہ منظر سے کراہت ہوتی ہے ویسے ہی اچھے منظر سے فرحت ہوتی ہے۔ اِسی اصُول کے تحت تصوّرِ شیخ کیا جاتا ہے کہ وہ خاص مناسبتوں کی وجہ سے اسماءِ الٰہی کا مظہر ہے۔ لیکن اگر طالب کو واقعی کسی اسم سے طبعی مناسبت ہو اور وہی وِرد کرے تو بہت زیادہ فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلعم اسمائے الٰہی کا مظہرِ اَتم ہیں۔ اِس لئے تصوّرِ رسولؐ اور فنا فی الرّسول سب سے بڑی نعمت ہے۔

۲۸- ادبِ شیخ پہلے کے مرشدوں کا مریدوں پر بڑا رعب و اثر رہتا تھا۔ آج کل کے مرید تو مرشدوں کو اپنا ممنونِ احسان سمجھتے ہیں۔ نہ کلچر ہے نہ ادب۔ محض علم سے کلچر نہیں آتا۔ علم اور کلچر جمع ہوں تو کیا کہنا! حضرت خواجہ بدرالدین رحؒ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحؒ کے داماد اور خلیفہ تھے۔ آپ کے وصال کے بعد پیرِ تعلیم تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ اِن کا اتنا ادب فرماتے کہ خلافت حاصل کرنے کے باوجود آپ کی زندگی میں چار پانچ برس تک کسی کو مرید نہیں فرمایا۔ اِن لوگوں کا جہاں جمال یہ تھا، جلال کا بھی کیا کہنا۔ اللہُ اکبر۔

ایک دفعہ حضرت خواجہ بدرالدینؒ اللہ اللہ کر رہے تھے۔ حضرت بابا فریدؒ نے تین دفعہ آواز دی۔ تیسری آواز پر کہا 'میں اللہ اللہ میں محو تھا۔' باباصاحبؒ نے فرمایا۔ اب تک تُم نے جو کچھ حاصل کیا تھا محو ہو گیا، اب کل سے پھر از سرِ نو کرو۔ روتے روتے بُرا حال ہو گیا۔ اخیر میں سلطان جی کی سفارش پر حضرتؒ نے معاف فرمایا۔ اصل اصول یہ ہے کہ پیر و مرشد کی حضوری میں اللہ میں اِستغراق اس محل کے خلاف تھا۔ اس وقت مرشد کی طرف توجہ کرنا ہی اللہ کا منشاء تھا۔ اور وہی استغراق تھا۔ اِسی لئے جلال آگیا کبھی تقابلی ارادہ نہ ہو۔ ارادہ تحتِ امر مناسب ہے۔ اگر استغراق ہی مقصود تھا تو علٰحدہ کمرہ میں بیٹھتے۔

اسی طرح ایک دفعہ حضرت باباصاحبؒ سلطان جیؒ کو ایک کتاب پڑھا رہے تھے۔ پڑھاتے ہوئے ایک جگہ رُک گئے اور غور کرنا شروع کیا۔ اس عرصہ میں سلطان جیؒ نے ایک دوسرا صاف نسخہ لاکر سامنے رکھ دیا۔ اور کہا۔ عبارت یوں ہے۔ حضرت خفا ہو گئے اور فرمایا کیا مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ سلطان جی رونے لگے۔ خودکشی حرام نہ ہوتی تو خودکشی کر لیتے۔ بالآخر حضرت خواجہ بدرالدینؒ کی سفارش پر معافی ہوئی۔ مطلب یہ تھا کہ غور و فکر کے وقت بات نہ کرنی چاہیئے۔

۲۹-(۱) علمی سلوک فرمایا۔ اکثر لوگ علمی سلوک کی قدر نہیں جانتے۔ دراصل انھیں ایمان کے مقام کی عظمت نہیں معلوم۔ بعض لوگ علمی سلوک کی اہمیت تو بیان کرتے ہیں لیکن علمی سلوک اسی کو سمجھتے ہیں کہ چند رٹے ہوئے اصول یاد کرا دیئے جائیں جن کا عملی زندگی میں نفوذ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے وہ علمی سلوک کے بجائے ذہنی سلوک بن جاتا ہے۔ اصلی علمی سلوک وہ ہے جو ذہن کے بجائے قلب میں جگہ

پیدا کرے اور عملی زندگی کا جزو بن جائے۔ اس قسم کے سلوک کے لئے بہت کم لوگ تیار ہوتے ہیں کیونکہ ان میں اس کی استعداد نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے سیاسیات تو پڑھ لی لیکن عملی قیادت میں ناکام، یا بیرسٹر ہیں لیکن وکالت میں ناکام۔ عملی سلوک میں قدم قدم پر دشواریاں آتی ہیں۔ جہاں عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اگر مقرّبین کے مقامات اور فیوض چاہو تو عاقلوں (عقل پرستوں، لفظ پرستوں) کے زمرہ سے علٰحدہ ہونا پڑے گا۔ اہلِ نفس کے مقامات پر رہ کر اہلِ عرفان کے مقامات چاہنا گویا بس کے ٹکٹ سے ہوائی جہاز پر سفر کرنے کی خواہش کے مُرادِف ہے۔

(ب) شریعت۔ طریقت۔ حقیقت

بعض حضرات شریعت کو علمِ سفینہ اور حقیقت کو علمِ سینہ کہتے ہیں۔ اور شریعت و حقیقت کو ایک دوسرے کے مُغائر و مخالف سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت ایک بیج ہے تو شریعت اس کا درخت۔ حقیقت ایک کلی ہے تو شریعت اس کا پھول، پھل۔ چنانچہ حضرت سیدنا غوثِ اعظم رضؓ فرماتے ہیں۔ "ہر وہ حقیقت جس پر شریعت گواہی نہ دے وہ زندقہ ہے۔ یعنی اِلحاد و بددینی"۔ حاصل یہ کہ ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت دونو کی جامعیت کمال ہے۔ بلکہ ظاہر باطن پر مقدّم ہے کہ ظہور کامل تر ہے۔

۳۔ قرآنی سلوک

حضرت غوث اعظم رضؓ کا سلوک قرآنی ہے۔ اس میں بڑی قوت ہے۔ پہلے چار پانچ سو برس تک اسلام اپنی اصلی قرآنی حالت پر تھا۔ راہبانہ تصوّف نہ تھا۔ پہاڑی چلّے نہ تھے۔ البتہ فاروقی تصوّف تھا۔ یعنے سالکین معاملات میں دین کو برتتے تھے ایمان کی قوتیں دکھاتے تھے۔ لیکن بعد کو قرآنی سلوک میں مقامی اثرات آگئے

اور مرکّب ہوگیا جس کی وجہ وہ اگلی شان باقی نہ رہی۔ گو بعد والوں نے اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن ذوق بدل گیا۔ قرآنی سلوک کی مثال پانی کی سی ہے۔ جس سے فطرت کو تسکین ہوتی ہے اور بے زار نہیں ہوتی۔ اس کے خلاف دیگر سلوک شربت اور اوَولٹین کی طرح ہیں تعجب ہے لوگ کہتے ہیں۔ ابتداء میں توحیدِ وجودی وغیرہ نہیں تھی۔ گویا تصوّف نہیں تھا۔ اور یہ بعد کی چیز ہے۔ حالانکہ بسم اللہ، الحمد للہ، اِنْ شَاءَ اللّٰہ، مَا شاء اللّٰہ، اِنّا لِلّٰہ۔ یہ سب توحید محض ہیں۔ اِسلام کی بنیادی تعلیمات ہیں۔ یہ حقائق مسلمان بچہ بچہ کی زبان پر جاری ہیں۔ جس کی بڑے بڑے فلسفیوں کو ہوا نہیں لگی۔ اسلام نے روزمرّہ کی عملی زندگی میں اِن حقائق کے اظہار و تکرار پر زور دیا ہے۔ تاکہ یہ مسلمان کی زندگی کا جزوِ لاینفک بن جائیں اور ہر وقت اللّٰہ رسول سے ربط تازہ رہے۔ مثلاً ہر نیک کام کی ابتداء میں بسم اللّٰہ کہنا۔ کوئی اچھی یا تعجب خیز چیز دیکھ کر سبحان اللّٰہ کہنا۔ ہر نعمت پر الحمد للّٰہ۔ ہر مشکل، خطرہ میں اللّٰہ اکبر کہنا۔ کسی عمل کے عزم پر اِنْ شاءَ اللّٰہ، ہر کامیابی پر مَا شاءَ اللّٰہ، ہر لغزش وخطا پر اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ۔ شر کے موقع پر اَعُوْذُ بِاللّٰہ۔ شیطانی نفسانی خطرات کے موقع پر لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ۔ رنج و غم کے موقع پر اِنَّا لِلّٰہ۔ اور ملاقات کے موقع پر اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہنا۔

اگلوں کو تصوّف کی اصطلاحات کی ضرورت نہ تھی۔ وہ قرآن میں بسر کرتے تھے۔ قرآن میں تصوّف کے لئے صِدق کا لفظ آیا ہے۔ اس صدق کو حضرت صدیق اکبر رضؓ کی طرح ایک لمحہ میں حاصل کرو یا برسوں میں حاصل کرو۔ علم کی تصحیح کے بعد عَلٰی صَلٰوتِھِمْ دَائِمُوْنَ (۲۹) کی شان حاصل ہوتی ہے۔ رسولُ اللّٰہ صدق لائے اور حضرت صدیق رضؓ نے تصدیق فرمائی۔

متقی کی سند پائی۔ اس کی جزا یہ کہ وہ جو چاہیں رب عطا کرتا ہے۔

اسلام کا مزاج گرم و تر ہے۔ معتدل ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶/۵) ساتھ ساتھ ہیں۔ ورنہ کسی کا ٹھہرنا مشکل ہو جائے۔ اسماء سنبھال لیتے ہیں۔ جلال و جمال سے عالم قائم ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (۲۷/۱۲)

۳۱-(ا) عالمِ شہادت کا سلوک

آج کل سلوک میں بالعموم عالمِ مثال کے کشف پر زور دیا جاتا ہے۔ انسان قدرتاً ندرت پسند واقع ہوا ہے۔ اس لئے لوگ ایسے سلوک کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ قرآن علمِ صحیح پر زور دیتا ہے۔ عالمِ شہادت پر زور دیتا ہے۔ عالمِ مثال تو برزخ میں کھل ہی جائے گا لیکن عالمِ شہادت میں ہر آن اسماء کی جو تجلیات ہو رہی ہیں۔ ان سے نظر ہٹا کر، صرف عالمِ مثال ہی کی طرف متوجہ ہو جانا، اس عالمِ شہادت کو غیر ضروری اور لاحاصل سمجھنا، خیالی صورتیں قائم کرنا اور ان میں محو ہونا۔ اصل کی ناقدری اور بے ادبی ہے۔ غور کرو، اصل پھول کو چھوڑ کر اس کی تصویر کا تصور کس حد تک حق بجانب ہے۔ اگر روزانہ اشیاءِ مشہودہ کا حق ادا کریں تو اللہ تعالیٰ اس میں علم کھول دیگا۔ بچوں، بیویوں وغیرہ کو چھوڑنے یا اُن سے نظر ہٹانے سے بہتر ہے کہ ان کو اللہ، رسول اللہ کی امانت جان کر اُن کا حق ادا کریں۔

(ب) تسبیحِ فاطمہؓ

حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کو سُبْحَانَ اللّٰهِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کا ذکر عطا فرمایا کہ اس کا وزن سارے عالم سے بڑھ کر ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ سے

یہ سبوحیت حاصل ہوتی ہے کہ اللہ عالم سے پاک ہے اور ناقابلِ بیان ہے اس عروج کے بعد نزول کر کے سارے عالم میں، ہر شئے میں وجود، علم ارادہ وغیرہ دیکھ کر اللہ کو اس کا مرجع جاننا، یہی توحیدِ وجودی اور الحمد للہ ہے۔ پھر اسی میں منحصر رہ کر اللہ کو ہر ایک سے بالا دیکھنا، یہ کبریائی اور اللہ اکبر ہے۔

(ج) ہر فعل عبادت

حضورؐ نے جملہ فطری افعالِ بشری نکاح وغیرہ کو علمِ صحیح کے ذریعہ عبادات میں داخل فرمایا۔ قرآن میں نبیؐ کے متعلق کافروں کا قول ہے۔ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (۱۸/۱۶) (کیا ہوا اس رسول کو کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے) کھانے پینے لین دین کو عبادت بنانا کمال ہے۔ کھانا اللہ کا رزق ہے، اُسکی مِلک ہے۔ اپنے فضل سے کتنے اسماء کے باہمی ربط سے ہم تک پہنچاتا ہے۔ پھر حول و قوت دے کر ہمیں کھانے کے قابل بناتا ہے۔ لہٰذا محمدیوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے حول و قوت سے اپنے کو کھاتا ہوا دیکھنا کمال ہے، نہ کہ فلتے کرنا۔ یہ ہے علمِ صحیح۔ اس وقت کتنے بادشاہوں کا رزق چھن گیا ہے جو رزق کو اپنا مال اور حق سمجھتے تھے۔ عبد و رب اور عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کا علم پکا رہنا کمال ہے۔

۳۲- محبت کا سلوک

(ا)- دو طریق تعلیم

اکابر میں تعلیم و تبلیغ کے دو طریقے رہے ہیں جو اپنے اپنے محل پر مناسب ہیں۔ ایک استدلالی طریق (دماغی) دوسرا قلبی طریق (جذباتی)۔ استدلالی طریق میں خشکی ہوتی ہے قلبی طریق میں تازگی، شگفتگی۔ استدلالی طریق قلبی طریق کے مقابلہ میں پُر اثر، جاندار نہیں ہوتا۔

اولیاء اللہ نے محبت (قلب) کے جذبے سے بڑے بڑے کام لئے۔ مجنوں میں آگ لگا دی۔ عقلی طریق خشک لکڑی ہے، وہ بھی کام آتی ہے لیکن محبت کا طریق گویا ایک تر و تازہ ثمر دار درخت ہے۔ ہر شخص میں محبت کا جذبہ فطری ہے۔ کسی حسین کو دیکھ کر ولولہ اٹھنا فطری ہے۔ لیکن عقلی لوگ اپنی بے عقلی یا نفس کے تحت، یا اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے محبت کے جذبہ کو دبانا چاہتے ہیں، وہ بالآخر فنا ہو جاتا ہے۔ قانونِ فطرت ہے کہ جب مردانگی و محبت کے جذبات کو بری طرح دبایا جائے تو مردانگی غائب ہو جاتی ہے۔ دین نے ضبط (کنٹرول) کی تعلیم دی ہے، تاکید کی ہے، نہ کہ اُسے مٹانے کی۔

حضور انور کی سیرت تڑپانے والے واقعات سے پُر ہے لیکن بعضوں نے ایسے خشک انداز سے کتابیں لکھی ہیں کہ عشق و محبت کا ولولہ پیدا نہیں ہوتا

(ب) مردانگی کی اہمیت

حضرت مظہر جانِ جاناںؒ کے والد بزرگوار نے ان کو جذبۂ محبت پر ایک خط لکھا جو معارف کی اشاعت اکتوبر ۱۹۴۲ء میں چھپا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"اگر کسی کا دل داغِ عشق سے بریاں نہیں ہوتا تو اس کے دل کا خس و خاشاک جل کر پاک نہیں ہوتا۔ اور اُس کی طبیعت کی زمین میں محبتِ الٰہی کی تخم ریزی کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ اِس لئے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے۔ جب تک عشقِ مجازی کا پھندہ گلے میں ڈال کر کوچہ و بازار میں رُسوا و خوار نہ ہو جاؤ گے اُس وقت تک اس فقیر کی روح تم سے راضی نہ ہو گی۔ لیکن وسیلہ کے بغیر اس راستہ میں کوئی چیز مقبول نہیں ہوتی۔ جب اس نعمت کے وسیلہ سے مطلب کا راستہ کھل جائے تو مولیٰ تعالیٰ کے راستہ میں جو معشوقانِ اعلیٰ و ادنیٰ کے بادشاہوں کا بادشاہ ہے،

جانبازی اختیار کرنی چاہیئے کہ سعادتِ جاودانی اسی چیز سے وابستہ ہے۔ محبت درحقیقت مَردوں کا طریق و آئین ہے۔ اور اِس بارے میں جزوِ اعظم جوش و خروش و گرمی ہے"۔

کیا کوئی متقی باپ اپنے بیٹے کو آج ایسا خط لکھ سکتا ہے۔ اُسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ جانِ جاناںؒ بنے۔ اصل راز یہ ہے کہ دینی و دنیوی (روحانی، قلبی، مادی) زندگی میں محبت ہی کا جذبہ کارفرما ہے۔ ہم ملائکہ کی طرح معصوم تو بن نہیں سکتے۔ گنہگار شیاطین بھی نہ بننا چاہیئے۔ بلکہ آدمیت ہی کمالِ انسانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رجولیت کو اتنی اہمیت دی گئی۔ جب تک رجولیت نہ ہو، نہ صرف دینی لحاظ سے بلکہ دنیوی قانونِ سول سروس کے لحاظ سے بھی وہ کامل نہیں سمجھا جاتا اور نہ اُس کو اعلیٰ خدمات کے لئے اہل سمجھا جاتا ہے، وجہ کیا ہے۔ اصل میں فطرت کا اظہار ہے کہ اِس کے بغیر انسانی کمالات کا پورے طور پر اظہار نہیں ہو سکتا۔ البتہ کنٹرول لازمی ہے۔ کمزور سے کمزور رجولیت والا بڑے سے بڑے نامرد پہلوان سے بہتر ہے کیونکہ وہ سرمایۂ حیات رکھتا ہے۔ حیات آفرین ہے، چمن بن سکتا ہے۔ نامرد بے ثمر درخت ہے، جلانے کی لکڑی ہے۔

(ج) جذبۂ محبت

اصل بات یہ ہے کہ جس میں رجولیت ہے، اُس میں محبت ہے، جوش ہے، فدائیت ہے، دُھن ہے۔ جسمانی مادی زندگی کی طرح قلبی و روحانی عالم کی بھی مردانگی ہے۔ وہاں بھی مرد، نامرد، کمزور مرد ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ عالم لطیف ہے۔ اس لئے وہاں اعلیٰ الطف محبتیں اور ولولے ہوتے ہیں۔ جس طرح اس عالم کی ترقی اس جذبۂ محبت (مردانگی) کے بغیر ممکن نہیں۔ ویسے ہی اُس عالم کا عروج

طریق پر دبانا اور فنا کرنا ہی رہبانیت ہے۔ اس کا کنٹرول اور صحیح محل پر استعمال ہی اسلام کا کمال ہے۔ مولویوں میں خشکی اور مرشدین میں تراوٹ! شگفتگی رہتی ہے۔ دونوں کے آثار بھی ظاہر ہیں۔ حضرت خواجہ اعظمؒ اور حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی تعلیمات تو زبان زد ہیں۔ کیونکہ انھوں نے محبت کے جذبہ کو اپیل کیا۔ اس کے برخلاف بڑے بڑے علماء کی کتابوں کو وہ قبولیت حاصل نہیں۔

(ھ) عبادتوں کی جان

حج میں ایک بڑے مشہور مولوی صاحب کے خلیفہ میرے ساتھ رہے۔ انھوں نے کہا، تمہارے اوقات باضابطہ نہیں۔ تلاوت برائے نام لیکن تمہاری باتیں جو بالکل اُوٹ پٹانگ ہوتی ہیں، میرے دل کو لگتی ہیں۔ اور تمہاری دینی عظمت میرے قلب میں ہر روز بیٹھتی جاتی ہے۔ میں رات دن وظیفے پڑھتا رہتا ہوں لیکن تمہارے پاسنگ میں نہیں معلوم ہوتا۔ راز بتاؤ۔ بے حد اصرار پر میں نے جواب دیا۔ اس کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک شخص نے گانے کے قواعد ضوابط کی کتابیں یاد کر لیں۔ اور اسی میں کل زندگی صرف کر دی۔ دوسرے نے گانا گا لیا۔ کیفیت پیدا ہو گئی جو مقصود ہے۔ یا ایک شخص نے قواعدِ عروض و بلاغت میں عمر گزار دی۔ دوسرے نے شعر کہہ دیا۔ کہئے۔ کون بڑھا ہوا ہے۔

شعر می گویم بہ از آبِ حیات
من نہ دانم فاعلات فاعلات

مطلب یہ کہ ایک کے پاس روح ہے۔ دوسرے کے پاس جسم۔ ایک کے پاس معنی تو دوسرے کے پاس لفظ۔ اگر روح و جسم، معنی و لفظ کی جامعیت ہو تو کیا کہنا۔ لیکن مقدّم کون ہے۔ دراصل حضور انورؐ کی محبت اور آپ کی

بھی محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ محبت، ادب، تعظیم ہی وہاں کی ترقیوں کی جان ہیں۔ ذکر چھیڑا کہ تڑپ شروع ہوئی۔ دُھن بندھی۔ دُھن ہی دُھن اپنی دُھن۔ اس عالم میں بھی نسبت کے لئے اس جذبۂ محبت (مردانگی) کی ضرورت ہے۔ اگر یہ جذبہ موجود ہو تو اس کا رُخ اعلیٰ کی طرف بھی پھیرا جا سکتا ہے۔ اسی لئے بعض مرشدوں نے اپنے بعض مریدین میں تکمیلِ سلوک کے لئے اس خوابیدہ جذبہ کو جگانے کا اہتمام کیا۔ مقصود معصیت میں ڈبونا نہ تھا۔ بلکہ اُن کے مُردہ جذبات کو زندہ کرنا، اور ترقی دینا، بھٹی میں نکھار دینا۔ تاکہ دین کے معرکوں یعنی اللہ، رسولؐ کے عشق و جہاد میں کام آ سکے۔ اس تجربہ کے بعد خالص فولاد ہوتا تو لیتے، کچا لوہا ہوتا تو پھینک دیتے یا لوہے کی حد تک کام لیتے۔ لوہے سے فولاد کی غلط امید نہ رکھتے۔

رسولُ اللہ کی محبت کے بغیر انسان مُردہ ہے۔ اس لئے کافر مُردہ ہیں لیکن فاسق و فاجر مسلمان بیمار ہیں۔ جان تو ہے۔ صحت کی امید کی جا سکتی ہے۔ ایک مریض شیر ہزاروں موٹے تازے مُردہ شیروں سے بدرجہا بہتر ہے۔ محبت و ایمان سے صحت پیدا ہوتی ہے۔ محبّت والے کی غلطیاں معاف ہیں۔ فطری کمزوری کی وجہ سے ہوتی رہیں گی۔ البتہ بڑی غلطیوں پر اصرار نہ کرنے کا حکم ہے۔ وہ بھی ہو جائیں تو توبہ کا حکم ہے۔

(د) مولوی، مشائخ کا فرق

ہمیشہ سے مولویوں اور مشائخ میں اختلاف رہا ہے۔ وہ عقلی اور یہ محبت والے لوگ رہے ہیں۔ ہر وقت گناہوں سے اتنا ڈرانا کہ تقویٰ محض ایک خیالی چیز بن کر رہ جائے اور زندگی میں مایوسی پیدا ہو جائے، نامناسب ہے۔ بلکہ نفس کا دھوکہ ہے۔ جذبات کو بے جا

دُھن سب عبادتوں کی جان ہے۔ اور یہی ترقی کا زینہ ہے۔ عشقِ محمدی حیات ہے، قوت ہے۔ اس سے ہٹ کر جتنی بھی ترقی ہو، سطحی ہے اسلامی نہیں۔

۳۲- (و) عشقِ مجازی۔ عشقِ حقیقی

ہر ایک کا اپنا طریق علاج ہے۔ بعضوں نے عشقِ مجازی کے ذریعہ تکمیل کرائی ہے۔ یہ شاذ ہے، اور بہت احتیاط طلب ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بعض اطبّا زہر سے بھی علاج کرتے ہیں اس میں ہر دو سے ذرا سی غلطی ہو تو جان جاتی ہے۔ اسی طرح بعض مرشدین نے کبھی کسی مرید کے اقتضاء کے تحت عشقِ مجازی کی شرط لگائی تاکہ محبت کی ناز برداریوں میں اس کی انانیت فنا ہو جائے اور وہ عشقِ حقیقی کے اعلیٰ اعتبارات سمجھ سکے۔ مثلاً محبت، وصل، فراق، فنائیت، محبوبیت، ایثار، قربانی وغیرہ۔ یہ اعتبارات دونوں طرف مُشترک ہیں۔ اگر کوئی شخص ان جذبات سے عاری ہو تو سلوک کے تعلق سے بھی یہ اعتبارات اس کی سمجھ میں نہ آسکیں گے۔ لیکن ملحد جہالت کی وجہ سے عشقِ مجازی ہی کو اصل سمجھتا ہے۔ اور اسے تقدّس کا رنگ دینے کے لئے کہتا ہے کہ عورت مرد ہر شئے اللہ ہے۔ ایک صاحب نے قلندر کے متعلق میری رائے پوچھی میں نے کہا، قلندر صالحین سے کمتر نامردوں سے بہتر ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ جس طرح جسمانی زندگی میں رجولیّت و مردانگی کی ایک کیفیت تو وہ ہے جو فطری ہوتی ہے کہ صحت جسمانی اور شباب سے حاصل ہوتی ہے۔ اور دوسری وہ جو مصنوعی ہوتی ہے مقوّیات یا خارجی تحریک سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح قلبی اور

روحانی زندگی میں بھی جذب و محبت کی فطری کیفیت وہ ہے جو قلب کی صحت و اعتدال سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جب قلبی عوارض کی وجہ سے یہ جذبہ مُضمحل یا مفقود ہو جائے۔ یا غلط راستہ پر پڑ جائے تو مُرشدین اور ہادیانِ راہِ سلوک اس جذبہ کو قوت دینے کے لئے وقتی طور پر طرح طرح کے علاج، نسخے، پرہیز، یعنی اذکار، اشغال و اوراد وغیرہ تجویز کرتے ہیں۔ قرآنی علم و سلوک کی مثال خالص دودھ کی سی ہے کہ قلب کی صحت و شباب کی حالت میں بہترین غذا ثابت ہوتا ہے ایک قرآنی سلوک والا ہزاروں قلوب پر بھاری ثابت ہوتا ہے۔ لیکن جب قلوب صحت و شباب کے جذب و کیف سے خالی ہوں تو یہ آثار پیدا نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے بڑے بڑے اعلیٰ اعتبارات پڑھ کر بھی بہت سے لوگ متاثر نہیں ہوتے۔ لیکن ان ہی اعتبارات کا سواں حصہ تحلیل شدہ شکل میں کوئی بیان کرے تو وجد کرنے لگتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بچوں، بیماروں یا کمزور صحت والوں کو دودھ میں پانی ملا کر دیا جائے ورنہ نفخ کرتا ہے۔ ہضم نہیں ہوتا۔ یہ تو فضلِ الٰہی ہے کہ انسان کو قرآن کے اُٹھانے کے قابل بنایا گیا۔ ورنہ پہاڑوں میں بھی یہ تاب و تواں نہیں کہ اٹھا سکیں

۳۳- مسلک کا تعیّن

مرشدین کے وہ اعمال و اقوال جن کا تعلق ان کے انفرادی ذوق سے ہو، اُن کی پیروی دوسروں کے لئے ضروری نہیں۔ ایسے اعمال و اقوال خوش عقیدگی کی بناء پر ان کے مُریدین کے لئے پیروی کے قابل ہو سکتے ہیں۔ سب کے لئے نہیں۔ ایسی خوش عقیدگی کو ایمان سے نہیں ملانا چاہیئے۔ علم کا ایک ہونا جدا ہے اور اس کے استعمال کا طور طریق جو مسلک کہلاتا ہے، وہ اور ہے۔ ایک صاحب نے

اولیاء اللہ کے اَحوال، اقوال، افعال پر اپنا مسلک بنانا چاہا تو فرمایا۔
کسی کے احوال میں نہ اُلجھئے۔ اپنا ایک مسلک بنائیے۔ کیونکہ احوال کی تعبیر
مشکل چیز ہے۔ مسلک یا تو علمی ہو یا محبت کا ہو، یا امر و خدمت کا ہو۔ اُسی
کے مطابق آثار آئیں گے۔ مسلکوں کے فرق کو خلط ملط نہ کرنا چاہیئے۔ دراصل
بلوغ مقصود ہے۔ بلوغ حاصل ہو تو ہجر و وصل شکوہ و شکایت، ناز و نیاز
کے احوال خود بخود تابع ہو کر آئیں گے۔ لیکن اگر بلوغ ہی حاصل نہیں تو بچے ان
اَحوال کو پڑھ کر مفہوم نہیں سمجھ سکتے اور نہ انہیں کوئی سمجھا سکتا ہے۔ جس طرح
جسمانی بلوغ ہوتا ہے ویسے ہی قلبی و روحانی بلوغ ہوتا ہے۔ اس کے
مشابہت ضرور ہے۔
بھی آثار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ ادنیٰ کا فرق ہے۔
لاڈلا چھوٹا بیٹا ہے۔
محبت کے مسلک والا علم و عمل کچھ نہیں رکھتا۔
اَمّاں، ابّا کے سوا چین نہیں۔ اس محبت کی لاج ایسی رہتی ہے کہ والدین اس
کے لئے خود بخود سب کچھ کر دیتے ہیں۔ البتہ بڑا بھائی صاحبِ خدمت ہوتا
ہے۔ صاحبِ حکومت ہوتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح لاڈ پیار کرے تو نظم خراب
ہو جائے۔ وہ امر کے مقام پر رہتا ہے۔ محنت کر کے کماتا اور والدین کا حق
ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے محل پر بہت اہم ہے۔ بعض محبت کے ساتھ حکومت کو
ملا کر چلاتے ہیں۔ بعض بالکل علمی مسلک رکھتے ہیں۔ جس میں خشکی ہوتی ہے۔
یہ محبت والے کے مقام کا وزن اور آثار نہیں رکھتے۔ دین میں اپنے اقتضاء
کے لحاظ سے ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہے۔ بعض زاہد مرتاض ہوتے ہیں
جن کو علم، محبت، حکومت سے مطلب ہی نہیں ہوتا۔ لہذا اپنی طبیعت کے لحاظ
سے کوئی سا مسلک یا پیر اختیار کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو دیکھ کر رنگ نہ
... کا اقتضاء دیکھ کر دوسرے پیر سے بیعت کرنی

نصیحت کی۔ ہر جائی بھی نہ بنیں اور اپنے اعتبارات و احوال سوائے
اہل کے ہر ایک سے نہ بیان کریں۔ ورنہ سلب ہونے کا اندیشہ ہے۔
رسول اللہ صلعم کو ہر آن اپنا مرکز رکھنا، محبت کا محور بنانا، یہی ترقی کا اصل
مقام ہے۔

۴۳۔ زندگی کا خواب اور سلوک

اکثر مرشدین خوابوں پر زور دیتے ہیں، روز پوچھتے ہیں۔
کیا تم نے کوئی خواب دیکھا۔ نتیجہ یہ کہ مرید وہمی ہو جاتا ہے۔ واہمہ ترقی کرتا
ہے اور وہ خواب دیکھنا شروع کرتا ہے۔ چونکہ خواب و خیال کا عالم بہت
وسیع ہے۔ وہ واقعات سے دور جا پڑتا ہے۔ ان کے پاس عملی زندگی
کی اہمیت نہیں رہتی۔ آنکھ بند کر کے نورانی عالم میں جانا چاہتا ہے۔
لہذا کیوں نہ مریدین کو اس عالمِ شہادت کی زندگی کی اہمیت بتائی جائے
کہ اس زندگی کا خواب کتنا خوب ہے۔ اس پورے عالم کو دیکھو اس کی
تجلیات دیکھو کہ یہی عبادت ہے۔ یعنی کائنات میں ہر چیز مردہ ہے۔
لیکن اُسی میں سے حیات، علم ارادہ قدرت، سماعت، بصارت کلام کیسے
ظاہر ہو رہے ہیں۔ بچوں کے ساتھ کیا تجلیاں ہیں۔ بی بی کے پاس کیا
تجلی ہے۔ آسمان زمین پر کیا تجلیاں ہیں۔
بعض مرشدین مریدین کے اقتضاءات کے خلاف حبس دم، ذکر
جہادی بتاتے ہیں۔ پہلے ہی صحتیں خراب، اعصاب برباد ہیں۔ ان کی فطر
و قویٰ کا لحاظ کئے بغیر قوی اذکار بتائیں تو ردِ عمل ہوتا ہے۔ صحت برباد
ہوتی ہے۔ بزرگوں کے مجوزہ سلوک درست ہیں کیونکہ نیت بخیر ہے۔
انھوں نے توحید و رسالت کی تفہیم کے لئے ذوق، ماحول فضا کے مطابق

نسخے تجویز کیے لیکن کسی فروعی چیز کو اصل قرار دینا اور اس کی سند کو حضورؐ
کی طرف منسوب کرنا جسارت ہے۔ ہندوستان کے لوگ محبت والے
ہیں۔ اس لئے حضرت خواجۂ اعظمؒ نے قوالی کے ذریعہ سلوک الی اللہ طے
کرایا۔ گویا پانی میں شکر ملا کر شربت بنا دیا۔ حضرت غوثِ اعظمؓ نے
ترکِ ارادت اور تحتِ امر رہنے پر خاص زور دیا۔ حضرت خواجہ نقشبندؒ کو
قوی سخت تند مزاج ترکوں اور مغلوں سے سابقہ ہوا۔ جن کی اصلاح
قوی ذکر کے ذریعہ ممکن تھی کہ سختی کی وجہ سے محلول نہیں بن سکتا تھا۔
اس لئے کھرل کرنا ضروری ہوا۔ ہر قسم کے لوگ ہیں، ہر قسم کے مریض ہیں۔
اس لئے حاذق حکیم کو علٰحدہ علٰحدہ نسخے تجویز کرنا چاہیئے نہ کہ سب مریضوں
کو ایک ہی نسخہ دے جیسا کہ بعض مرشدین کرتے ہیں۔

۳۵-(ا) مراقبۂ فنا، بقا اور کمالات

فرمایا، اصل علم علمِ قرآنی ہے۔ باقی
کھیل تماشا ہے۔ حضرت غوثِ اعظمؓ مراقبوں پر زور نہیں دیتے تھے۔
تصورِ شیخ اور دوسرے مراقبوں سے بھی چیز حاصل ہوتی ہے لیکن
وقتیہ۔ علمِ صحیح سے اطلاقیت پیدا ہوتی ہے۔ ہر وقت حال طاری رہتا
ہے۔ آثار جاری رہتے ہیں۔ قرآنی سلوک علم کی تصحیح کرتا ہے۔ ہر چیز
اپنے محل پر رہتی ہے۔ البتہ ہر محل کی پہچان ہو جاتی ہے۔ ایک کافر جب
مسلمان ہوتا ہے تو محض تبدیلِ علم سے اس میں زمین آسمان کا فرق پیدا
ہو جاتا ہے۔ اکثر مرشدین فنا، بقا، توحیدِ ذاتی کے مراقبے بتاتے ہیں۔
جن پر مجھے اعتراض نہیں لیکن اس میں عمریں صرف ہو جاتی ہیں۔ اور مشکل
سے کوئی چیز حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف علمِ قرآنی حاصل کرو تو

ایک لحظہ میں فنا، بقا حاصل ہو جائے، چاہے اس علم کو ایک منٹ میں
جمالو یا برسوں میں جماؤ، اپنا اپنا حوصلہ ہے۔
قرآن کے لحاظ سے فنا کے تصوّرات یہ ہیں کہ اپنے آپ کو ہم میّت
جاہل، مضطر، عاجز، اصم (بہرا)، اعمٰی (اندھا)، ابکم (گونگا) جانیں تو یہی فنائیت
ہے۔ اس کے بعد حیات، علم، ارادت، قدرت، سماعت، بصارت، کلام کو من اللہ
اپنے میں پائیں تو یہی بقا ہے۔ اس طرح ہر آن فنا، بقا جاری ہے۔ جتنی
دیر سو جاتے ہیں سارے عالم سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اس بے خبری کو حواس
کو معطل کر کے کیوں حاصل کریں۔ کیوں نہ علم کی تصحیح کر کے اپنی بے خبری
و بے خودی کا ادراک حاصل کریں۔ یعنے وجود و انا، صفات ہمارے
نہیں حق کے ہیں جو ہمارے لئے امانت ہیں۔ اس طرح علمِ غلط کو چھوڑنا
فنا اور علمِ صحیح حاصل کرنا بقا اور دریافت ہے۔ اپنے کو عدم و جہل کے
مقام پر دیکھے اور محض معلومِ حق جانے کیونکہ ہمارا قیام علم ہی ہے۔ اپنے
کو تعیّنِ علمی کے سوا کچھ نہ جانے یعنے صورتِ معلومہ۔ اس کے اوپر توحیدِ
ذات کے دعوے غلط ہیں۔ البتہ علم کے اوپر جو علم عطا ہو وہ کہنے کا نہیں۔
جس نے کہا، بری طرح پٹخیاں کھائیں۔ کسی نے انا الحق کہا کسی نے کچھ اور۔
اس لئے اوپر کوئی چیز نہ قابلِ بیان ہے نہ قابلِ تحریر۔ البتہ قرآن میں
اس کے اوپر صرف اتنا کہا گیا ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ
وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۷/۱۴) اس انتہائی مقام کے
متعلق بھی حضورؐ کو کہا گیا ہے۔ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (۲۷)
یعنے عبدیت کو باقی رکھتے ہوئے علم (وحی) دیا جاتا ہے۔ کتنی ہی ترقی کریں
اپنے کو اللہ کا بندہ اور رسولؐ کا غلام جاننا کمال ہے۔ وہ تو بہت بڑے

ہیں۔ اپنے کو حضرت غوث اعظمؓ کا غلام دیکھیں تو معلوم ہو کہ کیا رحمتیں، نُصرتیں ملتی ہیں۔

(ب) کمالات سب سے بڑا کمال اپنے کو بے کمال سمجھنا ہے۔ پھر غیب سے سارے کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔ جو کمال کا خواہشمند ہو اُسے کمالات و کرامات نہیں ملتے۔ حضرت موسیٰ کی طرح آثار (کمالات) کا اظہار ہونا چاہئے کہ خود کو خبر نہیں۔ عصا پھینکا تو سانپ بن گیا۔ یہاں تک کہ خود ڈر گئے تو اللہ تعالیٰ نے لَا تَخَفْ فرمایا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خود کو خبر نہیں ہوتی اور صورت سے کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک دوست نے بیان کیا کہ مغرب کے وقت جنگل میں ان کی موٹر کا پہیہ نکل گیا۔ بہت پریشان ہو گئے اس پریشانی میں انھوں نے مجھے دیکھا کہ کہہ رہا ہوں۔ موٹر چلاؤ۔ چنانچہ انھوں نے موٹر چلائی اور بخیر و خوبی حیدرآباد پہنچے اور مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا۔

۳۶۔ سلوک کا ماحصل بڑے بڑے حاکموں، عہدہ داروں کو دیکھو کہ بے عقلی، بے علمی، بے ہمتی کے باوجود کام کر رہے ہیں۔ اسے حکمتِ الٰہیہ تجلی کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔

مال و دولت بہ کاردانی نیست جز بہ تائیدِ آسمانی نیست

اِس لئے سارے سلوک کا ماحصل یہی ہے کہ اقتضاآت و تجلیات کا تماشا بلالحاظِ نتائج دیکھتے جائیں۔ اِسی دید میں کچھ مل جائے تو اسے انعام جانیں۔ - - - - - - - - - - - حکمتِ الٰہی میں کون کیسے واقع ہوا ہے اس کی ترکیب پر نظر رہے۔ البتہ دعا کئے جائیں۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ منشائے الٰہی کے مطابق، صحیح اعتبار میں ہر آن زندگی گذرے

آخر ہم جن کی امت ہیں اُن کے آثار ہم میں بھی تو آئیں گے۔ انبیاء پر بڑی مصیبتیں آئیں۔ اگر کوئی کہے کہ مومن پر ایسا ظلم کیوں ہو رہا ہے تو یہ جہل ہے۔ یہ مخالف چیزیں اس کے ایمان کی تکمیل کے لئے آئیں گی، جس کا مقصد تحقق ایمانی اور استقامت فی الدین ہے۔ ورنہ ایمان کے بعد اگر سب مفید مطلب چیزیں مل جائیں تو شیطانوں، ظالموں کے اقتضاآت کس کے مقابل ظاہر ہونگے اور ایمان و استقامت کی قوت اور نصرتِ حق کیسے ظاہر ہوگی یہی وجہ ہے کہ انبیاء، اولیاء، ظلم سہتے ہوئے رحمانیت کے تحت اقتضاآت کو پورا کرتے ہیں۔ اور دعائیں کرتے جاتے ہیں۔ محض نتیجہ مشروط نہیں رکھتے۔ قرآن میں ہے، جب اللہ نے ابراہیمؑ کو کئی باتوں میں آزمایا اور وہ ان کو پورا طور پہ بجالائے تو اللہ نے فرمایا: میں تم کو لوگوں کا امام بناؤں گا (۱/۵) سلوک کا خلاصہ علمی ایمانی تحقق اور استقامت تھا نتیجہ یہ کہ امت کی امامت عطا کی گئی۔ انجام کے متعلق اخیر تک کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ مقلب القلوب ہے۔

۳۷۔ شُغلِ مُطلق شُغلِ مُقیّد اصل سلوک یہ ہے کہ قرآن کے مطابق اپنے علم و عمل کی تصحیح ہو جائے اور قرآنی علم حال بن جائے۔ یہی اصل نعمت ہے۔ اس کے مقابل بعض لوگ اشغالِ مقیدہ کو اہمیت دیتے ہیں۔ اور اسی کو مدارِ سلوک سمجھتے ہیں۔ اس کی افادیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ کیونکہ ذکر کے بھی انوار ہیں۔ آثار ہیں، اُجور ہیں لیکن تصحیحِ علم کے بغیر اگر ہماری زبان، اعضاء، جوارح، بلکہ بال بال بھی ذکر کرتے رہیں تو اصل نعمت تو حاصل نہیں ہوئی۔ ایسے بعض لوگوں کا علم و عمل قرآن کے خلاف دیکھنے میں آتا ہے۔ قرآن کے مطابق تصحیحِ علم کے بعد اس علم پر قیام اور اس کو اپنا حال بنا لینا شغلِ مطلق ہے ۲۸

کا حکم رکھتا ہے۔ شغل مطابق مقام بن جائے تو ہر حال حال ہو جاتا ہے۔ اس سے عمل
میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ علم عین ذکر اور ذکر عینِ علم ہو جائے تو کمال ہے۔ لیکن اکثر
لوگوں کا ذوق سلوکِ ذکری اور اشغالِ مُتقیدہ کی طرف رہتا ہے۔ یعنے
چلوں، زکاتوں اور مجاہدوں کی طرف۔ ان سے حجت، بحث مناسب نہیں۔
یہ لوگ ہمیشہ لطائف اور ان کے الوان وانوار وغیرہ پر زور دیتے ہیں جو
اکثر تصورات سے بھی پیدا ہوتے ہیں اور خیالی بھی ہوتے ہیں۔ اس میں
بڑے دھوکے ہیں۔ شیطان بعض اوقات خوب چکر دیتا ہے مختلف
رنگوں، روپوں میں خود ظاہر ہوتا ہے۔ پس اصل معیار قرآن ہے کہ علم
وعمل، حال وقال قرآن کے مطابق ہو جائے۔ اس لئے علمی سلوک ذکری
سلوک سے بہتر ہے اَحسَن ہے، اسلم ہے۔ اس میں بجلی کی رفتار سے
مقامات طے ہوتے ہیں اور حفاظتِ الٰہی شاملِ حال رہتی ہے۔

۳۸۔ صحیحِ علم وعمل کے آثار مکشوفات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مختلف نادر چیزیں اور
شکلیں نظر آئیں۔ دوسرے یہ کہ اشیاء نظر آئیں اور اُن کے ساتھ اُن کا منشا
محل، افعال ونتائج بھی معلوم ہوں۔ مثلاً ایک شخص صرف موٹر دیکھتا ہے
اور دوسرا شخص موٹر کے ساتھ مشینری کی حکمتوں کا علم پا جاتا ہے۔ صحابہ
کے پاس مکشوفات کی اہمیت نہ تھی۔ ایمان کو اصل سرمایہ جانتے تھے۔
ان کے پاس فلسفہ کا چکرا نہ تھا۔ وہ راست حضورؐ سے قرآن لیتے۔ یَا
أَیُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ
الْحَمِيدُ (۲۲/۱۵) پر ایمان تھا اور اس پر جمے ہوئے تھے۔ جاہل کہتے
ہیں۔ صحابہ میں اولیاء اللہ نظر نہیں آتے حالانکہ ان میں ہر شخص ولی تھا۔

اعلیٰ مدارجِ ولایت کا حامل تھا۔ اِن کا علم جزوِ زندگی تھا۔ وہ علم کے ساتھ
عمل میں سرگرم تھے۔ اِن کے پاس صرف قال نہ تھا بلکہ حال تھا۔ لوگ بلا عمل
محض قیل وقال سے متاثر نہیں ہوتے
نہ فیوض وبرکات حاصل ہوتے۔ صادقین اولیاء اللہ کو جتانے، بتانے کی
ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ زندگی میں جو اعمال کرتے ہیں وہ علمِ الٰہی اور سنت
رسولؐ کے تابع ہوتے ہیں۔ اس نسبت سے قلوب متاثر ہوتے ہیں فیضان
جاری ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اللہ کو کسی کا استتار پسند ہو۔ محض علم کا
ہونا اور عمل نہ ہونا ایسا ہے جیسے کسی کے پاس انجکشن کی شیشی ہے۔
فائدہ اس وقت ہوگا جب انجکشن لیا جائے۔ یعنے اگر قرآنی علم قلب و
روح میں سرایت کرے تو اعلیٰ آثارِ حیات ظاہر ہوں گے۔ محض دین کا دعویٰ
کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ دوسروں کی مصیبت کے وقت بے نفسی،
خلوص ظاہر ہوں تو معلوم ہوگا وہ اللہ والا ہے۔ اس کی امتحان گاہ
غرباء، بچے، ضعیف ہیں۔ جن کو دیکھ کر اس میں اچھا جذبہ اُبھرنا چاہیئے۔
اگر قلب وروح میں قرآنی علم سرایت کئے بغیر کوئی شخص اچھا عمل کرے
تو وہ بظاہر اولیاء اللہ کی طرح معلوم ہوگا۔ جن کا عمل بے نفسی کے تحت ہوتا
ہے۔ لیکن درحقیقت وہ کمیونسٹوں کا سا عمل ہوگا۔ جسدِ بے روح ہوگا۔
کیونکہ اس کا مقصد نفس ودنیا ہے۔ جس کا نتیجہ نفاق وشقاق وفساد ہے۔

۳۹۔ علم کی برتری عمل پر ایک صاحب نے کہا مسلمان محض علم (ایمان) سے نہیں بنتا۔ عمل لازمی ہے
عمل کے بغیر علم کوئی چیز نہیں۔ فرمایا۔ آجکل ہر طرف سر پھروں کی فوج ہے
جن میں جوش ہے اور عمل پر زور ہے، واقعی عمل ضروری چیز ہے۔ لیکن

عمل پر علم کی تقدیم سے انکار کرنا سخت جہالت ہے۔ علم و عمل کا ربط ابھی معلوم نہیں۔ قرآن میں کتاب و حکمت کا علم اور علمِ لدنی کی برتری بتائی گئی ہے حدیث میں عالموں کی روشنائی کو مجاہدین کے خون کے مماثل بلکہ افضل بتایا گیا ہے اس لحاظ سے علماء کو دین کا خادم سمجھا جائے گا یا نہیں۔ یہ لوگ علم کی اہمیت سے لاعلم رہ کر نادانی سے صرف عمل پر زور دیتے ہیں حالانکہ علم کے بغیر عمل کوئی چیز نہیں۔ علم روح ہے تو عمل جسم۔ قرآن میں کافروں کے متعلق کہا گیا۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۱۶/۳)۔ (ان کے سارے اعمال غارت ہو گئے)۔ آخر عمل والوں کے سوا اِس حکم کا کس پر انطباق و اطلاق ہوگا۔ بات صاف ہے کہ علم صحیح نہ ہونے یا علمی نقص کی بناء پر ہی عمل کالعدم ہو جاتا ہے۔

۴۰۔ حقائق و معارف کے بیان کے نقصانات

بڑے حضرت قبلہ (حضرت کے دادا پیر) ایک عقیدتمند غیر مسلم سے حقائق و معارف بیان فرماتے تو میں اختلاف کرتا کہ یہ انبیاء کے طریقہ کے خلاف ہے۔ جو لوگ اصحابِ شمال میں ہیں، قرآنی طریق یہ ہے کہ اُن سے حقائق و معارف نہ بیان کئے جائیں بلکہ تفہیم کی ضرورت باقی رکھی جائے۔ فتوح الغیب اور فتوحِ ربانی سے بھی حضرت غوثِ اعظم رضہ کا یہی اصول ظاہر ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے حقائق نہیں بیان کئے۔ بلکہ سیدھے سادے اسلامی عقائد پیش کئے۔ اسلام اختیار کرنے کے بعد، علم و عمل کی استقامت پر، مقربین کے مقام کا علم بطور انعام عطا ہوتا ہے۔ اور فضل سے کھلتا ہے محض حقائق کہنے سے نہیں کھلتا۔ اسی حد تک ہماری تبلیغ ہو۔

۴۱۔ پیری، فقیری

سر رچرڈ برٹن کو انگریزوں نے حرمین شریفین کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ بڑی ذہانت و ذوق کا آدمی تھا۔ چھ مہینے میں حجاز و مصر وغیرہ کا سفر کیا۔ پہلے وہ سندھ میں مسلمان بن کر رہا۔ اور ایک مرشد سے قادریہ طریق میں خلافت حاصل کی۔ اور مکہ مدینہ رہ کر دو جلدوں میں ایک ہزار صفحات کا سفر نامۂ مکہ مدینہ لکھا۔ وہ لکھتا ہے۔ مسلمانوں میں درویشی اور مرشدی ہی سب سے زیادہ خطرناک چیزیں ہیں اور سب سے زیادہ پُر لطف بھی۔ اگر مسلمانوں میں بے خطر، بلا بازپرس رہنا مقصود ہو تو پیری فقیری اختیار کریں۔ مجھے اسی سے بہت مدد ملی، درویشی ہی ایسی چیز ہے جس میں ساری برائیاں نبھ جاتی ہیں۔ کتنا ہی میلا آدمی ہو، صاف لوگوں سے بہتر سمجھا جائیگا۔ کتنا ہی بد مزاج ہو، خوش اخلاقوں سے بہتر سمجھا جائیگا۔ کتنے ہی عیوب ہوں، عیب شمار نہ ہونگے، بلکہ خوبیاں سمجھی جائیں گی۔ ہر قسم کی بے اعتدالیاں، جہالتیں، بدتمیزیاں سب نبھ جاتی ہیں۔ اور شریف سے شریف، خوبصورت عورتوں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

۴۲۔ قوالی کی حقیقت

فرمایا۔ قوالی صرف چشتیوں کے پاس جائز ہے۔ اس کا خاص زور حضرت خواجۂ اعظم اجمیری رضہ کے وقت سے رہا ہے۔ قادریوں کے ہاں ایک شاخ میں قوالی جائز ہے۔ سب میں نہیں۔ قوالی کا جواز حضورِ انور کی مدینہ طیبہ میں تشریف آوری کے وقت، مدنی بچوں، بچیوں کے نعتیہ اشعار گانے اور دف بجانے سے لیا جاتا ہے جس کو حضورؐ نے سنا اور پسند فرمایا۔ چشتیوں میں حضرت نصیر الدین چراغ دلی رح سماع نہیں سنتے تھے لیکن حضرت محبوبِ الٰہی رح کے مریدِ خاص حضرت امیر خسرو رح نے قوالی کو خوب فروغ دیا۔ آپ فنِ شعر و موسیقی کے بڑے ماہر تھے۔

ہمارے بڑے حضرت قبلہ فرماتے تھے ؎

زندہ دِلاں مُردہ تناں را روا ست   مُردہ دِلاں زندہ تناں نا روا ست

اس سلسلہ میں حضرت مظہر جانِ جاناںؒ کا مسلک بہت اسلم ہے۔ آپ فرماتے تھے۔

نہ انکار می کنم و نہ ایں کار می کنم۔   یہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ کا مشہور قول ہے۔

میں نے جہاں تک مطالعہ کیا، اصل سوال ذوق اور طبعی مناسبت کا ہے۔ جن کو موسیقی سے مناسبت نہیں وہ اسے ناپسند کرتے ہیں اور جن کو مناسبت ہو، وہ پسند کرتے ہیں۔ جن نقشبندیوں کو موسیقی سے طبعی مناسبت ہوتی ہے۔ عجیب مشکل میں پڑجاتے ہیں۔ کرتے ہیں تو سلسلہ کے مسلک کے خلاف، اور نہیں کرتے ہیں تو طبعی کوفت۔ دراصل فطرت و کائنات (ہوا، پانی وغیرہ) میں موسیقی ہے۔ جب تک ہر چیز مطابقِ حال نہ ہو بڑی دِقت رہتی ہے۔ ضرورت درحقیقت تصحیح علم کی ہے۔

محفلِ قوالی کو اہلِ ذوق کی حد تک مخصوص کرنا مناسب اور ضروری ہے۔ اسے تماشا نہ بنائیں۔ صفائی، پاکیزگی، وضو، ادب، تعظیم شرطِ اولین ہیں۔ توجہ خاص کے ساتھ درود شریف کی کثرت ہو۔ قوالوں کو عزت سے اچھے ممتاز مقام پر بٹھائیں۔ دراصل قوال جلسہ میں فیض کا محرک ہوتا ہے۔ جس کی طرف کل محفل کو متوجہ ہونا پڑتا ہے وہ بھی آداب کا پابند ہو اور مجلس میں باوضو رہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے (جو سلسلۂ نقشبندیہ کے اکابر میں سے ہیں) اپنی کتاب ہمعات میں ایک قسم کے سالکین کے لئے سماع کو مفید بیان

فرمایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس سے آہستہ آہستہ جامد طبیعت والے سالکین کی طبیعت کا جمود ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت مجدّدِ الف ثانیؒ نے مکتوب ۲۸۵ جلد اول میں تحریر فرمایا ہے کہ سماع و وجد مُبتدی کے لئے مُضر ہے۔ اور اس کے عروج کے لئے رکاوٹ ہے، خواہ شرائط کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ متوسط کے لئے اور ایک قسم کے منتہیوں کے لئے مفید ہے۔ حضرت مجدّدؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ مبتدی سے ہماری مراد وہ شخص ہے جو اربابِ قلوب یعنے صاحبانِ دل میں سے نہیں ہے۔ اور اربابِ قلوب وہ لوگ ہیں جو مبتدیوں اور منتہیوں کے درمیان متوسط ہوتے ہیں۔ اور منتہی وہ ہے جو فانی فی اللہ اور باقی باللہ اور واصِل کامل ہو۔

۴۳۔ خاص و عام محفلِ قوّالی

اولیاء اللہ جو عوام کو اپنی محفلوں میں نہیں آنے دیتے، دین و ایمان کے تعلق سے اس میں حکمت ہوتی ہے، بخل نہیں بلکہ طالبوں کی حفاظت مقصود ہوتی ہے۔ بعض وقت ایسی باتیں بیان میں آتی ہیں جس سے کسی کو اختلاف ہوتا ہے۔ حجت تمام ہو کر اس کا ایمان سلب ہوجاتا ہے۔ اولیاء اللہ کی محفلوں میں ایک جہت تعمیم کی ہوتی ہے اور ایک جہت تخصیص کی۔ عام محفلوں میں وہ ایسے اعتبارات رکھتے ہیں اور ایسا فیض ہوتا ہے جو سب کو حاوی ہو اور خاص محفل میں خاص خاص لوگ ہی آسکتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا آئے تو فیض بند ہوجاتا ہے۔

حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ اپنے ایک امیر مرید کے گھر قوالی کا انتظام فرماتے تھے۔ خاص خاص اصحاب آتے۔ ایک دن اُن امیر کے دوسرے امیر دوست نے اصرار کیا تو شرکت کی اجازت دیدی۔ سماع شروع ہوا۔

حضرت نے تھوڑی دیر بعد فرمایا ۔ کیا کوئی نیا آدمی ہے ۔ فیض بالکل بند ہے
مرید نے کہا، میرے ایک دوست حضرت کے معتقد آئے ہیں ۔ ناراض ہو کر واپس
روانہ ہو گئے ۔ راستہ بھر سر بازار اس امیر نے اپنی دستار حضرت کے
قدموں پر رکھی ۔ ساری خلقت کے سامنے معافی چاہی لیکن حضرت نے توجہ
نہ فرمائی اور گھر تشریف لے گئے ۔ اس کے بعد اس امیر نے کہلایا ۔ میں خطاوار
ہوں حضرت کی ناراضی کے بعد اس دنیا میں رہنا نہیں چاہتا ۔ حضرت نے اس
کے اخلاص کے مدنظر اپنا چغہ عطا فرمایا ۔ لوگ حیران رہ گئے اور عرض کیا چغہ
تو خلافت کی نشانی ہے ۔ فرمایا جس مرتبہ کے اخلاص کا سر بازار اس امیر نے
اظہار کیا ہے ۔ اس اخلاص کا یہی بدل ہے ۔

فرمایا ۔ میرے گھر میلاد شریف کی قوالی سال میں ایک مرتبہ بڑے اہتمام
اور خاص پابندیوں کے ساتھ ہوتی تھی ۔ خاص احباب کے سوا کسی کو اجازت
نہ تھی ۔ دورانِ سماع میں ایک صاحب نے اجازت طلبی کا خط بھیجا ۔ مجھے تکلف
ہوا لیکن مروت سے بعض بزرگوں نے اجازت دینے کے لئے ارشاد فرمایا ۔ میں
نے کہا، لطف کرکرا ہو جائیگا ۔ مجبوراً اجازت دی گئی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوالوں کی تین چوکیاں
یکے بعد دیگرے بیٹھیں لیکن رتی برابر فیض نہ آیا ۔ سب نے میری بات کی تصدیق کی ۔

۴۴ ۔ درود شریف اور جذب قوالی کی ایک محفل میں ایک صاحب پر شدید وجد و حال طاری ہوا ۔
فرمایا ۔ رسول اللہ کہو، درود پڑھو سکون ہو جائے گا ۔ درود شریف باعثِ
تسکینِ قلب ہے ۔ اسی سے ساری کائنات کا قیام ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ
اور ملائکہ درود پڑھ رہے ہیں ۔ "ھو" میں کسی اور کی گنجائش نہیں، سارا عالم
بھسم ہو جاتا ہے ۔ انبیاء تک حضور انور کے پاس سہارا لیتے ہیں ۔ توحید میں

حرارت ہے ۔ رسالت میں ٹھنڈک ہے ۔ کتنا ہی زیادہ حقیقی جذب کیوں
نہ ہو ۔ درود شریف پڑھنے سے جذب رفع ہو کر ہوش و حواس درست ہوتے
ہیں ۔ ورنہ سمجھو کہ مصنوعی جذب ہے، یہی اس کی پہچان ہے ۔ اس طرح بڑے
بڑے مجذوبوں کو آزمایا گیا ہے ۔

ایک دفعہ مولانا عبدالقدیر صاحب حضرت کے پاس قوالی تھی ۔ ایک درویش
کو اپنی توجہ کی قوت کا دعویٰ تھا ۔ انھوں نے توجہ دے کر واقعی پوری محفل کو بسمل
بنا دیا ۔ اس کے بعد مجھ پر توجہ دینے کا خیال ظاہر کیا ۔ میں نے کہا، بسم اللہ، کوئی کسر
اٹھا نہ رکھیں ۔ ڈیڑھ گھنٹہ زور آزمائی کی، تھک کر چور ہو گئے ۔ مخلص تھے، اپنا
کان پکڑ کے سب کے سامنے کہا، ہار مانتا ہوں، معافی چاہتا ہوں ۔ آئندہ ایسا
دعویٰ نہ کروں گا ۔ آپ نے تو میرے جذبِ توحید کی انگیٹھی ٹھنڈی کر دی ۔ اس
کو روشن کرنے میں مجھے عرصہ لگے گا ۔ اصل راز یہ ہے کہ میں رسالت کے تحت
درودِ شریف کے ذریعہ حضور انور کے پاس تھا ۔ رسالت میں ٹھنڈک ہے توازن
ہے ۔ وہاں کون زور چلا سکتا ہے ۔ وہ خود ٹھنڈے ہو گئے ۔

۴۵ ۔ اردو نعت اردو میں محسن کاکوروی اور کیف ٹونکی وغیرہ نے خوب نعتیں کہی ہیں ۔ ان کی بندشیں غالب و سودا کے
قصائد کی طرز پر ہیں ۔ ان میں محبت کا خوب جوش ہے ۔ کیف ہے لیکن ان میں
اعلیٰ معارف و حقائق کا بیان کم ہے ۔ وجہ یہ کہ معارف ان کا میدان نہیں البتہ
محبت کے میدان کے مرد ہیں ۔ کلام میں محبت کا توازن اور علمی حقائق کا بیان
بڑے پیمانے پر ہونا بھی ضروری ہے ۔ اسی کے ساتھ عبدیت کے چھینٹے ایسے
دیئے جائیں کہ مشائخ و وہابی دونوں دم بخود رہیں ۔ وہابی عبدیت پر زور دیکر
اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں کہ رسول کچھ نہیں ۔ حالانکہ قرآن کی رو سے اسی

عبدیت میں انتہائی رفعت و محبوبیت مُندرج ہے۔

(افسوس ہے کہ نعت میں قصیدۂ بُردہ شریف، اور درود شریف میں دلائل الخیرات جیسی کتابیں حرمین شریفین میں ممنوع ہیں اور ضبط کر لی جاتی ہیں۔ للمؤلف حلیم)

۴۶۔ فلمی طرز پر نعتیں

فریدالدین متین اور یوسف خلیق نوجوانوں نے فلمی طرز پر نعتوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا، جو نُدرت و اُپج کے لحاظ سے ناچیز مؤلف کو پسند آیا۔ یہ مجموعہ ناچیز نے حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اس خاص خدمت پر اظہارِ خوشنودی فرمایا۔ اور ہمت افزائی کے لئے اِن نوجوانوں کو بلایا اور فرمایا۔ یوں تو شہر میں بیسیوں شاعر ہیں۔ میں کسی سے نہیں ملتا اور نہ میرے پاس وقت ہے۔ لیکن تم بچوں کو دیکھنے کا خیال اس لئے آیا کہ تم نے اپنے لئے ایسا میدانِ عمل اختیار کیا ہے، جس میں کسی اور شاعر نے قدم نہیں رکھا۔ اس میں نُدرت اور اُپج ہے۔ قرآن میں حکم ہے۔ تعاونوا عَلَی البِرِّ وَالتَّقوٰی (پ۶) نیک کام کرنے والوں کی خدمت دامے، درمے، قدمے، سخنے ہونی چاہیئے۔ بعض وقت کام تو بڑا کرتے ہیں لیکن اس کی اہمیت سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے میں نے چاہا کہ تمھیں بتاؤں کہ اللہ تعالیٰ تم سے کتنا بڑا کام لے رہا ہے۔ اسے معمولی نہ سمجھو۔ مسجد میں تو ہر کوئی وعظ کہتا ہے اور وہاں سننے والے موجود ہوتے ہیں لیکن تم نے سینما جانیوالوں کو وعظ کہا ہے۔ یہ کام دوسرے نہیں کر سکتے۔ سینما کی طرزیں، بچوں، بڑوں میں مقبول ہوتی ہیں۔ گو اُن میں اچھے شعر برائے نام ہوتے ہیں۔ تم نے اُن کی مقبول طرزوں میں بہتر خیالات اور

کلام دیدیا۔ یہ بڑی خدمت ہے۔ جب بچے دوا نہیں کھاتے اور چاکلیٹ چاہتے ہیں تو چاکلیٹ یا مٹھائی میں دوا رکھ کر بچوں کو کھلاتے ہیں، تو دوا کا فائدہ ان کو پہنچتا ہے۔ تم نے فلمی طرز پر جو نظمیں ڈھالی ہیں وہ گویا چاکلیٹ ہیں جس میں اللہ، رسول اور اولیاء اللہ کی محبت بھردی ہے۔ پبلک اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے، ممکن ہے تم نے شوق میں کیا ہو، اہمیت سے واقف نہ ہو۔ لیکن یہ توفیق کی چیز ہے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے۔

. . . .

. . . . گو کلام ناقص سہی لیکن محبت اور غیرتِ دین کا آئینہ ہے۔ بعض شعر تو تمھارا حصّہ ہیں خصوصاً فلم شباب (جلے) پر نظم خوب ہے۔ اسے نمبر ایک یا آخر میں رکھو تاکہ اس پر دل ٹھہرے میں نے معنے کی وضاحت کے لئے اپنی طرف سے اس نظم میں ڈھائی شعر کا اضافہ کیا ہے۔ جس پر وہ بہت خوش ہوئے۔ حضرت شائق احمد حمزہ حیدرآبادی مرحوم نے بھی اپنے زمانہ کی تھیٹروں اور طوائفین کی مقبول ہندی اُردو بحروں میں نعتیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

۴۷۔ فقیری کے نکتے

۱۔ عبادت توجّہ اِلی اللہ کا نام ہے۔ ہر نعمت و رحمت کو اُس کے حبیبؐ کا صدقہ جانیں۔

۲۔ فقیر سے بات کرنی بہت مشکل ہے۔ وہ حکمت و فراست سے ایسی بات کہہ دیتا ہے کہ سب لاجواب ہو جاتے ہیں۔

۳۔ کوئی چیز خیرِ محض نہیں۔ البتہ خیرِ غالب کہہ سکتے ہیں۔ خیرِ محض اللہ کی ذات ہے۔

۴۔ رشک محبوب ہے۔ حسد مذموم ہے۔ رشک کے معنی یہ ہیں کہ ہم

فصل پنجم

قول طیب

دوسروں کی طرح اچھے ہو جائیں۔ حسد کے معنی یہ کہ دوسرے ہم جیسے بدتر ہو جائیں۔

۵۔ جو چیز حکمت کے تحت اسباب کے پیچوں کے ساتھ آتی ہے۔ اس کو رد کرنا ہو تو اسماء کے ساتھ لپیٹ کر الٹے پیچ آہستہ آہستہ کھولنے پڑتے ہیں۔ عجلت نہیں کر سکتے۔

۶۔ وقت پر علاج وغیرہ کے لئے جو قرآنی اعتبار نسبت کے لحاظ سے قلب میں آئے وہی مفید ہوتا ہے۔

۷۔ اولیاء اللہ کی شان میں بے ادبی کے بعد قلب میں کوئی معارف نہیں اُتر سکتے خواہ سر ہی کیوں نہ پٹک لیں۔

۸۔ وہ فقیر ہی کیا جس میں اِستغنا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فقیر کی غیرت کو ضائع نہیں کرتا جب وہ منشائے الٰہی کے تحت کسی پہ بار نہ ڈال کر تکلیف میں بیٹھ جاتا ہے تو غیب سے کشود کار ہوتا ہے۔

۹۔ تجربوں اور استدلال کے بعد جو علم ملتا ہے وہ فیضان نہیں۔ فیضان یہ ہے کہ صحیح اعتبار بلا تکلّف قلب میں آ جائے۔

۱۰۔ بڑی سے بڑی مصیبت آئے تو فکر کی بات نہیں۔ اپنے کام جاری رکھو اللہ کی مدد پر بھروسہ رکھو۔ ورنہ ایمان کے ساتھ اعصاب بھی برباد ہو جائیں گے۔

۱۱۔ سعی اور قابلیت بھی نعمت ہے لیکن اپنی ذات کی طرف خیال نہ کیا جائے۔

۱۲۔ مقامِ قرب میں تعریف اور شہرت کی خواہش بدترین چیز ہے۔

۱۳۔ فطرۃُ اللہ اور قانونِ فطرت ایک ہی بات ہے۔ اجمال تفصیل کا فرق ہے۔

۱۴۔ ایک دفعہ کی رفعِ حاجت میں اللہ کے فضل کا جو ظہور ہے اس کا شکرانہ تمام عمر کی طاعت گذاری اور عبادات سے نہیں ہو سکتا۔

۱۵۔ ایک عارف کی تدفین کے موقع پر دوسرے عارف نے کہا۔ یہ تو مدینہ کی خاک پر لوٹتا ہوا فقیر ہے۔

۱۶۔ عمل میں اخلاص، بے نفسی ہو تو اللہ کی طرف سے حفاظت یقینی ہے۔

۱۷۔ مخلصین کی جماعت ہمیشہ غیب سے بنتی ہے، بنائی نہیں جاتی۔ نظم قائم ہوتا ہے۔ قائم نہیں کیا جاتا۔

۱۸۔ اللہ کو سب کچھ معلوم رہنے کے باوجود اس سے دعا کرنا ربط کا اقتضا ہے عبدیت ہے۔

۱۹۔ نفسانیت، کیے کام کو للّٰہیت و خلوص سے تعبیر کرنا ایسی بڑی گستاخی ہے جس پر سخت مار پڑتی ہے۔ نفسانیت کے کام پر گناہ کا اقرار ہو بات تو۔

۲۰۔ اگر غوث اقطاب کی ساری عمر کی حضوری کی عبادتیں ملائی جائیں تو رسول کریم صلعم کے ایک گھونٹ پانی پینے کی نیکی کے برابر نہیں۔

۲۱۔ عارفین خطرہ (خیال) کے مقام پر اللہ کو وکیل بناتے ہیں۔ رُبوبیت سے خطرہ کے ذریعہ ربط پیدا ہوتا ہے۔

۲۲۔ اصول یہ ہو کہ کسی بڑے سے بڑے شخص کو اندرونی دل سے بُرا نہ جانیں۔ سزا بھی دیں تو اس کے معاملہ کی شدّت دل کے اندرونی پردہ میں نہ رہے۔

۲۳۔ انکسار وہ کرے جو بڑا ہو کر اپنے کو چھوٹا سمجھے۔ یہاں کچھ ہیں ہی نہیں۔ یعنی عدمِ محض ہیں تو یہ بے معنی لفظ اپنے لئے کیسے استعمال کریں۔

۲۴۔ ہر وقت شر تیار ہے۔ لیکن فضلِ الٰہی خیر بھیج رہا ہے۔ شر کے امکان کی وُسعت خدا کی پناہ۔

۲۵۔ بے نفس بندہ کو معصیت میں وہ لطف آتا ہے جو نفسانیت والے کو نعمت میں نصیب نہیں ہوتا تو پھر بے نفس بندہ کی نعمت کا کیا عالم ہو گا

۲۶۔ ظالم رہنے سے مظلوم رہنا بہتر ہے۔ اللہ کی حمایت مظلوم کے ساتھ ہے۔ ہمیشہ مدافعت پر رہیں۔ حملہ کرنے والا ہمیشہ خطرہ میں رہتا ہے۔

۲۷۔ کسی کی پریشانی کے علم کے بعد اس کی مدد لازم ہو جاتی ہے۔ زیادہ تحقیق مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی حال و علم کو قبول فرماتا ہے۔

۲۸۔ اکثر اس راز سے بے خبر ہیں کہ ایمان پر ٹھہرنے ہی سے توحید کھل جاتی ہے۔ لیکن ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ توحید کھلی۔

۲۹۔ خواب میں گُہر دیکھیں تو حدیث شریف کے لحاظ سے گُہر سے قُرب اور ذات کی تجلّی مراد ہے۔

۳۰۔ بندہ کسی کام کو شروع کر کے اعلان کرے اور دوسرے لوگ اس پر ہنسیں تو اللہ کو بندہ پر غیرت آتی ہے۔ اور وہ کام مکمل ہو جاتا ہے۔

۳۱۔ دل میں کسی کے متعلق اچھا یا بُرا جو خطرہ آئے گا وہ مخلوق کے دلوں پر اپنا اثر ضرور دکھائے گا۔

۳۲۔ جو شخص کھانے کی بُرائی کرے وہ ہمیشہ مُفلس رہے گا۔ سب کچھ رکھ کر محروم رہے گا۔

۳۳۔ ہمیشہ اچھی مثال دینی چاہیئے۔ بری چیز کی تمثیل دے کر کسی کا دل نہ دکھائیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ آپ کے بچہ کی عمر کا ہی ہمارا بچہ مرا۔ یہ بد مذاقی ہے۔

۳۴۔ سب سے بڑی عقل مندی یہ ہے کہ ہم اپنی بے وقوفیاں کُھلا چُھپیں

۳۵۔ ناشکری برکت کی دشمن ہے۔ دوسری دشمن نسبت کی خرابی ہے اس لئے اچھی نسبت کے ساتھ شکر میں لگے رہیں۔

۳۶۔ جب انتہائی کوشش و دعا کے بعد کامیابی کے آثار پیدا ہو ہو کر کوئی

چیز نہ ملے تو اس میں بڑی حکمت ہوتی ہے۔ خیر ہوتا ہے۔ اس کو رسمًا خیر نہ سمجھیں بلکہ قلبًا راضی رہیں۔ مقصود حاصل ہوگا۔

۳۷۔ بے اُصولی میں نفسانیت و حیرانی ہے اور اصول میں سکون و سکینت ہے اصول کے تحت رہیں تو اللہ کو غیرت آتی ہے اور مدد فرماتا ہے۔

۳۸۔ چھوٹے گناہ کو بھی معمولی نہ سمجھو۔ بعض دفعہ ایک دیا سلائی پورے گھر کو بلکہ ایک شہر کو خاکستر کر دیتی ہے۔

۳۹۔ جس دل میں ایمان ہے اُس میں اطمینان ہے۔ جس میں اطمینان ہے اُس میں قوت ہے۔ جس میں قوت ہے وہ مشکلات پر غالب آتا ہے۔ یاد رکھو۔ معرکوں میں دراصل دل لڑتے ہیں نہ کہ اعضاء و جوارح، ساز و سامان

۴۰۔ کسی ولی سے استفاضہ مقصود ہو تو صفر درجہ پر رہیں۔ قلب کو صاف تختی بنالیں تو ملاقات مفید ہوگی۔

۴۱۔ ضیافت یا کسی تقریب میں زینت و آرائش کرنا اقتضائے مسرت و محبت ہے۔

۴۲۔ ہر چیز جتنی فطرت سے قریب ہوگی مفید ہوگی۔ اور جس قدر فطرت سے دور ہوگی فائدہ سے دور۔

۴۳۔ لطافت میں قوت ہے۔ جو چیز جتنی لطیف ہوگی قوی ہوگی۔ مثلاً مٹی سے زیادہ قوت پانی میں ہے۔ اور اسی نسبت سے ہوا۔ آگ۔ نور وغیرہ میں۔ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ۔ (۱۲/۵)

۴۸۔ نفسیاتی نکتے

۱۔ قانونِ فطرت ہے۔ اعتماد کرو تو دوسرا اعتماد کریگا۔ ورنہ وہ بھی بے اعتمادی کریگا۔

۲۔ علاج میں نفسیات و اعصاب کام کرتے ہیں۔ اعصاب کا اندرونی

حصہ نفسیات ہے اور وہی سب کچھ ہے۔

۳۔ تعلیم و تلقین میں حکم دینا اصول کے خلاف ہے۔ البتہ اشارے کئے جائیں کہ وہ مؤثر ہوتے ہیں۔ کوئی چاہے تو اختیار کرے۔

۴۔ سزا اتنی موثر نہیں جتنا کہ سزا کا خوف۔ خوبی اور سمجھ سے خوف کو برقرار رکھنا کمال ہے۔

۵۔ ڈسپلن کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے ذمہ داری محسوس کرتا ہے اور پوری کرتا ہے۔ لہٰذا اعتماد کریں اور کنٹرول کریں۔

۶۔ نصیحت کا قاعدہ یہ ہے کہ غیر شعوری حالت میں بات پہنچا دی جائے علم و شعور کو بیدار کرکے سمجھانا زیادہ موثر نہیں ہوتا۔

۷۔ قوتِ مردمی جتنی زیادہ ہوگی اتنا زیادہ کنٹرول ہوگا۔ کنٹرول کا نہ ہونا کمزوری کی علامت ہے۔ انتہائی جوش بلکہ خواب میں رُکنا کمال ہے۔

۸۔ اپنی طرف سے چھیڑ شروع نہ کرو۔ لیکن اگر کوئی چھیڑ شروع کرے تو اخیر تک پورا مزا چکھاؤ۔

۹۔ کسی کو مشورہ دینے میں شدّت و اصرار سے کام نہ لیں۔ صرف اشارے کریں تو کامیابی ہوگی۔

۱۰۔ اصول یہ ہو کہ ہر ایک کا بیان سنے۔ تعارض نہ کرے۔ اور جب تک ضرورت نہ ہو اختلاف کا اظہار نہ کرے۔ ہر ایک کو اختلاف کا حق دے

۱۱۔ اکثر بے جا مروّت میں نفاق ہوتا ہے۔ کیونکہ دل راضی نہیں رہتا۔

۱۲۔ ماننا اور ہے، احساس اور ہے کسی کو قائل کرسکتے ہیں۔ لیکن احساس بدلنا اور چیز ہے۔

۱۳۔ انسانی نفسیات یہ ہے کہ کبھی پیار سے بے زار اور کبھی دھتکار پر نثار

۱۴۔ ہر فن میں اس کے اصول (روح) کو معلوم کریں۔ اس کے بعد سینکڑوں شکلیں خود بنا سکیں گے۔

۱۵۔ مداخل سے پہلے مخارج کو سوچنے والا عقلمند ہوتا ہے۔

۱۶۔ مذاق میں بھی تعلّی نہ کرے اور نہ کسی کو حقیر سمجھے ورنہ سخت نقصان ہوگا

۱۷۔ ہمارا عمل قوتِ ارادی، طبیعت اور دماغ کے اثر کے تحت وقوع میں آتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ علم سے عمل پیدا ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی عمل کرنا چاہے تو علم مؤیّد ہوتا ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

فصلِ ششم

ارکانِ اسلام۔ صفاتِ ایمان

۱۔ اسلام ہی دنیا کا حل

فرمایا۔ دنیا کی تاریخ میں اسلام سے بڑھکر کسی تحریک نے انقلاب نہیں کیا۔ اس کی برکت سے دیگر ادیان شرک سے گھبرا رہے ہیں۔ انکار کر رہے ہیں۔ تاویل کر رہے ہیں۔ ع

کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو۔ فطرت پر رہیں تو اسلام کی طرف آنا لازمی ہے۔ دوسرے ادیان، اسلام پر طعن کرتے تھے۔ اب بخوشی اسلام کے مختلف احکام روز بروز اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ پھر بھی بہت سے ممنونیت کا اظہار نہیں کرتے۔ مثلاً غیر قوموں کو اسلام کے احکام عقدِ بیوگان، خلع، طلاق، وِراثت، حُرمتِ سود وغیرہ پر اعتراض تھا۔ لیکن اب بعد از خرابیٔ بسیار، اسلام کے مطابق قوانین بنا رہے ہیں۔ چار شادیوں کے جواز پر اعتراض تھا۔ نتیجہ یہ کہ یورپ وغیرہ میں اتنی آوارگی پھیلی اور پھیل رہی ہے کہ صرف ظاہر میں ایک کی پابندی ہے، بہت سے تو شادی ہی نہیں کرتے۔ آوارگی میں کوئی گنتی مقرر نہیں ہے اور نہ حقوق و فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ حیوانیت کے مظاہرے ہیں۔

فطرت (اسلام) کہتی ہے کہ لڑائی کے موقع پر مدافعت کرو۔ مقابلہ کرو۔

انتقام لو یا معاف کرو۔ فطرت اس سے اِبا کرتی ہے اور دنیا میں کسی قوم کا اس پر عمل نہیں کہ کوئی ایک گلہ پر طمانچہ مارے تو خاموش رہے اور دوسرا گلا بھی پیش کرے۔ اس لئے تمام غیر مسلم منصف مزاج محققین اس وقت کہہ رہے ہیں کہ دنیا میں اسلام ہی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل ہے۔ لہٰذا اگر دنیا کو ہر قسم کی تباہی سے بچانا مقصود ہو تو اسلام کی طرف آنا لازمی ہے۔

۲۔ اسلام کے ارکان

اسلام ایک نظام ہے۔ انسان اس نظام کی جان ہے۔ وہ مقصدِ کائنات ہے قرآن و رسالت سے فیض حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایمان ہے۔ بعض مذاہب سے وابستگی کے لئے کوئی حد و معیار مقرر نہیں۔ لیکن اسلام کے حدود واضح مُعیّن ہیں۔ قرآن کی رُو سے اسلام کے پانچ ارکان ہیں۔ کلمۂ طیبہ یعنی توحید و رسالت کا اقرار۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج۔ ایمان کے صفات یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ۔ اس کے رسولوں۔ کتبِ سماوی۔ ملائکہ۔ تقدیرِ خیر و شر۔ اور حیات بعد الموت (حشر و نشر) پر ایمان لانا۔ ان کی تفصیلات پر ہم مکلف نہیں۔ کیا قرآن سب پر منکشف ہوا؟ کسی پر کچھ آیتیں کھلیں تو کسی پر کچھ۔ ہر معاملہ میں یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ، رسولؐ کا جو علم ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اس ایمان پر مومنین کو رَاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ (۳:۷) یعنی علم میں پکے کی قرآنی سند ملتی ہے۔ اس کے بعد ایمان کے مقابل میں کسی کی پروا نہ کریں اور نہ اُسے دماغی لحاظ سے سمجھانے کی کوشش کریں۔ ہم داروغہ نہیں۔ اگر ہم ایمان پر جمیں تو فراستِ ایمانی عطا ہوتی ہے جو ان معترضین کے مقابل تعلیم و تبلیغ میں کام آتی ہے۔ ایمان و ادب ہدایت کی جان ہیں۔ اور تقویٰ کے بعد اللہ خود معلم بن جاتا ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (۲:۲۸۲)

انبیاء اور اولیاء اللہ سے محبت ہی کا نام دین ہے۔ دین کا مقصد اہلُ اللہ کی محبت پیدا کرنا ہے اور بس۔ جب محبت پیدا ہو تو ضمناً تمام محاسنِ اسلام حاصل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ | دائماً مسرور رہنا ناممکن ہے۔ دائمی مسرت کا خیال محض فلسفہ ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ کا مطلب لوگوں نے غلط سمجھا۔ انبیاء اولیاء پر غم کی تجلیاں رہیں تو عمریں تڑپ میں گذار دیں مثلاً حضرت یعقوبؑ، حضرت ایوبؑ۔ نعمت کی جدائی پر رنج فطری ہے۔ خود حضور صلعم حضرت ابراہیمؓ کے وصال پر آبدیدہ ہو گئے۔ ہر محل کا اقتضا جدا ہے۔ تجلیاں جمال کی بھی ہو رہی ہیں اور جلال کی بھی۔ مہر کی بھی اور قہر کی بھی۔ تو ہر وقت خوشی کیسے ممکن ہے۔ اسکے معنی تو یہ ہونگے کہ فسق و فجور، کفر و الحاد، بلکہ بیماری، موت پر بھی شکر ہو۔ مسرت ہو جو جہل محض ہے۔ اگر کوئی موت یا مصیبت پر شکر کرے تو دعوئ استقامت ہے جو شرک ہے۔ ایسے موقعوں پر اولیاء اللہ نے جو شکر ادا کیا ہے۔ وہ صبر و استقامت اور توبہ کی توفیق و عطا پر تھا جس پر الحمد للہ کہا۔ نعمتوں پر شکر و مسرت اور الحمد للہ تو ہونا ہی ہے۔ اس کی تمیز ضروری ہے مصیبت میں عروج سکنڈوں میں ہوتا ہے اور نعمتوں میں عروج برسوں میں ہوتا ہے۔ شکر کا سلوک مشکل ہے۔ صبر کا سلوک نسبتاً آسان ہے۔ ایک صاحب نے کہا، ہم الحمد للہ کہتے ہیں۔ ہر نعمت کو اللہ کی جانتے ہیں۔ فرمایا۔ آپ کو اس کی ہوا نہیں لگی۔ بزرگوں سے یہ الفاظ سن لئے ہیں۔ سمجھے نہیں اور نہ یہ آپ کا حال ہے۔

۴۔ بہترین حال و ترقی | ایک تو محض اعتقاد ہوتا ہے کہ ہم کو اللہ نے

جس حال میں رکھا وہ بہترین حال ہے یہ بھی درست ہے۔ لیکن مجھے تو یہ دکھایا، بتایا، سمجھایا جاتا ہے کہ تم بہترین حال میں ہو۔ حتیٰ کہ بعض موقعوں پر کسی ترقی کا نہ ملنا خود خیر بتایا جاتا ہے

یاد رکھو! اس عالم میں تدبیر کو اتنا ہی دخل ہے جتنا کھانے میں نمک کو۔ اتنے میں سکون اور امن ہے۔ اس سے زیادہ کا نتیجہ حیرانی، پریشانی ہے۔ جو مقدر ہے وہ ہو کر رہیگا۔ تجربہ کریں تو زیادہ تدبیروں کا نتیجہ بے شمار رکاوٹیں، حیرانیاں ہی ہوتا ہے۔ ہم سے بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ کوشش و تدبیر کرتے تو اپنی صلاحیتوں کے مدنظر کیا کچھ نہ بن جاتے۔ وہ ترقی کا لفظ جانتے ہیں۔ لیکن اس کے لوازم نہیں جانتے۔ ان لوگوں کی ترقی کے لوازم سے یہ ہے کہ وہ کسی تعیّنِ باطلہ کے بندے بن جائیں اور ترقی حاصل کریں۔ ان کے نزدیک اس کے بغیر ترقی متصوّر نہیں۔ اور ہم اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔ اصل ترقی دولت میں نہیں، بلکہ عبدیتِ الٰہی میں ہے۔ اور عبد کے استغنا، غیرتِ دینی، حق گوئی اور خودداری میں ہے کہ اپنی احتیاجی نسبت اللہ کے سوا کسی سے وابستہ نہ ہو۔ اور یہ اوصاف اِن معبودانِ باطل کی عبدیت میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

۵۔ دعا کے لوازم | ارشاد ہے اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ (۲۷) مصیبت کی دوری کے لئے اضطرار و بے چینی، دعا، دوا، سعی لازمی ہیں۔ ان میں کسر ہو تو دعا کی قبولیت رک جاتی ہے۔ دعا کے معنی یہ ہیں کہ اسباب و علل و حکم سے نظر ہٹا کر، قبولیت کی پوری امید کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی شانِ اقتدار پر نظر جما کر دعا کریں۔ ورنہ مادی نقطۂ نظر ہوگا۔ جس میں قوت نہیں۔ صرف فضل پر بھروسہ رہے۔ جب بندہ اضطرار میں دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ غیب

سے کسی مقبول بندے کی شکل میں مدد کا انتظام فرماتا ہے۔ دعا کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں نفس کی شکستگی ہوتی ہے۔ اِنفعال ہوتا ہے۔ گناہوں سے توبہ ہوتی ہے۔ عدمِ اِصرار اور عدمِ تکرار کا وعدہ ہوتا ہے۔ اِسی شکستگی کو اللہ پسند فرماتا ہے۔ دعا قبول ہوتی ہے۔ اور تائب محبوب ہوجاتا ہے۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (۲)

مصیبتوں میں پریشان ہوکر کبھی یہ نہ سمجھیں کہ اللہ نہیں سُنتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ (۱۳) اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ (۱۲) یعنے میرا رب دعا کو ضرور سنتا ہے وہ قریب ہے۔ قبول بھی کرتا ہے۔ البتہ جو چیز مضر اور نامناسب ہو ہمیں نہیں دیتا۔ ایک اور راز یہ ہے کہ کہیں ہمارے فسق و فجور کی وجہ سے یہ مصیبتیں نہ آرہی ہوں۔ اِس کے لئے پڑھتے ہیں۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا الخ (۳)

۶- دعا کا راز

ذکر اللہ کے بعد دعا کا بھی بڑا مقام ہے۔ تمام انبیاء و مرسلین نے دعائیں مانگی ہیں۔ وجہ یہ کہ عبدیت و مربوبیت کا یہ خاص اقتضا ہے کہ بندہ مالک سے مدد مانگے۔ محتاج غنی سے طالبِ امداد ہو۔ دعا نہ مانگو تو یہ ربط مُستتر رہ جائے۔ چنانچہ قرآنِ کریم دعاؤں سے بھرا ہوا ہے اور دعا کی تاکید ہے۔ قبولِ دعا کا وعدہ ہے۔ البتہ دعا کی طرح دعا مانگے۔ دعا جو دل سے نکلتی ہے اکثر قبول ہوتی ہے۔ اگر کبھی قبول نہ ہو یا تاخیر سے قبول ہو تو بددل نہ ہونا چاہیئے۔ ہماری جہالت کی مضرت سے ہم کو محفوظ رکھنا قبولِ دعا کی یہ بھی ایک شان ہے۔

یہ عالم جلال و جمال کی تجلیوں سے بھرا ہوا ہے۔ آج کل جلال کا زور ہے۔

امر کے تحت خوب دعا کریں۔ اور امیدوار رہیں۔ ہمارا فرض ڈیوٹی انجام دینا ہے۔ نتیجہ کے ہم پابند نہ ذمہ دار۔ یہ بات کہنے میں آسان ہے لیکن سب میں چور رہتا ہے۔ اور ہر شخص دعا کے بعد لازم سمجھتا ہے کہ اس کی دعا سے ایسا ہونا چاہیئے تھا۔ یہی غلط اعتبار ہے۔ اپنا فرض کامل سپردگی ہے جس کے بعد نتیجہ سے بے فکر رہیں۔ لیکن ایک محل تحتِ امر ناز کا ہوتا ہے جہاں اَڑ جائیں تو کامیابی ہوتی ہے۔ اس کے لئے مزاج شناسی اور تمیز کی ضرورت ہے۔

۷- دعا کا طریق

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے کہ ہر چیز کا مالک و متصرف اللہ ہے، بندہ نہیں۔ ہماری دعا عام ہو۔ اگر کوئی چیز خصوصیت سے مطلوب ہو تو بہت احتیاط سے بقدرِ ضرورت عرض کرے۔ اضطرار کی بات اور ہے کہ وہ وقتی چیز ہے۔ جس کو دوام نہیں۔ اضطراری دعا قلبی تقاضوں کے تابع ہے اور بہت مقبول ہوتی ہے۔ کبھی مُطالبہ یا حکم نہ کریں کہ یہ دعا قبول کیجیئے اور اس میں خیر کیجئے۔ بلکہ یہ کہیں۔ اگر یہ میرے حق میں خیر ہو تو عطا فرمائے۔ یہ ہرگز نہ کہیں کہ خیر کر کے دیجئے یہ تو حکم کرنا ہے جو بے ادبی ہے۔ مار پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ

عملیات میں دعا کے جو بِٹ پڑھے جاتے ہیں وہ نیچے مرتبے کی چیزیں ہیں بلند مقامات پر بہت احتیاط لازم ہے۔ بعض وقت منشاءِ الٰہی کے خلاف دعا ہو تو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ دعا کر کے مطلوبات و آثار کے ظہور پر اصرار کرنا بے ادبی ہے۔ اگر دروازہ بند ہو تو صرف دستک دے نہ کہ باہر نکلنے پر اصرار کرے ورنہ ملاقات سے روک دیا جائے گا۔ عام بات کہنا الگ ہے خصوصیت چاہنا الگ ہے۔ بعض دفعہ مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کو ایذا پہنچانے، اُن سے گستاخی کرنے، یا کسی پر مظالم توڑنے کی پاداش میں کسی کو مصائب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ ایسا شخص

اگر تائب نہ ہو جائے تو اُس کے لئے دعا کرنا منشائے الٰہی کے خلاف ہوتا ہے۔
ایسی صورتوں میں اپنے تعلقات کی بناء پر رفعِ مصائب کی دعا کی جائے تو اندیشہ رہتا ہے کہ اُس شخص کی مصیبت دعا کنندہ کے حصہ میں ڈال دی جائے۔ لہٰذا ہر کسی کی فرمائشیں دعا پر ہرگز دعا کا وعدہ نہ کرے۔ اور نہ دعا کرے۔ بلکہ دیکھے حالات کیا ہیں۔ حالات کے لحاظ سے منشائے الٰہی کیا ہے اُس کے مطابق عمل کرے۔

۸ - دعا کی لہر

بالعموم دعا کا منشا حصولِ مقصد ہے۔ لیکن جب بندگی کا ذوق نکھرتا ہے تو دعا خود بھی مقصود ہو جاتی ہے گویا ؎

خدا اور بندے میں رشتہ دعا ہے دعا جس کو کہتے ہیں خود مدعا ہے

صراط الحمید جلد دوم ص ۲۸۸ پر حضرت فرماتے ہیں۔

"مزید برآں دعا کی ایک لہر آتی ہے۔ یہ کچھ عجب ذوق ہے عجب کیفیت ہے۔ ایک وقت ادراک ہوتا ہے کہ دعا کی کشتی میں مقبولیت کے بادبان لگے ہوئے ہیں اور رحمت کی ہوا اُسے اڑائے لئے جا رہی ہے۔ ایک وقت ہے کہ ہوا کم ہے۔ لیکن ہمت اور توجہ کے پتوار کشتی کو کھے رہے ہیں۔ کشتی آگے بڑھ رہی ہے۔ لیکن کوشش کے ساتھ۔ اور بعض وقت صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہوا ناموافق ہے۔ ہزار پتوار مارے کشتی انچ بھر آگے نہیں بڑھتی۔ بلکہ پلٹا چاہتی ہے۔ ڈوب جائے تو عجب نہیں۔ ایسے نازک وقت کشتی اتارنا بڑی غلطی ہے موقع پہچاننا لازم ہے۔ اور بڑا فضل اُس وقت ہے کہ جو دعائیں کبھی وہم و گمان میں بھی نہ گذری ہوں وہ بے تکلف دل میں اتریں۔ زبان پر آئیں۔ اور مقبولیت کی خنکی سے دل باغ باغ ہو جائے۔ لیکن جب کہ سوچی سمجھی دعائیں ہوا ہو جائیں۔ یہ تعلق بھی دل میں جگہ نہ پائیں۔ محض برائے گفتن زبان پر آئیں۔ ایسی

نامقبولیت سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ اس کوچے میں عجب عجب احوال گذرتے ہیں۔

ع ۔ عاقل را اشارہ کافیست

۹ - استغفار کی اہمیت

ایک مسلم لیڈر نے طوفانِ باد میں جلسہ کے تمام خیموں کے اڑ جانے کا ذکر کیا تو حضورِ انور فرمایا۔ آپ نے اس موقع پر اسلامی اسپرٹ دکھائی یا فرنگی ذہنیت۔ حضورِ انور تو طوفانِ باد و باراں کے موقع پر استغفار فرماتے تھے اور حضرت عمرؓ جوتی کا تسمہ ٹوٹنے پر توبہ استغفار فرماتے۔ لیکن معلوم ہوا آپ لوگوں نے توبہ و رجوع الی اللہ کے بجائے غیر اسلامی طریق پر کہدیا پرواہ نہیں۔ ہم مستقل مزاجی دکھائیں گے اور طوفان کا مقابلہ کریں گے۔

سورۂ نوحؑ میں تمام آفات و بلیات سے بچنے کے لئے اور ہر مقصد کے حصول کے لئے استغفار ہی علاج بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ۔ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۔ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۔ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا (۲۹/۹) یعنے استغفار کی برکت سے اللہ تعالیٰ رحمت و مغفرت، بارانِ رحمت، مال و منال، آل و اولاد، باغات و انہار عطا فرمائے گا۔ بے روزگاری دور ہو جائے گی۔ غفور و غفار کے معنے صرف گناہ بخشنے والا نہیں۔ بلکہ یہ اتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ مغفرت کے معنی نہ صرف معافی گناہ بلکہ دفعِ سیئات و رفعِ درجات ہیں۔

۱۰ - فرض کی اہمیت اور وظیفے

فرمایا۔ کتاب "قادیانی مذہب" میں نے رمضان شریف میں لکھی۔ اس کام میں اتنا شغف رہا کہ نہ تلاوت کا موقع ملتا، نہ تراویح کا، نہ تہجد کا۔ تینوں

غائب تھیں۔ صرف ایک دُھن خدمتِ دین کی تھی۔ وقت پر نماز اور اپنا کام تالیف کا۔ تعمیلِ فرائض میں اوّلیت و تقدیم کا لحاظ لازمی ہے۔ بعض لوگ اپنے روزانہ کے وظائف چھوٹنے پر افسوس کرتے ہیں۔ مجھے اپنے اوراد و وظائف کے چھوٹنے پر تکلیف نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (۲۹/۱۳) کی گویا اتباع ہے۔ جب اس سے فرصت پا جائیں تو پھر وَ تَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (۲۹/۱۳) ہے ورنہ اُمت کی خدمت کا فرض، منصبِ رسالت کی اتباع (یعنی حقوق العباد) متاثر ہوتے ہیں جو سرکاری کام ہے۔ وَ تَبَتَّلْ شخصی چیز ہے۔

قربِ فرائض سے متعلق بخاری و مسلم کی حدیث یہ ہے کہ میرا بندہ کسی ایسے ذریعہ سے قرب حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ادائے فرض سے زیادہ محبوب ہو۔

۱۱۔ حضرت عمرؓ کی نماز

ناچیز نے عرض کیا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ میں نماز میں سارے امورِ مملکت طے کرتا ہوں۔ کیا اس سے حضوریٔ قلب میں فرق نہیں آتا۔ کیا فہمِ کلماتِ قرآنی لازمی نہیں۔ فرمایا۔ متوجہ اِلَی اللہ ہونے کے بعد، رحمٰن اور ربّ العالمین سے کونسی چیز ہٹ سکتی ہے۔ اس توجہ خاص کے بعد جو تفصیلات معلوم ہونے لگیں گی وہ صراطِ مستقیم کے تابع ہونگی اور غلط راہ نہ ہوگی۔ اس کے بعد وہ چاہیں تو مملکت کے اسرار سمجھا دیں۔ یا قرآن کے اصولی اجمالی علم کے بجائے تفصیلی علم کھول دیں جو حق اور مقصود ہوگا۔ جب ہم ربّ العالمین، رحمٰن، رحیم کی طرف متوجہ ہوں تو اب وہ جو چیز بھی دیں گے عالمین ہی اور رب رحمٰن کی تجلیوں سے ہٹ کر نہ ہوگی اس لئے وہ توجہ اِلَی اللہ میں مانع نہ ہوگی۔

۱۲۔ اِستخارہ

ایک موقع پر استخارہ کا ذکر آیا تو فرمایا۔ اِستخارہ کے لئے خالی الذہن رہ کر اللہ سے عرض کریں تو خود بخود کشودِ کار ہو جاتا ہے۔ اور فضل سے کام کی بات سوجھتی ہے۔ یہی اپنا استخارہ ہے۔

مجھے تو حضرت فاروقِ اعظمؓ کی نماز والا استخارہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ امورِ سلطنت وغیرہ کے متعلق تمام علم نماز میں مل جاتا تھا۔ نماز دراصل اللہ تعالیٰ سے سرگوشی ہے۔ مجھے بھی نماز میں مختلف خطرات آجاتے ہیں کہ فلاں چیز فلاں جگہ لکھو، یا یہ کرو۔ لیکن جو لوگ حضرت عمرؓ کے خطراتِ نماز کو اپنی نماز کے وساوس پہ قیاس کرتے ہیں ان کو حضرت عمرؓ کی نماز کی ہوا نہیں لگی

۱۳۔ نمازِ اور تصوّرِ رسولؐ

ایک سوال پر کہ نماز میں رسول اللہ کا تصوّر ہونا چاہیئے یا نہیں۔ فرمایا۔ نماز میں حق تعالیٰ کی تجلیات پر نظر رہے ورنہ متجلّی (حق تعالیٰ) سے کیسے ربط پیدا ہوگا۔ علمِ صحیح کے مطابق جو کرو درست ہے۔ عرش سے فرش تک رسول اللہؐ ہیں کہ آپ تجلّیِ اعظم ہیں۔ رحمۃٌ للعالمین ہیں۔ عرش سے فرش تک رحمت ہی کا ظہور ہے۔ اَلتَّحِيَّاتُ، واجباتِ نماز میں ہے۔ جس میں اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ شریک ہے۔ حضورؐ کے تصوّر کے بغیر آپ پر سلام کیسے ممکن ہے

۱۴۔ مسئلۂ امامت

ہمارے پاس امامت کا مسئلہ ایسا نہیں جیسا کہ شیعہ صاحبان کے نزدیک ہے کہ امام معصوم ہو اور وہی نماز پڑھائے اور وہی دعا پڑھے۔ ہمارے پاس کسی شخص کو بھی امام بنایا جاسکتا ہے جس پر جماعت کا اتفاق ہو۔ اُسی امام کی دعا مقبول ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ مقتدیوں میں سے بھی کسی کی مقبولیت کی وجہ سے وہ دعا قبول ہوسکتی ہے۔

تحدید نہیں ہے۔

۱۵۔ بعض سونے والے شب بیداروں سے بہتر

حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ نے لکھا ہے۔ نفل روزوں کے بہت ثمرات و ثواب ہیں۔ لیکن ایک فقیرانہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ بہت سے کھانے پینے والے روزہ داروں سے بہتر ہیں۔ راتوں میں عبادت کرنے کے بڑے اجر ہیں لیکن بہت سے سونے والے رات کے عبادت گذار بندوں سے زیادہ اعلیٰ مرتبے اور ثواب پا جاتے ہیں۔ ہر چیز اپنے محل پر اہم ہے۔ اللہ کا فضل ہے۔ جسے چاہے دیدے۔ کیا معلوم کون کس امر کے تحت کھاتا ہے، سوتا ہے۔ مثال میں فرمایا، ایک تنگ خیال، ظاہری معیار رکھنے والے مولوی صاحب حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کی خوبیاں سنکر مرید ہونے کے لئے آئے۔ دیکھا کہ حضرت دنیوی شوکت، آرام و اسباب اور دستر خوان کی وسعت کے لحاظ سے بادشاہ کو مات کر رہے ہیں۔ آپ کے ملازمین کا لباس شاہی ملازمین سے بہتر تھا۔ حضرت نے رات اُن کو اپنے پلنگ کے قریب سونے کو فرمایا۔ دن کا تو وہ حال دیکھا تھا۔ رات میں دیکھا کہ حضرت خوبصورت پلنگ پر سیج پر آرام فرما ہوئے۔ مولوی صاحب رات کو عبادت میں مصروف ہوئے اور دل میں خیال کیا۔ اچھے مرشد ہیں، رات میں عبادت نہیں۔ دن میں دستر خوان اور قوالی سے فرصت نہیں۔ مولوی صاحب عبادت سے تھک کر ذرا لیٹے تو دیکھا کہ حضرت کے پلنگ سے عرش تک نور کا ایک ستون کھڑا ہے، ہزاروں فرشتے حضرت کو دیکھ کر نور کے ستون پر پروانہ وار قربان ہو رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی عبادات کے باوجود مثال میں اپنی حالت ایک ٹمٹماتے چراغ کی سی دیکھی۔ توبہ کی۔ صبح حضرت کے قدموں پر گر پڑے، معافی چاہی اور سارا حال بیان کر دیا۔

حضرت نے فرمایا۔ "ماں کو بچہ پر سوتے میں بہت پیار آتا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ عارفِ کامل کا سونا، جاگنا تحتِ امر ہوتا ہے۔ ہر بات پہ مدارج ہیں۔ سورہ مزمل میں حضورؐ کو پیار سے کہا گیا۔ اے نبی اتنا مت جاگو، سو جاؤ، دن میں تم کو بہت کام کرنا ہے۔

۱۶۔ رمضان کے روزے

بعض بچے اور بیمار روزہ کے معاملہ میں عزیمت پر عمل کرتے ہیں۔ رخصت (اجازت و رعایت) پر عمل نہیں کرتے۔ اسی روزہ کے بیان میں یُسر و عُسر کے احکام صاف ہیں۔ قانونِ صحت کی خلاف ورزی در اصل اللہ کی نافرمانی کے مرادف ہے۔ اگر روزہ کی وجہ سے سفر میں دقت ہو یا بیمار کا مرض بڑھنے کا احتمال ہو تو روزے ملتوی کرنے کا حکم ہے۔ کیونکہ اللہ ہمارے لئے آسانی چاہتا ہے تکلیف نہیں۔ منشائے الٰہی کے خلاف تکلیف جوئی، تکلیف پسندی نامناسب ہے۔ ایسا کرنے سے بعض شکلوں میں رہبانیت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ عزیمت کے بھی اجر ہیں۔ ناگزیر حالات میں تو جہاد میں جان تک پیش کرنی چاہیئے۔

۱۷۔ شبِ قدر

بعض کہتے ہیں۔ سب اوقات اللہ کے ہیں۔ سب برابر ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے اور بہت متبرک ہے۔ فرمایا۔ اگر ہم عقل سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات میں بھی خاص اوقات کو اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً موتی، مونگے، خاص زمانہ میں سمندر میں بنتے ہیں اور نکلتے ہیں۔ حالانکہ سمندر وہی، ہوا وہی، بارش وہی۔ اسی طرح خاص پھول خاص موسم ہی میں ہوتے ہیں اور رہتے ہیں۔ حیوانات کی پیدائش وغیرہ کا بھی یہی حال

ہے۔ بلبل اور دیگر پرندے صبح میں بولتے ہیں دوپہر میں خاموش۔ اسی طرح انسانوں میں بچپن کی کیفیت اور جوانی کی اور بڑھاپے کی اور۔ مذہب نے بتایا کہ ہر کام کا وقت اور محل اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً اگر وقت پر نماز نہ پڑھیں تو قضا کی نوبت آئے۔ مقامِ عرفات پر خاص وقت میں قیام نہ کریں تو حج نہ ہو، دو فرض کے عوض ہزاروں نفل ادا کریں تو اس کا بدل نہ ہو سکے۔ اللہ ہی نے بعض مہینوں اور وقتوں اور مقامات کو اہم بتایا۔ ان میں جو معروف و معلوم ہیں ان کی اتباع فرض ہے۔ اور اگر غیر معروف ہیں تو اختیاری ہے۔ البتہ کہانت و نجوم کی نحوست کو مومن علم صحیح سے دور کرتا ہے۔ نجوم کے آثار ہیں لیکن تارے مستقل بالذات اور مؤثر نہیں۔ اللہ مؤثرِ حقیقی ہے۔ تارے اللہ کے احکام کے تابع ہو کر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کی نحوست کو مومن حق کی قوت، اِن شاء اللہ اور ماشاء اللہ سے توڑ دیتا ہے اور متاثر نہیں ہوتا۔

قرآن نے شبِ قدر کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس رات میں قرآن اُترا۔ قرآن کیا ہے۔ علمِ الٰہی ہے۔ اور عقل سے بھی دیکھو تو عالم میں علم ہی قوت ہے۔ چاہے ظاہری علم ہو یا باطنی۔ ہزاروں بڑے بڑے پہلوان ہوں لیکن ایک دُبلا پتلا جوہری بم والا سائنس کے علم کی قوت سے سب کو ایک سکنڈ میں ڈھیر کر دیتا ہے۔ قرآن میں ظاہری و باطنی علوم ہیں۔ خیال کرو وہ رات کتنی مبارک اہم اور قوی ہوگی جس میں اتنی عظیم الشان قوتوں کا علم نازل ہوا۔ جب اس رات کی یہ اہمیت و قوت ہو تو قرآن کی اور قرآن لانے والے کی کیا عظمت و رفعت ہوگی۔ قیاس سے باہر ہے

۱۸۔ حج فرمایا۔ حج کو وہی جائے جس کا نقطۂ نظر اور اعتبارات یہیں درست ہو جائیں۔ ورنہ اُسے نقصان ہوگا۔ بے

سروسامانی اور ہلچل کا عادی ہو تو جائے۔ صحت اچھی ہو۔ کیونکہ سب ارکان قوت چاہتے ہیں۔ اس سفر میں عشق و محبت، اور موت کے اعتبارات میں غرق رہے۔ اِحرام کو کفن سمجھ کر باندھے۔ مردہ پن طاری رہے۔ صبر اور اس کی توفیق پر شکر ہو۔ کیونکہ وہاں صبر آزما واقعات پیش آتے ہیں۔ پہلے زیادہ تھے اب بھی کافی ہیں۔ وہاں نظم و صفائی کی اُمید بے سود ہے۔ لاکھوں کا ہجوم، گھنٹوں میں کیمپ لگنا، منٹوں میں اُکھڑنا ہوتا ہے، جن کا نقطۂ نظر درست نہ ہو۔ اُن پر رجعت پڑ جاتی ہے۔ ایمان تک خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ حج میں مرشد، مرید، باپ بیٹے تک کے تعلقات خراب ہوتے دیکھے ہیں۔ حتی الوسع غیروں اجنبیوں کے ساتھ سفر کرے تو بہتر ہے۔ جدید ذہنیت کے لوگ تو وہاں کے انتظامات کو وحشیوں کے عمل جانیں گے۔ اگر وہ وہاں لندن، پیرس کی طرح انتظامات دیکھنا چاہیں تو ناممکن ہے۔ حج کے بعد حاجی کے احوال و روابط میں انقباض نہ ہو تو یہ مقبولیتِ حج کی علامت ہے۔

حج اور عام سفر میں یہ اعتبار رہے کہ ہمارا کسی پر حق نہیں اور نہ حق مطلب ہے۔ اس میں عافیت رہتی ہے۔ ورنہ توقعات باندھنے سے رنجش، تلخی پیدا ہوتی ہے۔ بندہ کو نیک کام میں نیت و ارادہ کا ثواب مل جاتا ہے۔ اس کو بھی توفیق و فضل جانے، اس نیت و ارادے کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نیک کام کرا دے تو اس کا فضل ہے۔ یہ نہ کہے کہ ایسا کیوں ہوا، نہیں ہوا۔ ویسا کیوں نہیں ہوا۔ ایسا کہنا حق جتانا ہے۔ بندہ کو لا دعویٰ رہنا چاہیے۔ اِدّعا و طلب نہ ہو کیونکہ وجود ہی اپنا نہیں تو اس کے لوازم افعال وغیرہ کہاں سے آئیں گے۔ جیسا ربط رکھو ویسا معاملہ کیا جاتا ہے۔

۱۹۔ بیت اللہ اور روضۂ نبوی ﷺ اولیاء اللہ لاکھ فنافی الرسول

فنافی اللہ ہوں لیکن تکمیل کے لئے تڑپ یہ کہ حج بیت اللہ اور زیارتِ روضۂ نبوی صلعم نصیب ہو۔ اور عالمِ شہادت کی اِس زندگی میں بیت اللہ اور روضۂ طیّبہ کو دیکھیں اور اُن پر نثار ہوں۔ اس عالمِ ظاہر میں اللہ، رسول صلعم کے پاس ہماری رسائی اور یافت اس سے بڑھکر کیا ہو سکتی ہے کہ بیت اللہ (اللہ کا گھر) دیکھ لیا۔ اور روضۂ نبوی صلعم پر حاضری دی۔ انکو ایسا دیکھا کریں کہ دونوں دل میں اتر جائیں۔ ہر وقت نظر میں رہیں۔ اور اس عالم سے جاتے وقت وہی نقشہ آنکھوں میں لے جائیں۔ وہ بدبخت ہیں جن کو تصور پر بار ڈالنے کے باوجود بیت اللہ اور روضۂ انور کا نقشہ ذہن میں نہ آئے۔ حدیث شریف ہے۔ حجرِ اسود کو بوسہ دینے پر یا تو ہمارے گناہوں کی سیاہی حجرِ اسود میں چلی جاتی ہے، یا حجرِ اسود کی سیاہی خدانخواستہ زائر میں آجاتی ہے۔ گویا سیاہیوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اس لئے دعا کرکے بوسہ دینا چاہیئے۔ لہسن، پیاز کی بو حضور کو ناپسند تھی۔ اس لئے وہاں لہسن، پیاز، تمباکو کی بو سے منہ کو پاک صاف رکھیں تو مناسب ہے۔ لیکن بدبختوں کو دیکھو کہ سعودیوں کی ضد میں مواجہہ شریف میں تمباکو پینا چاہتے ہیں۔ نواب ولی الدولہ بہادر نے عشقِ نبی صلعم میں شراب اور تمباکو کو یکلخت چھوڑ دیا۔ ملازم، ماما تک ساتھ نہ لی اور کہا، میں غلام بن کر مدینہ جانا چاہتا ہوں۔ مالک بن کر جانا نہیں چاہتا۔

۲۰۔ مُواجہہ شریف رقت طاری ہوئی اور فرمایا۔ ہر محل کے آداب الگ ہیں۔ اور پھر اپنا اپنا ربط ہے۔ کل قیامِ مدینہ میں ایک پارہ نہ پڑھ سکا۔ سوائے نماز کے، کل وقت مُواجہہ شریف میں حضور صلعم کی طرف توجہ کے سوا کام نہ تھا۔ لوگ رَوضۃُ الجنّۃ

میں نمازیں پڑھتے ہیں۔ قرآن پڑھا کرتے ہیں۔ ہمارا ربط اور تھا۔ رسول اللہ صلعم زندہ مجسّم قرآن ہیں۔ وہ جو علم دیں ہم لیں۔ قلب کہتا تھا۔ صاحبِ قرآن کے ہوتے قرآن کیسے پڑھیں۔ مثلاً کسی عالم کے پاس جائیں تو اصل مقصود ملاقات ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد اگر وہ خود پڑھے یا پڑھنے کو کہے تو ادب بات ہے۔ بفضلہ کل وقت درودوں کے ساتھ مواجہہ شریف میں گذرا۔ تمنّا تھی کہ مواجہہ شریف میں ایک رات تخلیہ ہو سکے۔ بفضلہ معمول کے خلاف خصوصیت سے اجازت مل گئی اور سرفرازی رہی۔ الحمد للہ۔

۲۱۔ محرابُ النبی مسجدِ نبوی صلعم میں ہر کوئی رَوضۃ الجنّۃ میں نماز و تلاوت کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن محرابُ النبی صلعم کی تقدیس کا کیا کہنا۔ اللہ اکبر! جہاں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم معمولاً نماز میں امامت فرماتے تھے، اس مقام کی نماز کی فضیلت بیان سے باہر ہے ؎

برزمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

جس طرح عزیزوں کی طرف سے بیت اللہ شریف کا طواف کیا جاتا ہے اور مقامِ ابراہیم اور حطیم میں نفل پڑھے جاتے ہیں، اسی طرح محرابُ النبی صلعم میں اپنے سوا والدین اور مخلصین کی طرف سے نفل نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ جس کے خاص آثار ہیں۔

۲۲۔ جہاد وہ عارف ہی کیا جو مجاہد نہ ہو۔ باطل سے مقابلہ ہی عرفان ہے۔ اصل عرفان حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھنا ہے۔ اور باطل سے مقابلہ کرکے اُسے شکست دینا ہی جہاد ہے۔ چاہے جسمانی ہو یا روحانی۔

ایک صاحب نے کہا۔ جب محبت ہی دین کا بڑا مسلک ہے تو جہاد کیوں

کیا جاتا ہے ۔ ؟

فرمایا۔ محبّت تو ازل سے ابد تک مسلک ہے لیکن اسی محبّت کے ایک ایمانی محل کا اقتضا اور حکم یہ ہے کہ کفر کی روک تھام کی جائے۔ لہٰذا تعمیلِ حکم میں یہ عمل کیا جاتا ہے جو محبت کے مسلک کے منافی نہیں ہے۔ نفرت، محبتِ معکوس کا نام ہے۔ جہاد میں عام جنگوں کی طرح، نفسانی اعتبار کے تحت قتل و خونریزی نہیں کی جاتی۔ بلکہ امرِ الٰہی کے تحت بے نفسی سے حق کے لئے جنگ کی جاتی ہے

۲۳- خودکشی اور جہاد کا فرق

اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو اس دنیا میں ایک مومن بھی باقی نہ رہتا۔ کلمہ پڑھتا اور الحمد للہ کہہ کر خودکشی کر لیتا اور جنّت کی راہ لیتا لیکن اللہ نے اپنی ارادت سے آنے کو حرام کیا ہے۔ اور خودکشی کی سزا جہنم مقرر کی ہے لیکن مومن امرُ اللہ اور ارادۃُ اللہ کے تحت دوسرے محل پر یعنی جہاد میں جا کر جان دیتا ہے تو شہید ہو کر جنّتِ نعیم اور حیاتِ ابدی کا مستحق بنتا ہے۔

۲۴- شہادت اور قرآن

ایک صاحب نے مغلوبیّت سے گھبرا کر کہا، اب ہم شہید ہو جائیں گے۔ فرمایا اسلام قنوطیّت (نا امیدی) کی تعلیم نہیں دیتا۔ بات کہنے میں نفسیات دیکھنی پڑتی ہے کہ اس سے کس کی کمزوری یا کس کا غلبہ ظاہر ہو رہا ہے۔ اسلام کی تعلیم قرآن کے لحاظ سے یہ ہے کہ، کسی حال میں نتیجہ سے مایوس نہ ہوں بلکہ دشواریوں کے باوجود، اللہ پر بھروسہ ہو۔ اور کامیابی کی امید رکھیں۔ دشواریوں کو دشواریاں سمجھیں لیکن نتائج کو ان پر منحصر نہ سمجھیں۔ یہاں تک کہ اسی کامیابی کی امید میں شہادت بھی واقع ہو سکتی ہے لیکن موت و تباہی کو مقصود نہ بنائیں۔ قرآن میں موت سے نہ ڈرنے بلکہ موت کی تمنّا کرنے کی تعلیم و حکم

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۸/۱۱) آخرت ہے۔ اور موت کے اجور و نتائج کے پیشِ نظر مومن موت سے نہیں گھبراتا، بلکہ بے خوفی میں تمنّا کرتا ہے کہ آ بھی جائے تو فکر کی بات نہیں۔ آرام ہی آرام ہوگا۔

۲۵- اصیل کی پہچان

دین کے لئے غیرت، صبر و ضبط بہت ضروری ہیں۔ سکندر آباد میں ایک مشہور فوجی ڈاکٹر ہنٹ رہتا تھا۔ اس کے پاس بہترین اصیل کتے تھے۔ چار چار پانچ پانچ بچّے ہوتے۔ لوگ اصرار کر کے مانگ کر لے جاتے۔ ایک دفعہ مجھ سے کہا، گو میرے پاس اصیل کتے ہیں لیکن اُن کی سب اولاد اصیل نہیں نکلتی۔ اور میں اصیل کتوں کو کسی قیمت کسی کو نہیں دیا کرتا۔ میں نے کہا۔ اس کی کیا پہچان ہے۔ بولا۔ جب یہ بڑے ہوں تو میں دونوں کان پکڑ کر خوب جھُولا جھلاتا ہوں۔ اگر کسی بچّہ نے کُوں، کیا تو اس کو میں دوسروں کو دیدیتا ہوں۔ اور اگر دیر تک جھکولے دینے پر بھی وہ چُپ سادھے رہیں تو میں ان کو اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ لوگوں کو اصلیّت کا یہ راز معلوم نہیں۔

اسی طرح دین میں جس کا ظرف اصل ہو، صادق الایمان ہو، وہ غیر معمولی ڈسپلن (ضبط) دکھاتا ہے۔ اللہ رسول پر جان مال فدا کرتا ہے لیکن اُف نہیں کرتا۔

۲۶- کفر کا شرحِ صدر

قرآن کے لحاظ سے اسلام و کفر، حق و باطل دونوں میں شرحِ صدر ہوتا ہے۔ جب کفر کا شرحِ صدر ہوتا ہے تو باطل والا حق والے کو حجت و بحث سے پریشان کر دیتا ہے اور سوائے ایمان بالغیب کے اُس کو کہیں پناہ نہیں ملتی

چنانچہ حضرت فخر الدین رازیؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ انتقال کے وقت شیطان نے اتنے وسوسے ڈالے کہ وہ حیران ہو گئے۔ صرف ایک مرشدِ کامل کی نسبت و تائید سے ایمان بالغیب کی بناء پر وہ بچ گئے اور خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

۲۷۔ موت کے متعلق قرآنی علم

بدن سے روح کی جدائی کا نام موت ہے۔ یہاں کی موت دراصل نقلِ مقام کا نام ہے۔ مومن کا حال ہر جگہ اچھا ہی ہوتا ہے۔ چاہے اِس عالم میں رہے، چاہے اُس عالم میں۔ بلکہ اُس عالم میں خاص لطفِ مہمان نوازی ہوتا ہے۔ مومن کی اُس عالم کی زندگی دنیا کے تخت و تاج سے بہتر ہے۔ مومن کی وفات کے موقع پر ملک الموت، ملائکہ اور اولیاء اللہ تشریف لاتے ہیں۔ وفات کے وقت انسان جیسا علم رکھے گا ویسا ہی اُس کا حال دوسرے عالم میں ہو گا۔ قرآن کے لحاظ سے مقربین کو مرنے کے بعد رَوح و ریحان اور جنّتِ نعیم ملیں گے اُن کے لئے حشر و نشر نہیں۔ کیونکہ وہ اس عالم ہی میں موت سے متحقق ہو گئے۔ شہداء لذّاتِ طعام وغیرہ میں رہیں گے۔ اصحابِ یمین کو نعماء اور سلامتی کی بشارتیں ملیں گی۔ اور آرام سے رکھا جائے گا۔ کافروں کے لئے برزخ کا عذاب اور دوزخ کا داخلہ ہے۔ دعا، استغفار، ایصالِ ثواب، شفاعت اور کاملین کے قدم مزاروں پر آنے سے اصحابِ یمین کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور ان کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اصحابِ یمین کی نعمتوں کی جو انتہا ہو گی وہ مقربین کی ابتدا ہو گی۔ اصحابِ یمین حشر و نشر سے گذریں گے تب جنّت کے لطف اُٹھائیں گے۔ انھیں پہلے بھی مرنے کے ساتھ ہی نعمتیں، رفاقتیں حاصل رہیں گی۔ شہداء و مقربین (صدیقین) اس عالم میں جسم کے ساتھ بھی آسکتے ہیں۔ قرآن کے لحاظ سے اُن کے لئے کھانا، پینا ثابت ہے۔ قرآن

ہی نے آخرت کی زندگی کے متعلق کہہ دیا کہ اِشتہا ہو گی لیکن تکلیف نہ ہو گی۔ کھانا پینا ہو گا لیکن پیشاب وغیرہ نہ ہو گا۔ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (یعنی اس جنت میں پاک، صاف جوڑے ہوں گے) تمہارے نفس جو جو چاہیں گے وہاں ملے گا۔ (۲۴/۱۸)۔

۲۸۔ جنّت کی زندگی

اسلام حیاتِ بعد الموت کے متعلق بہت قطعی علم دیتا ہے۔ وہاں کی زندگی لذت و اَلم کے لحاظ سے اور الٰہی تعلق کے اعتبار سے انتہائی عظیم ہو گی۔ جہل و کذب ہی نار ہے جو مصیبت و اَلم کا منبع ہے۔ علم و صدق ہی نور ہے جو مسرّت و سکون کا سرچشمہ ہے۔ اسلام دنیوی زندگی کی اہمیت کو نہیں گراتا۔ بلکہ بتاتا ہے کہ یہاں کی زندگی آخرت کی ابدی زندگی کے مقابل ہیچ ہے۔ تاہم دنیا ہی آخرت کی کھیتی ہے۔ کذب و تفاخر، بے ہودہ باتیں زندگی میں رنج و الم کا باعث ہوتی ہیں۔ جن کا جنت میں بالکل دخل نہ ہو گا۔ امن و سلامتی ہی وہاں کا امتیازی نشان ہو گا۔ ارشاد ہے۔ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا (۲۷/۴) (نہیں سنیں گے اس میں بیہودہ بک بک اور نہ گناہ کی باتیں۔ مگر ہر طرف سے سلام ہی سلام ہو گا۔)

دراصل ہمارے جذبات و خواہشات کی عدم تکمیل اور ہماری عدم استطاعت ہی انتہائی رنج و الم کا باعث ہے۔ قوت و استطاعت ہی مسرّت و اطمینان کا سرچشمہ ہے جو صدق و تقویٰ کی بناء پر انعاماً عطا ہوتا ہے۔ لہٰذا جنّت کی زندگی کا اصول یہ ہو گا کہ جو چاہے دل بھر کر۔ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ الزمر (۳۴)

بعض لوگ جنّت کے نعماء، باغ و بہار، حور و قصور، میووں کھانوں وغیرہ کو کنایہ اور مجاز و استعارہ سے تعبیر کرتے ہیں یہ نامناسب ہے۔ یہ بیانات حقیقتِ نفس الامری کے مطابق ہیں۔ قرآن سے لفظی حقیقی معنیٰ کی توثیق ہوتی ہے۔ ارشاد ہے۔ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ ۔ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَا يَدَّعُونَ ۝ سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبٍّ رَحِيمٍ (۲۳/۳) (وہ اور ان کی بیبیاں سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھی ہونگی۔ ان کے لئے وہاں ہر طرح کے میوے ہونگے۔ اور وہ جو چاہیں گے ملے گا۔ مہربان پروردگار کی طرف سے ان کو سلام کہا جائیگا)

۲۹- عالمِ شہادت و غیب جس طرح ہم اس عالمِ شہادت کو حقیقت سمجھتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے۔ اُسی طرح وفات کے بعد جب ہم قبر میں داخل ہونگے یا عالمِ حشر میں پہنچیں گے، تو وہ عالم ہمارے لئے شہادت کا حکم رکھے گا۔ اور دنیا کی زندگی خواب معلوم ہوگی۔ چنانچہ اس دنیا میں جب تک ہم عالمِ خواب میں رہتے ہیں وہ عالم ہم کو شہادت محسوس ہوتا ہے۔ جب خواب ختم ہوجاتے تو بیداری کے بعد معلوم ہوتا ہے وہ خواب (غیب) تھا۔ یہی حال جنّت، دوزخ کی زندگی کا ہوگا کہ وہ شہادت بن جائے گی۔ ہر عالم میں پہنچنے کے بعد وہاں کی زندگی شہادت بن جائے گی اور دوسرے عوالم، عالمِ غیب بن جائینگے۔

اللہ تعالیٰ کے علم و خلق کی انتہا نہیں۔ نہ معلومات کی نہ مخلوقات کی۔ نہ ہماری عبدیت (احتیاج) ختم ہوتی ہے، اور نہ اللہ کی اُلوہیت و ربوبیت و خلّاقیت ختم ہوتی ہے۔ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ (۲۳/۴) ازلاً ابداً جاری و ساری ہے۔

فصلِ ہفتم

کشف و کرامات، جنّات و شیاطین

۱ تا ۱۶ — ۱۷ تا ۳۰

۱- باطنی توجہات کے دو پہلو فرمایا- اشراقی طریقہ کے لوگ سمجھتے ہیں کہ آنکھ، کان، ناک منہ بند کر کے مراقبہ کرنے سے ہی عرفانِ حق حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ عرفان نہ ظہور میں محدود ہے، نہ بطون میں مُقیّد۔ ورنہ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (۲۹/۱۳) باطل ہوجائے گا۔ اِس عالمِ ظاہر میں اللہ کے صفات و اسماء کی تجلیات و مظاہر زیادہ نمایاں ہیں۔ عالمِ باطن کی لامتناہی تجلیات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ مگر کسی ایک ہی جانب خواہ ظاہر ہو یا باطن ساری توجہ منعطف کرنا، اپنی منزل کو کھوٹا کرنے کے مُرادف ہے۔ عرفانِ حق کے ساتھ ہر عالم میں تجلیاتِ باری کو دیکھنا ہی عبادت ہے۔ اس کے برخلاف یہ لوگ آنکھ کان بند کر کے خدا کا تصوّر باندھتے ہیں، جو حقیقت کے خلاف ہے۔ اپنے نفس کا مخلوق ہے اور نفس ہے۔ ایسا شخص جب تک خود ساختہ یکسوئی میں رہتا ہے۔ خوش رہتا ہے۔ ورنہ ضیق محسوس کرتا ہے۔ ظلمت و ضیق جہل کا خاصہ ہیں۔ علم و عرفان سے نور آتا ہے۔ یہی حق و باطل کی پہچان ہے۔ عارف کو ہر محل پر نور نظر آئے گا۔

۲- عجائب و غرائب کا شوق بعض سالکین کو عجائب و غرائب اور کشف و آثار کا بہت شوق ہوتا

ہے۔ وہ علمِ صحیح کی عظمت واہمیت نہیں سمجھتے اور اس کو کمال نہیں مانتے یا اُس وقت تک کمال نہیں تسلیم کرتے جب تک کشف خواب اور آثار حاصل نہ ہوں۔ بعضوں کے کشفی مشاہدات غیر معمولی ہوتے ہیں۔ لیکن اُن پر علم مُنفتح نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے وہ حیران رہتے ہیں۔ اور اپنے مشاہدوں، تجربوں اور نظریوں میں تطبیق نہیں دے سکتے۔ حالانکہ کامیابی کے لئے عملی اور نظری علم میں مطابقت لازمی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایف۔ اے کے نظریات پڑھ کر اگر ام۔ اے کے معمل (لیبوریٹری) کے عملیات دیکھیں تو حیرانی ہوگی۔

حضرت امام ربّانی مجدّد الف ثانیؒ نے حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی کتاب عوارف المعارف کے حوالہ سے لکھا ہے۔ آثار و کشف تحتانی مرتبہ کی چیزیں ہیں۔ یہ صرف ضعفِ ایمانی کو دور کرنے کے لئے دی جاتی ہیں۔ جب علمِ صحیح قائم ہو، ایمان پکا ہو تو ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ شغلِ مطلق والوں کو ایمان کافی ہے۔ کیونکہ عالم میں جو کچھ ہے سب آیاتِ قرآنی میں مُندرج ہے اور آیاتِ قرآنی کے انکشاف و انفتاح سے عالم کی حقیقت بموجب علمِ الٰہی کھل جاتی ہے۔

عالمِ شہادت کے آثار اصل ہیں۔ عالمِ مثال میں خواب دیکھ لیا۔ لیکن شہادت میں کوئی چیز نہ آئی تو کیا فائدہ ہوا۔ کشف و آثار میں مشغول رہنے والوں کی حالت سطحی ہوتی ہے اور قوی ایمان والے آثار سے بالا ہوتے ہیں۔ ایمان طلبِ کشف کا مانع ہے۔ ایمان بالغیب اصل نعمت ہے۔ جس کے بعد بہت سے آثار خود آتے ہیں۔ لیکن ان کے پیچھے نہ پڑیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ہر آیت پر ایمان ہو۔ لَا رَیْبَ فِیْہِ کا مقام حاصل ہو اور متقی بن جائے۔ اس کے لئے نہ دلیل کی ضرورت ہے نہ منطق کی حاجت۔ آثار مطلوب نہ رہیں۔

بعض سالک اپنے نفسانی مطالبوں اور مرضیِ الٰہی کے تحت مطالبوں میں تمیز نہیں کرتے اور خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ایمان بالغیب کا مقام بہت اعلیٰ ہے۔ اس عالمِ شہادت میں آثار اللہ اور قدرتُ اللہ دیکھنا کیا کم تر ہے۔ لیکن بعضوں کو اس کے بجائے کشف و آثار مطلوب ہوتے ہیں۔ قرآن کے لحاظ سے انبیاء نے ہمیشہ ایمان پر زور دیا۔ البتہ اللہ نے کافروں کو بطور اتمامِ حجت اور کمزور مسلمانوں کی تقویتِ ایمان کے لئے معجزے اور آثار دکھائے۔ کبھی عذاب کے لئے بھی معجزات ظاہر ہوئے۔ جن کے ایمان قوی ہیں اُن کو تو آثار کی ضرورت ہی نہیں۔

بعض قطبِ عالم ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے خطرہ پر سارے عالم میں احکام جاری ہوتے ہیں۔ لیکن خود اُن کو خبر نہیں ہوتی۔ انتقال سے دو تین روز قبل بعض کو اُن کے مقام کا علم دیا جاتا ہے۔

۳۔ مرشدین اور آثار طلبی

آج کل اکثر مرشدین آثار کی طرف مائل ہیں۔ اور اس کو ایمان و مشیخت کا نشانِ امتیاز سمجھتے ہیں۔ انبیاء سے آثار و معجزات کے اظہار کے باوجود کافروں کے کفر میں شدت باقی رہتی تھی۔ ایمان کیلئے غیب کی ضرورت ہے۔ قرآن کہتا ہے "اگر ہم فرشتوں کو اُتار دیتے، مُردے اُن سے بات بھی کرتے، اور ہم اُن کے سامنے حشر بھی کر دیتے تو بھی یہ جاہل ایمان نہ لاتے" (ش) پھر آثار طلبی کا مقصود کیا ہوا۔ سوائے تمتع، تفاخر اور نفس کے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء، اولیاء سے کرامات کیوں ظاہر ہوئے؟ حقیقت یہ ہے کہ بے ارادتی میں آثار ظاہر ہوئے۔ وہ تو کرامات کو چھپاتے ہیں۔ اس کے بیان سے شرماتے ہیں، اِلّا یہ کہ امر ہو۔ حضرت غوثِ اعظمؓ فرماتے ہیں میں غسّال کے ہاتھ میں مُردے کی طرح ہوں۔ یعنے اللہ کے یدِ قدرت میں مُردہ ہوں۔ اصل میں

اسلام نے تصدیق، ایمان بالغیب اور استقامت علی الایمان کی تعلیم دی ہے۔
جس کے نتیجہ میں لَهُمْ مَا يَشَاۤءُوْنَ (۲۵۷) کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔
ایمان بھی بڑھیا کا سا پختہ سچا ہونا چاہیئے نہ کہ کچا۔

ایمان کے بعد جسم سے آثار، قلب سے آثار، روح سے آثار شروع ہوتے ہیں اشراقیت کے اعمال و اشغال کرنے والوں سے بھی بڑے بڑے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ مسلم و کافر کے آثار میں مشابہت ہو کر دھوکا ہوتا ہے۔ مشرک و مومن دونوں کا جسم عبادت میں لگا رہتا ہے۔ بظاہر تمیز نہیں ہوتی۔ مگر مقبولیت، نامقبولیت کا فرق ہے۔ جیسے جائز اولاد اور ناجائز اولاد میں صورۃً کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن ہر ایک کے آثار جداگانہ ہیں۔ اسی طرح کفر اور اسلام کے آثار صورۃً مشابہ ہیں۔ لیکن باطناً زمین آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا اشراقیت کے کمالات پر نہ جائیں اور نہ اُن کو مطلوب بنائیں۔

۴- آثار پرستی کے چکّر

انبیاء کو معجزے، اولیاء کو کرامات اور کفّار کو استدراج (خرقِ عادت امور کا ظاہر ہونا) ملے۔ آج کل لوگ ایسوں کے چیلے بن رہے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کھاتے نہیں حبسِ دم کرتے ہیں، منتر بتاتے ہیں۔ ایک مسلمان امیر ایسے ایک شخص کے معتقد ہو گئے اور مجھے بھی ملنے کو کہا، میں نے کہا۔ بکری کمزور ہے، تھوڑا دودھ دیتی ہے لیکن انبیاء تک نے چرایا۔ سؤر بہت قوی ہوتا ہے لیکن بکری پاک حلال اور سؤر نجس حرام۔ اسلام میں ایسوں کے آثار و کمالات کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمارے پاس ایمان بالغیب کی اہمیت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کبھی آثار پر نہ جائیں۔ اصل چیز ایمان ہے۔ ایمان پر جمنا سب سے بڑی کرامت ہے۔" اگر ایک بچہ کو ہزار روپیہ کی کتاب اور ایک گراموفون میں

تو بچہ کتاب کو پھینک دیگا اور گراموفون لے لیگا۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ جس طرح جسمانی بلوغ ہوتا ہے۔ اُسی طرح روحانی بلوغ ہے۔ جسمانی بلوغ کے کچھ مطالبے ہوتے ہیں، تقاضے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں کو کنٹرول کر کے اعتدال پر رکھا جائے تو جوانِ صالح بنتا ہے۔ ورنہ آوارہ گردی میں صحت اور اخلاق تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہی حال روحانی بلوغ کا ہے کہ اس کے بھی مطالبات ہیں۔ تقاضے ہیں۔ اگر ان کو کنٹرول میں رکھیں تو روحانی صحت ترقی کرتی ہے، حقیقی روحانی کمالات حاصل ہوتے ہیں۔ ورنہ استدراج والوں کے چکّر میں آ کر قلبی و روحانی عوارض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس کے باوجود روحانی ترقیوں کا مغالطہ رہتا ہے پس دین پر عمل کر کے حقیقی روحانیت پیدا کرو۔ پنجوقتہ نماز پڑھو۔ درود پڑھو۔ استغفار کرو محض خواب دیکھنے، آئندہ کے واقعات معلوم ہو جانے اور استدراج کے تماشوں سے زندگی کیا خاک بنے گی۔ آثار پرستی اور توہمات پرستی کے چکّر میں پڑ کر استدراج والوں کے چیلے بن جائیں تو ایمان کھونے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

۵- کشف

ہر چیز پہلے عالم مثال میں بنتی ہے۔ اس کے بعد یہاں عالم شہادت میں اس کا عکس آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو اس کا علم دیتا ہے۔ بعض اولیاء اللہ نیند کی حالت میں کسی کے قلب سے تعلق پیدا کر کے خواب میں علم دیتے ہیں لیکن کبھی بیداری کی حالت میں بھی تعلق ہوتا ہے۔ نیند تو نہیں ہوتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم فلم دیکھ رہے ہیں۔ بہت سی ہونے والی چیزیں دکھائی جاتی ہیں۔ بعض وقت وہ صاف کہتے ہیں اور کہیں سنائی بھی دیتا ہے لیکن اکثر چیزیں قطعیت سے نہیں بتائی جاتیں

ورنہ اس عالم کا نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ لوگ اکثر قضائے مُعلّق کو دیکھتے ہیں۔ اور قضائے مُبْرَم سمجھتے ہیں۔ قضائے مُبْرَم بہت کم دکھائی دیتی ہے۔

٦- کشفِ کونی - کشفِ الٰہی

اکثر لوگ کشفِ کونی کی طرف مائل رہتے ہیں۔ کشفِ الٰہی کی طرف میلان کم ہے۔ کشفِ کونی کافر و مومن میں مشترک ہے۔ امتیاز کی چیز کشفِ الٰہی ہے۔ کیونکہ اس میں ایمان بالغیب اور علمِ صحیح ہوتا ہے۔ ایمان و قرب کے لئے کشفِ کونی کی ضرورت نہیں۔ اکثروں کا ذوق خوابوں اور کشفِ مثالی کی طرف رہتا ہے۔ ان سے تعارض نہ کریں لیکن اپنا ذوق کشفِ الٰہی کا ہے جو اصل مقصودِ قرآنی ہے۔ ایمان کو قوی کرنے کے لئے بعض وقت کرامت و معجزہ دکھایا جاتا ہے۔ اکثر لوگ آثار پرست ہوتے ہیں۔ آثار میں ندرت ہے۔ اور ندرت پسندی عام طور پر پائی جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا الخ (٦/٧)۔ ترجمہ۔ اگر ہم کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب اتارتے اور وہ اپنے ہاتھ سے چھو بھی لیتے تو یہ کافر یہی کہتے کہ یہ صریح جادو ہے (٦/٧) آثار اور کشفِ کونی سے ایمان پیدا نہیں ہوتا۔

دراصل علمِ صحیح ملا تو سب ملا۔ اس مرتبہ میں علم عینِ عمل ہوتا ہے۔ مثلاً کلمۂ طیبہ، صبر، تسلیم، رضا، یافت و شہود میں علم عینِ عمل ہوتا ہے۔ لیکن یہ معاملہ کیفیت کا ہے نہ کہ کمیّت کا۔ بچانوے فی صد لوگ کمیّت کا ذوق رکھتے ہیں۔ گنتے رہتے ہیں، نمازیں کتنی پڑھیں۔ زکواتیں کتنی دیں۔ یہ بھی اپنے محل پر ٹھیک ہے لیکن قرآن کہتا ہے۔ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (٢/٥)۔ حکمت (علمِ صحیح) ملی تو خیرِ کثیر ملا۔

اسکو کون گن سکتا ہے۔ اس خیرِ کثیر کے اُجور و آثار کی حد نہیں۔ اِن اُجور و آثار کا ظہور بیشتر عالمِ آخرت میں ہے۔ کیونکہ عالمِ شہادت اس کا متحمل نہیں۔ لیکن علما و طلبا پیر اور شغلِ مقیّد والے کہتے ہیں۔ علم ملا تو کیا ملا۔ کیا نور کھلا۔ کیا دل ہلا۔ کیا سلطان الاذکار ملا۔ کیا کوئی خواب دیکھا وغیرہ۔

٧- کشفِ کونی اور شیطان

شیطان کو جتنا کشفِ کونی ہے، لاکھوں کو نہیں۔ ترقی کی مابہ الامتیاز چیز دراصل کشفِ الٰہی ہے۔ کشفِ کونی نہیں۔ بہت سے غیر مسلموں کو بھی کشف ہوتا ہے جس سے لوگ دھوکا کھاتے ہیں۔ کشفِ کونی کھیل تماشا ہے۔ اس سے سیرت نہیں بنتی۔ اعلیٰ مقام علمِ الٰہی ہے۔ آثار میں دھوکے ہیں۔ شیطان متشکل ہو کر دھوکے دیتا ہے۔ کئی واقعات ہیں کہ مراقبہ کر کے بعضوں نے سمجھا کہ صاحبِ مزار سے ملے۔ حالانکہ جن سے ملے وہ صاحبِ مزار نہ تھے۔ کشف میں بھی اعلیٰ اعتبار مقصود ہونا چاہیئے۔ نہ یہ کہ دل میں کیا ہے۔ گھر میں کیا ہے۔ اکثر لوگ اِسی میں مبتلا ہیں۔ اور اسی کو غلطی سے اپنی روحانی برتری سمجھتے ہیں۔

٨- کشف و کرامت - محجوبیت

اکثر مرشدین کرامات کے مدعی ہوتے ہیں۔ یعنی علم و قدرت کو اپنا مقام بنانا چاہتے ہیں جو انسان کا مقام نہیں۔ ہمارا مقام تو جہل و عجز ہے۔ کشف و کرامت مطلوب نہ ہوں۔ صرف اللہ اور اس کا رسول مقصود ہوں۔ اِنْ كُنْتَ مُدَّعًا سَلَامٌ عَلَيْكَ۔ رسول اللہ کے ذریعہ ہم اللہ اور اُس کی نعمتوں کو پا سکتے ہیں۔ بعض سالکین کو ترغیب و تحریصِ ایمانی کے لئے کشف و کرامات دیئے جاتے ہیں جیسے بچوں کو اعلیٰ چیزوں کی طرف متوجہ کرنا ہو تو پہلے کچھ تماشے بتاتے ہیں اس کے بعد اصلی چیز دیتے ہیں۔ اصل مقصود مکین ہو نہ کہ مکان اور اُس کی رنگا رنگی اور چمن

کے گُل بوٹے کو بچوں کو پھولوں اور رنگوں میں لطف آتا ہے۔ لیکن سمجھدار کا مطلوب مکین ہوتا ہے۔ اگر مکین خود سیر کرائے تو انکار نہیں ہوتا۔ اور خوب دیکھتا ہے۔ کبھی مکین زیادہ دکھاتا ہے اور کبھی کم۔ لیکن کم دکھانے سے محبوبیت کی کمی لازم نہیں۔ اور نہ کشف وکرامت زیادہ ہو تو محبوبیت کی زیادتی لازم۔ بعض اکابر سے عمر بھر میں ایک کرامت بھی ظاہر نہیں ہوئی۔ بعض وقت بہت سی چیزیں سالک کے دیکھنے میں آتی ہیں۔ لیکن وہ ملحوظ نہیں رہتیں۔ کیونکہ اس کی نظر مالک پر رہتی ہے۔ اور وہ چیزیں (یعنی کشف وکرامت) مقصود نہیں ہوتیں۔ بعض لوگ عالمِ مثال کی بہت سی چیزیں دیکھتے ہیں۔ لیکن اس ڈرامہ کی ترکیب اور پلاٹ کو نہیں سمجھ سکتے اور مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کشف وغیرہ بھی ایک قسم کا تماشا ہے۔ اصل میں تماشے والے سے ربط رہے۔ تماشا مطلوب نہ ہو۔ اسی لئے عالی استعداد والوں کو کرامتیں عطا نہیں ہوتیں کیونکہ ان کو ترغیب کی ضرورت نہیں۔ مثلاً صحابہ کرام کہ ان سے بہت کم کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ ضرورت کیا تھی۔ ان کا مقصد رسول اللہ تھے اور وہ حاصل تھا۔ جس کے بعد فَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ ...... جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ (۲۴-۳) ان کا مقام تھا۔ لہٰذا ہم کو مقامِ صفر (عدم) پر رہنا چاہیئے۔

۹۔ کرامت۔ اِستِدراج

بعض اوقات بعض ایسے پیر صاحبان سے بھی غیر معمولی آثار ظاہر ہوتے ہیں جن کا مقصود دنیاداری ہوتا ہے۔ یہ اِستِدراج شمار ہونگے۔ کرامات نہیں۔ کیونکہ کرامات کا ظہور ایمان کی بنیاد پر ہوتا ہے جس میں ارادت کو دخل نہیں ہوتا۔ اگر ارادت کو دخل بھی ہو تو وہ ایمانیات کے تابع رہتا ہے

اصل مقصود اپنا فرض اپنے دائرہ میں انجام دینا ہے۔ کامیابی ہو، نہ ہو، اس سے بحث نہیں۔ کامیابی، دولت یا جاہ وعزت کو مقصود نہ بنائیں۔ نہ ملے تو خلش نہ ہو۔ اس ایمانی علم وعمل پر جمنا جسے استقامت کہتے ہیں۔ وہی سب سے بڑی کرامت ہے۔ اصل مقصد امر اللہ اور اللہ ہونا چاہیئے۔ کتنے ہی آثار دکھیں نظر مُسمّٰی پر رہے۔ لیکن لوگ تماشوں کو مقصود بناتے ہیں جو اخلاص کے منافی ہے۔ حکم ہے۔ فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ (۱۲-۱)۔ یعنے امر اللہ کی تعمیل میں استقامت دکھاؤ۔ آثار کے متعلق فکر نہ کرو۔ اَتٰٓی اَمْرُ اللّٰہِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ۔ وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۱۴-۱)۔ اللہ کا امر آگیا پس اس کے (آثار و نتائج کے) متعلق عجلت مت کرو۔ پاک ہے وہ اور بلند ہے اس چیز سے کہ شریک کرتے ہیں)۔

یوروپ میں بعض لوگ اس بناء پر ولی سمجھے جاتے ہیں کہ وہ قوتِ متخیلہ اور قوتِ ارادی سے مختلف کمالات نہ صرف دکھاتے ہیں بلکہ اپنے چیلوں میں پیدا کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ قرآن نے اسے واضح کردیا ہے۔ فرعون نے کافر جادوگروں کے ذریعہ سانپوں کا استدراج دکھایا۔ حضرت موسیٰؑ ایمان پر تھے امرِ الٰہی کے تحت عصا پھینکا۔ وہ اژدھا بن کر سب کو کھا گیا۔ اس میں حضرت کے علم وارادہ کو دخل نہ تھا۔

اصل چیز ایمان ہے جس سے علم وعمل میں قوت وفیضان آتا ہے۔ اس سے ہٹ کر کتنا ہی بڑا کمال ہو۔ اہمیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اکابر نے کمالات کو مقصود بالذّات نہیں سمجھا۔ کبھی اُن سے ایسے کمالات کا ظہور ہوا بھی تو صاف کہہ دیا کہ ان کا اسلام سے تعلق نہیں۔ یہ اسلام وکفر کے مابین وجہ امتیاز نہیں۔ غیر مسلم

سے بھی ان کا ظہور ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت خواجہ نقشبندؒ نے فرمایا۔ "جو کچھ دیکھیں، سنیں سب کو تحتِ لا رکھیں۔ نامرادی ہا مرادِ ماست"۔ کمالات، مکشوفات، مطلوب نہ ہوں۔ اصل مقصود قرآن، اسلام، ایمان ہو۔ وہ ہو تو سب کچھ۔ وہ نہ ہو تو آسمان میں بھی اُڑیں تو کیا فائدہ۔ چڑیا بھی اُڑتی ہے۔ فلاح کے لئے قرآن ہم سے ذکرُ اللہ چاہتا ہے۔ اصل نعمت توحید و رسالت کا علم ہے۔

اللہ کی طرف سے ماموریت ہو تو برکات و فتوحات خود آئیں گی۔ نفس کے تحت اپنی ارادت و سعی سے ہم کسی کو قائل و متاثر کرنا چاہیں تو برکت نہیں ہوتی۔ بعض لوگ لباس اور نام وغیرہ کے ذریعہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کی غرض خود نمائی اور جلبِ منفعت ہو تو بظاہر کتنی ہی کامیابیاں ہوں کالعدم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ دیرپا نہیں ہوتیں۔ یا اُن کا انجام اسلامی نہیں ہوتا۔ اللہ چاہے تو آثار پیدا کریگا ورنہ آثار بھی مطلوب نہ ہوں۔ یہی کیا کم فضل ہے کہ ہمارا دل کچھ نہ ہونے پر مطمئن ہے۔

۱۰۔ کافروں کے کمالاتِ روحانیت کا دھوکا

آج کل اہلِ یورپ میں بھی جنّات اور عالمِ ارواح کی تحقیق کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اس خصوص میں کافی لٹریچر ہے۔ خاص خاص چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بعض ارواح سے ربط ہوتا ہے۔ ان کے ذریعہ گفتگو کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک کروڑپتی کی وفات کے بعد وراثت کی تقسیم پر جھگڑا ہوا۔ اور اُس کے وصیّت نامہ کا پتہ نہ چلا تو روحانی تحقیقاتی کمیٹی میں رجوع کیا گیا۔ ایک بچّہ کو معمول بنا کر اُس میّت کی روح کو طلب کیا گیا۔ اُس میّت نے کہا میں خود اس فکر میں تھا۔ لیکن مجھے تمہارے ساتھ ربط نہیں مل رہا تھا۔ اب اس بچہ کے ذریعہ میں بتا سکتا ہوں۔ تم فلاں کنجی سے فلاں المادی

کھولو تو وصیّت نامہ ملے گا۔ اس طرح کامیابی ہوئی۔

افسوس ہے۔ بعض مسلمان ایسے کمالات سے مرعوب ہو جاتے ہیں حالانکہ ہماری امتیازی چیز ایمان ہے۔

۱۱۔ اِستدراج کا تماشا

انسانی فطرت میں انتہائی لچک اور وُسعت ہے۔ خیر اور شر دونو طرف، ایک طرف پابندی و احتیاط کی حد نہیں تو دوسری طرف حماقت اور بے راہ روی کی انتہا نہیں۔ ابھی حال تک ہمارے گھر کے قریب ایک مسلمان عہدہ دار کے گھر مورتی کی پوجا ہو رہی تھی۔ ان کے لڑکے پر آسیب کے اثرات تھے۔ بعض عاملین کے علاج سے فائدہ نہ ہوا تو کسی نے کہا، ہم بھگا دیں گے، اور لاکر بچّے کے سرہانے ایک مورتی رکھ دی۔ شیطانی کھیلوں کی انتہا نہیں جسے قرآن میں استدراج کہا گیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (۹/۳) مطلب یہ کہ ہم اُن جھٹلانے والوں کو اس طور پر استدراج دیتے ہیں کہ اُن کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ بچہ اچھا ہو گیا۔ ان لوگوں کا عقیدہ مورتی پر جم گیا۔ مسلمانوں کے گھر بت پرستی شروع ہو گئی۔ میں ایک روز پہنچا تو انھوں نے کہا، اب تو گھر کا ایمان رخصت ہو چکا ہے۔ مورتی کی پوجا چل رہی ہے۔ میں نے کہا، توحید سے شیاطین بھاگتے ہیں۔ آپ توحید سے بھاگ کر شیطان سے ربط پیدا کر کے سمجھ رہے ہیں کہ بچہ اچھا ہو گیا اور محفوظ ہے۔ یاد رکھئے۔ انبیاءؑ تک اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ شیاطین کا تو ذکر ہی کیا۔ آپ کا بچہ منٹوں میں پھر مبتلا ہو جائے گا۔ جان جائے تو پھر نہ کہنا۔ آپ آزمانا چاہتے ہیں تو آزما لیجئے۔ وہ پریشان ہوئے اور کہا۔ اس بچہ کی خاطر ایمان سے ہاتھ دھویا تھا۔ میں نے کہا، مورتی نکالدو۔ ایمان پر جمو۔ ایمان میں حفاظت ہے۔ چنانچہ انھوں نے مورتی نکال دی۔ الحمدللہ ان کا بچہ اور گھر سب محفوظ ہو گئے

۱۲- ایک لڑکے کی غیر معمولی کرامت

ہماری بیعت وخلافت کے موقع پر فرمایا مراکش میں بارہ چودہ سالہ ایک مسلمان لڑکا تھا۔ اس کی غیر معمولی کرامت میں نے ایک انگریزی کتاب میں پڑھی جو میرے پاس موجود ہے۔ اس میں فرنچ گورنمنٹ کی مثل کے نمبر' تاریخ اور گواہوں کے حوالہ کے ساتھ لکھا ہے اور اس کا تفصیلی ریکارڈ پیرس میں موجود ہے۔ وہ بڑا صاحبِ کمال تھا۔ فرنچ گورنر اس سے ملنے کے لئے گیا اور کہا۔ معلوم ہوا۔ آپ بزرگ ہیں۔ اس نے کہا' اللہ بزرگ ہے اس کا حبیب بزرگ ہے۔ اولیاءاللہ بزرگ ہیں۔ میں تو ایک بچہ ہوں۔ یہاں سمندر کنارے جھونپڑی ڈال کر کھیلتا ہوں۔ اور پوچھا' آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔؟ گورنر نے کہا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ سمندر خشک ہو جائے اور ہم اس میں بیٹھ کر فرانس اور اٹلی کے فلاں فلاں میوے کھائیں۔ اس نے کہا۔ بس اتنا ہی۔ فوراً اس نے چند کنکریوں پر کچھ پڑھ کر کنکریاں سمندر میں پھینکیں تو سمندر کے سامنے کا حصہ دور تک خشک ہو گیا۔ کہا' اب چلو' سب گھبرائے اور بولے' ہم کو آپ کی کرامت کا اطمینان ہو گیا۔ اس نے کہا' نہیں۔ آپ کو دعوت کھانی پڑیگی۔ دعوت کے بعد جب ہم واپس آئیں گے تو پھر سمندر بن جائے گا۔ ہم یوروپ والوں کی طرح دھوکا نہیں دیتے۔ وہاں اندر لے گیا۔ اور کچھ پڑھا تو سب مطلوبہ میوے آگئے اور جب سب کھا کر لوٹے تو پھر سمندر بن گیا۔ اس کرامت کو دیکھ کر گورنر نے حیران ہو کر پوچھا۔ اتنی طاقتوں کے بعد آپ ہمارے محکوم کیوں ہیں۔ جواب دیا۔ ہم اللہ کے امر کے تحت زندگی گذارتے ہیں۔ اس کی حکمت میں دخل نہیں

دیتے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ ہم تمہارے محکوم رہیں۔

ایک دن حضرت بحؒ نے فرمایا۔ میں نے ایک چھوٹے بچے کو بے اسبابی میں کامیابی کی آیت بتائی تو اس نے ایک دن بغیر پیٹرول کے صرف پانی سے ۲۰ میل تک موٹر چلائی۔ اور ایک بھینس جو خشک ہو چکی تھی۔ وہ دودھ دینے لگی۔ یہ دیکھ کر چند لوگ اس کے مرید ہونے کو تیار ہو گئے۔ مجھے معلوم ہوا تو اُسے بلا کر ڈانٹا اور کہا کہ ایسے کھیل تماشے کرو گے تو یہ نعمت چھن جائے گی۔ سرکاری اختیارات بغیر حکم واجازت استعمال نہیں کیا کرتے۔ کیا تم کو بغیر پیٹرول موٹر چلانے کا آرڈر ملا تھا۔

۱۳- خواب

خواب اہم بھی ہیں اور غیر اہم' بے معنی بھی۔ ان کا انحصار ذاتی صلاحیت اور ماحول پر ہے۔ بعض وقت یہ اتنے سچے ہوتے ہیں کہ جن چیزوں کی تکمیل اس عالم میں نہیں ہوتی ان کی تکمیل خواب میں کر دی جاتی ہے۔ بعض وقت جو مصیبتیں اس عالم میں آنے والی ہیں اُن کو خواب میں گذار دیا جاتا ہے۔ عالمِ خواب میں خوشی یا تکلیف ہوتی ہے تو اس کا اثر ہمارے اعصاب' اعضا' جوارح تک پر پڑتا ہے لیکن بعض خواب بدہضمی کے ہوتے ہیں جو بے معنی ہوتے ہیں۔ بعض وقت خواب میں آیتیں آتی ہیں۔ اُن کا ظہور اس عالم میں نہیں ہوتا۔ آدمی کو شک ہوتا ہے۔ شک کی بات نہیں۔ ایک واقعہ تھا گذر گیا۔ جیسے اس عالم میں بھی مختلف واقعات گذر جاتے ہیں۔ ہر واقعہ کا تسلسل یا اس کا نتیجہ ظاہر ہونا ضروری نہیں۔ اسی طرح خواب کے نتائج ظاہر ہونا ضروری نہیں۔ ممکن ہے مرنے کے بعد اُس کا ظہور ہو۔ لہٰذا خواب کے متعلق احتیاط برتی جائے۔

۱۴- نبوّت کا چالیسواں حصّہ

فرمایا۔ یاد رکھو۔ ہزاروں آدمی خوابوں کے چکّر میں مبتلا ہیں۔ عالمِ مثال (خواب) میں شیطان خوب دھوکے دیتا ہے اچھے اچھے دھوکے کھاتے

ہیں فضل ہو تو سنبھلے ورنہ بہک جائے۔ یہ لوگ حدیث بیان کرتے ہیں۔ خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہے۔ لیکن اس نکتہ کی طرف توجہ نہیں کہ نبوت میں ۳۹ حصے تو قرآن ہے اور چالیسواں حصہ بھی وہ خواب ہیں جو قرآن ہی کے مطابق ہو جو خواب مطابقِ قرآن نہیں، وہ شیطانی دھوکا ہے۔ توفیق و ادب ہو تو سمجھ میں آتا ہے ورنہ نہیں۔

واضح رہے کہ اصلی سچے خواب بہت شاذ ہوتے ہیں۔ اُن کا منشا بھی صرف اطلاع ہوتا ہے۔ باقی اکثر بدہضمی کے خواب ہوتے ہیں۔ یا اپنے خیال کی پیداوار جس میں شیطان چکر دیتا ہے۔ جیسا سوچا ویسا خواب دیکھا۔ شیطانی خواب کی پہچان یہ ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی بات قرآن و شریعت کے خلاف ہوگی جس کی غلطی کو فراستِ مومن محسوس کرتی ہے۔ بہت سے خواب معلقات ہوتے ہیں۔ بہت سے خوابوں کی تعبیر کا ظہور اپنے وقت پر ہوتا ہے۔

ایک ہے شہادت کی دید۔ ایک ہے غیب کا علم۔ علمِ غیب کا مرتبہ اعلیٰ ہے جو وحی سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا مرتبہ شہادت کی دید کا ہے۔ عالمِ خواب و مثال کے تماشے کھلونوں کے مانند ہیں۔ جن کو دیکھ کر کنڈر گارٹن کے بچے خوش ہو جاتے ہیں۔ علم کی مثال ایک بڑے کتب خانہ کی ہے جہاں کھلونے نہیں بلکہ ان کے اوپر کا علم ہے۔ کشف و مثال میں اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں دیکھو تو اُن پر نہ جاؤ بلکہ قرآن کے تحت رہو۔ خواب و مثال میں کتنے ہی بڑے مقامات کی بشارت ہو وہ مقبولیت کی دلیل یا وحی نہیں ہے۔ آخر وقت یعنی خاتمہ تک کوئی چیز قطعی نہیں۔ یاد رہے کہ احتیاج اور دعا و استغفار کا مقام باقی ہے۔ ورنہ دھوکے میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور مطمئن ہو کر علم و عمل اور سعی چھوڑ دیں گے۔

اس سے بڑھ کر کیا کہ شیطان حضرت غوث اعظمؒ سے کانپتا ہے لیکن اس

نے حضرت کے سامنے تجلی نوری میں متمثل ہو کر کہا۔ تیرے اعمال مقبول تو عبادات سے مستثنیٰ۔ حضرتؒ نے سمجھ لیا کہ یہ شیطانی چکر ہے۔ کیونکہ یہ بات شریعت اور نانا جانؐ کی نسبت کے خلاف ہے۔ اس پر شیطان نے کہا۔ میں نے اس ذریعے سے ہزاروں کی قطبیت چھینی ہے۔

ایک صاحب نے دیکھا کہ وہ مقامِ کُن پر فائز ہیں اور سارا عالم اُن کے ارادہ پر چل رہا ہے۔ اُسی وقت حضورؐ تشریف لائے تو یہ اپنے منصب سے اُٹھ کر ادب سے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ پیچھے کُتے آ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا اس اعلیٰ ترین مقام پر کُتے کیسے؟ جواب ملا۔ یہ بھی مقامِ کُن پر تھے لیکن حضورؐ کی تشریف آوری پر بے اعتنائی کی اور ادب سے کھڑے نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ کہ اس حالت کو پہنچے۔ اُن بزرگ کے کان میں ایک بات پڑی ہوئی تھی جو اس وقت کام آ گئی۔ تم عرش تک جاؤ یا عرش بن جاؤ لیکن اپنے کو حضورؐ کے قدموں کے نیچے کی گرد سمجھو کہ یہ سب عروج حضرتؐ کا صدقہ ہے۔ وہ صاحب اس ادب کی وجہ سے محفوظ رہے۔

(۱۵)۔ نبی کا خواب اور عصمتِ نبویؐ

ناچیز نے حضورؐ کے مدینہ کی ہجرت والے خواب کا ذکر کر کے پوچھا۔ کیا نبیؐ کے خواب کی تعبیر قطعی سمجھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ حضرتؐ نے کسی اور مقام کی تعبیر لی اور نکلا مدینہ۔ فرمایا، نبی اُمت کے لیے علم و عمل کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس کا علم کامل قطعی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ وحی ہوتا ہے۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (۲۷/۵)۔ البتہ امت کی تفہیم و تربیت کے لیے اُس کو علم انسانوں کی سطح پر نزول بھی کرایا جاتا ہے۔ جیسا طرح ایک اچھا معلم بچوں کی زبان میں تلفظ کر کے ان کی غلطیاں بتاتا ہے اور ایک استاد پہلوان کُشتی سکھانے کے لیے کبھی خود پچھڑ جاتا ہے تاکہ فن کے توڑ جوڑ

سکھائے اس سے اس کی کمتری ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ فن کا لازمہ ہے۔ استاد معذوری میں کمال دکھاتا ہے۔ اسی طرح نبی پر سہو و نسیان بھی طاری کیا جاتا ہے۔ تاکہ انسانوں کی تربیت کے لئے کامل نمونہ بن سکے۔ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (۶۸) (اگر تجھ کو شیطان بھلادے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالموں کے ساتھ مت بیٹھ) لیکن وحی اور تعلیم کے ذریعہ عصمت نبوی کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اس میں ان مرشدین کی اصلاح کا سامان ہے جو اپنے ہر کشف و خواب کی تعبیر کو یقینی سمجھتے ہیں۔

۱۶۔ خلاصہ ۱۳ تا ۱۵ خواب تو خواب ہے لیکن یہ بیداری بھی تو خواب ہے بلکہ مرنے کے بعد برزخ بھی تو خواب ہے۔ غیب تو غیب، عالم شہادت میں بھی ایک پتہ کا کس کو علم ہے خواب ہو کہ بیداری۔ نبی کا علم ہر حال قطعی ہوتا ہے۔ ہمارا حال تو بیداری میں بھی علم کے بارے میں خواب سے کمتر ہے۔ خواب کے معنی وہ علم جو بیداری سے ہٹ کر حاصل ہو۔ جب بیداری کا علم پکا نہیں تو خواب کا کیسے پکا ہوگا۔ لَا عِلْمَ لَنَا اور وَهُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ۔ ہمارا مقام و علم رہے خشیت طاری رہے۔ ایمان و شکر کے بعد ہی سکون ہے۔ عبدیت کے سوا پناہ نہیں۔

جنات۔ شیاطین

(۱۷) ارواح کا وجود ہمیشہ سے عقل پرستوں کی ایک جماعت رہی ہے جس میں خصوصیت سے فلسفی اور سائنسداں داخل ہیں۔ یہ ملائکہ اور جنوں کے وجود کے متعلق شک ڈالا کرتے ہیں۔ اور روحانی تعلقات کے امکان کو نہیں مانتے۔ اس کے برخلاف ماہرین روحانیات

جن میں اولیاء اللہ اور نفسیات کے ماہرین داخل ہیں۔ ارواح پر اور روحانی تجربوں، مشاہدوں پر ایقان رکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں روحانیت کے نام سے بڑے دھوکے چلتے تھے اور سوسائٹی میں وہم و خوف پیدا کئے جاتے تھے۔ اس کا ایسا فطری ردعمل ہوا کہ لوگوں میں ان کے خلاف سخت نفرت پھیلی۔ یورپ میں بعض حکومتوں نے عاملین کو سخت سزائیں دیں۔ بعد میں جب لوگ دھوکہ باز عاملین کے مکر و فریب کو سمجھنے لگے تو روحانیت ہی کا مذاق اڑانے لگے لیکن قرآن حقائق کی توثیق کرتا ہے۔ اب ان دونوں قدیم جماعتوں میں اتفاق ہوتا نظر آتا ہے۔

۱۸۔ ملائکہ قرآن کے لحاظ سے ملائکہ کی اپنی شکلیں ہوتی ہیں۔ عموماً ان کے پر ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیق نور سے ہوتی ہے آسانی سے تمثل لیتے ہیں۔ جب چاہیں انسانی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان کا مسکن آسمان ہے۔ جہاں تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ اور مومنین کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ یہ ادائی فرض کے لئے زمین پر بھی آتے ہیں اور لوگوں سے ملتے ہیں۔ کبھی پہچان میں آتے ہیں کبھی نہیں۔ اکثر فوق الفطرت امور انجام دیتے ہیں۔ مرتے وقت میت کی مناسبت سے اچھی یا بری بشارتیں لے کر آتے ہیں۔ خاص مواقع مثلاً شب قدر وغیرہ میں برکات و سلام کے ساتھ نزول کرتے ہیں۔

۱۹۔ جن ملائکہ کے بعد جن کا مرتبہ ہے، جو ناری مخلوق ہیں۔ یہ ملائکہ اور انسان کے بیچ میں ایسے ہیں کہ دونوں کی کچھ کچھ فطرت کے حامل ہیں۔ ان کے خاندان ہوتے ہیں، کلچر ہوتا ہے۔ مذہب ہوتا ہے۔ یہ نظر نہیں آتے۔ تمثل کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ان کو حضرت سلیمانؑ، حضرت

غوثِ اعظمؓ اور دیگر اولیاء اللہ سے ربط رہتا ہے۔

۲۰۔ شیاطین

شیاطین کی جماعت گمراہ جنوں اور اُن گمراہ انسانی ارواح سے بنتی ہے۔ جو اُن کے رفیق اور مُتبعین ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قرآن نے انھیں شَیَاطِیْنُ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (۲) کہا ہے۔ شیطان ان کا صدر ہے۔ ذُرِّیَّاتُ الشَّیٰطِیْنِ سے مراد شر میں شیطان کے متبعین ہیں۔ شیاطین شر پسند اور بنی نوع انسان کے لئے ضرر رساں ہیں لیکن وہ آپس میں بہت متحد رہتے ہیں۔ اور اپنے پرستاروں کے حق میں بڑے مُمد و معاون ہوتے ہیں۔ تاہم شیاطین کا دائرہ عمل زیادہ تر جُہلا کے طبقوں میں ہوتا ہے اور اعلیٰ درجہ کے منکرین کے طبقوں میں بھی۔ وہ انسانی خون کے شائق ہوتے ہیں اور انسانی قربانیوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔

۲۱۔ انسان

انسان اشرفُ المخلوقات ہے۔ اپنی حقیقت میں ملائکہ اور جنوں سے افضل ہے۔ عالم میں آمِین اور خَلِیْفَۃُ اللہ ہے۔ اللہ کا عبد اور محکوم بن کر اپنے علمِ عروج و نزول اور جامع ظہور کی بناء پر ساری کائینات پر حاکم و اثر انداز ہے۔ اور محبت و طاعتِ الٰہی کی بناء پر سب سے فائق ہے۔

ہر ایک جانور کی فطرت معین ہے۔ انسان ہی کی فطرت غیر معین ہے۔ اس کی فطرت میں بے انتہا رنگا رنگی ہے۔ جنوں کی فطرت میں حیوانوں کی بہ نسبت وسعت ہے۔ لیکن انسان کی فطرت کی نزاکت و وسعت کو جن بھی نہیں پاسکتے۔ جنوں میں بھی اولیاء اللہ ہوتے ہیں۔ لیکن انسانی اولیاء اللہ کے تحت بھی جنوں کے علاقے رہتے ہیں۔ جنوں کی ہدایت عموماً انسانی اولیاء کے ذریعہ ہوتی ہے۔ حضرت غوثِ اعظم غوثُ الثقلین ہیں۔ یعنی جن و انس دونوں کے غوث ہیں۔

۲۲۔ جنّات کی خصوصیات

جن اچھے برے ہر جگہ اس کثرت سے ہیں کہ اگر لوگوں کو علم ہو جائے تو چلنا پھرنا مشکل ہو جائے۔ ناری مخلوق ہیں شر کا پہلو غالب ہے۔ ان کی خصوصیت غصہ اور بیوقوفی ہے۔ وجود کی وجہ سے کچھ خیر رہتا ہے۔ ورنہ جو شیاطین ہیں بڑے شر ہوتے ہیں۔ ان کی اولاد کثرت سے ہوتی ہے۔ جن و شیاطین اپنی اصلی شکل پر نظر نہیں آتے۔ مختلف شکلوں میں تشکل لیتے ہیں۔ اکثر بلیوں، کتوں، سانپوں کی شکل اختیار کر کے آتے ہیں۔ ان کی اصل شکل بعض سمندری جانوروں کی سی ہوتی ہے۔ بعض وقت اجنبیت اور خاص شباہت کی وجہ سے پہچان میں بھی آتے ہیں۔ اگر سانپ وغیرہ ظاہر ہوں تو خاموشی سے تین دفعہ کہیں۔ جن بھوت ہو تو چلا جا یا نظر نہ آ۔ جن یا شیطان ہو تو چلا جاتا ہے۔ اگر انھیں ضرر پہنچا دیں تو اُن کا خاندان بعد کو سختی سے بدلہ لیتا ہے۔

ان میں مسلمان ہیں اور کافر بھی۔ بڑی بڑی عمریں پاتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ایک جن صحابی سے ملاقات ہوئی۔ اس بناء پر وہ اپنے آپ کو تابعی کہتے تھے۔ بہت سے جن ہم سے انسانی شکل میں مل کر جاتے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ہوتی۔ اگر وہ چاہیں تو ہم کو اپنے عالم میں بھی لے جاسکتے ہیں۔ البتہ انسان کو تنِ مثالی کے ساتھ لیجاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسان پر نیم خوابی کی سی کیفیت رہتی ہے۔ اگر وہ انسان کو اس جسم کے ساتھ لے جائیں تو جانے میں اُسے اذیت ہوتی ہے۔ اولیاء اللہ اس جسم کے ساتھ وہاں جاسکتے ہیں۔ اُن کے جسم کی لطافت تنِ مثالی کے برابر ہوتی ہے کیونکہ ان میں معلومیت کا اعتبار رہتا ہے۔ جنوں کو اصلی حالت میں دیکھنا خطرناک ہوتا ہے۔ حضرت غوثِ اعظمؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرزاقؒ نے حضرت کے وعظ کے دوران میں جنوں کو دیکھا تو بے ہوش ہو گئے۔ جنوں کو دیکھنے سے آنکھ خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ نیچی نظر رکھنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ ناری مخلوق ہیں۔ مومن

کی نظر عرفانی ہوتی ہے جس سے جن گھبراتے ہیں۔
ایک استاد نے جماعت میں ایک چھوٹے بچہ سے پانی مانگا۔ وہ جن کا بچہ تھا۔
اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کر کئی گز سے پانی لے کر پیش کر دیا۔ دیکھنے والے گھبرا گئے۔
دوسرے دن سے اس کے باپ نے اُسے مدرسہ نہیں بھیجا۔
مدینہ طیبہ میں محبی ضیاء الدین قادری صاحب نے مجھے رات تیسری منزل پر
سُلایا۔ میں چٹخنی لگا کر سو گیا۔ اندھیرا تھا۔ رات میں دو جن آ کر مجھے بھینچنے لگے۔ میں
حضرت غوث اعظمؓ کی طرف متوجہ ہوا تو بھاگ گئے۔ میں نے کہا۔ مسخرو، تمہیں معلوم نہیں
ہم رسول اللہ کے مہمان ہیں۔ ستاتے ہو۔ چھوٹے سرکار (حضرت غوثِ اعظمؓ) سے
عرض کرونگا تو تمہارا برا ہوگا۔ خبردار جو یہاں آئے۔

۲۳۔ شیاطین اور انسانی نسل

جن و شیاطین انسانی نسل کی
برتری سے واقف ہیں کہ یہ بات
اُن میں نہیں۔ اس لئے وہ انسانی عورتوں سے ربط پیدا کرتے ہیں۔ اور مادہ جن
و شیاطین مرد انسانوں سے۔ اِن سے جنسی تعلقات قائم ہو جانے کے بعد، عورتیں کبھی انسان
کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ لیکن عام طور پر جن اور شیاطین، مرد، عورت کے تعلقات
میں ملوث ہوئے بغیر خود شریک ہو جانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے حضورؐ نے بوقتِ صحبت
بِسْمِ اللّٰہِ وغیرہ پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ تاکہ شیطان مجامعت اور اولاد میں
شریک نہ ہو۔ ورنہ شیطانی اثرات کے تحت بعض وقت عجیب الخلقت بچے پیدا ہوتے ہیں۔
غیر شادی شدہ عورتوں کے ساتھ جن و شیاطین کے جنسی تعلقات سے اِن کی اولاد اس
عالم میں پیدا نہیں ہوتی، اگر وہ اس عالم سے غائب کر کے اپنے عالم میں لے جائیں تو وہاں
ان کی اولاد ہوتی ہے۔ بعض عورتوں کے ساتھ ان کے تعلقات رہتے ہیں۔ لیکن کسی کو
پتہ نہیں رہتا۔ چنانچہ ایک شادی کے موقع پر دولہا کے آ کر بیٹھنے کے بعد، دولہن نے

زیور، لباس اُتار پھینکا۔ اور برہنہ باہر نکل آئی۔ اور کہنے لگی۔ دوسرا دولہا کیسے
آسکتا ہے۔ مدت سے یہ لڑکی ہماری ہو چکی۔
لڑکیوں کے لئے چودہ برس کا سن نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ جن و شیاطین جنسی
روابط کے لئے تاک میں لگے رہتے ہیں۔ جب کسی لڑکی کو راضی کر کے شیاطین شادی
رچا لیتے ہیں تو پھر کوئی علاج مفید نہیں ہوتا۔ اور نہ وہ واپس آنا گوارا کرتی۔ بلکہ عاقبت
بھی ان شیاطین کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اللہ محفوظ رکھے۔ بظاہر وہ گھر میں ہوتی
ہے۔ لیکن وہ دراصل اُس عالم میں شیاطین کے پاس ہوتی ہے۔ اِس لئے خاص آیاتِ
قرآنی کے ذریعہ حفاظت کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

۲۴۔ علاج

بعض وقت جن انسانوں کو روپیہ پیسہ بھی دیتے ہیں۔ اگر جن کے
اثرات ہوں تو جمالی آیتوں کے پڑھنے سے وہ دبے رہتے ہیں،
ظاہر نہیں ہوتے۔ تاہم امراض کو فائدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اچھے برے جن و شیاطین جلالی
آیتوں سے تڑپ کر بھاگتے ہیں۔ بعض وقت یہ عاملین کے ریکارڈ، تعویذ وغیرہ اڑانے کی فکر
میں رہتے ہیں۔ ہوشیار رہنا چاہیئے۔ بعض بدلہ کے طور پر بیماریوں میں مبتلا کرتے ہیں
جس کی تمیز نہیں ہونے پاتی۔ ان کی طرف سے شدت ہو تو مریض چیختا ہے۔ ان کا اثر خفیف
نامعلوم ہو تو مرض کی وجہ سے اُدھر خیال نہیں جاتا۔ امراض اور اثرات میں تمیز کی ضرورت ہے
حضرت زینبؓ بہت جلالی ہیں۔ ان سے جن و شیاطین کانپتے ہیں۔ تمام مخلص اولیاء
اللہ کی نسبتیں مصیبتوں میں ہماری مدد فرماتی ہیں۔ اس لئے ایسے مریض کے کمرہ کو صاف
رکھنا چاہیئے۔ تاکہ نسبتیں متوجہ ہوں۔ تاہم وہ بھی معذوری کا لحاظ رکھتی ہیں۔ بعض
وقت روحانی شیطانی اثرات تو چلے جاتے ہیں لیکن دماغی اثرات آ جاتے ہیں۔ یا جسمانی
امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج کسی حکیم یا ڈاکٹر سے کرانا چاہیئے۔ بالخصوص
ایام کی باقاعدگی حرارت کے دفعیہ کے لئے ضروری ہے۔ جس سے سکون حاصل ہوتا ہے

اگر دماغی خلل واقع ہو تو مریض کو غصہ، جوش و اشتعال سے بچائیں۔ کوئی چیز خلافِ طبیعت
نہ کریں۔ بلکہ ممکنہ طور پر اس کے منشا کا ساتھ دیں یا سمجھ سے تمام موانعات کو ہٹائیں
اور اُسے خوش رکھیں۔ دوائیں، غذائیں ٹھنڈی دیں اور خاص آیات سے ربط رکھیں۔
حضورؐ نے حفاظت کے لئے سورہ فلق، سورہ ناس، اور اعوذ باللہ پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے
اللہ تعالیٰ عارف عاملین کو محفوظ رکھتا ہے اور حصار اُن کی

۲۵۔ حصار

ذات کا جزو بن جاتا ہے۔ وہ ہر وقت پہروں میں رہتے ہیں
جس میں ان کی ارادت و اہتمام کو دخل نہیں ہوتا۔ عام عاملین اور عارفین کی مثال ایسی
ہے کہ ایک شخص بارود، گولی، اسلحہ خرید کر اپنی حفاظت کر رہا ہے۔ دوسرے کے ساتھ
اس کے علم و اطلاع کے بغیر سرکاری توپ خانہ رہتا ہے۔ اور حفاظتِ الٰہی کام کرتی ہے
لاکھ حصار بندی کرو، جن و شیاطین اپنی قوتوں سے حصار توڑ کر آتے ہیں۔ اور
بدل لیتے ہیں۔ پھر ان کو بھگانا پڑتا ہے۔ قلعہ میں بھی بیٹھو تو دروازوں سے کھڑکیوں سے
جھانکنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دراصل خیر و شر کی جنگ ہمیشہ چلتی رہتی ہے
انسان اور شیطان کے مقابلے سے اس عالم میں ہلچل مطلوب ہے تعطل مقصود نہیں۔
اللہ والا حق کے نور سے وساوسِ شیطانی کا دفعیہ کرتا ہے۔ عامل کو
نہایت فراست سے مدافعت کی ایسی ترکیبیں کرنی چاہئیں کہ رعب قائم ہو اور
جن خود ڈر کر بھاگ جائیں اور ان کی پارٹی بھی ان کی حمایت نہ کرے ورنہ جنگ
بہت طول کھینچتی ہے۔ ان کی تعداد اتنی کثیر اور روز افزوں ہے کہ روزانہ ایک لاکھ
بھی مار ڈالیں تو لاکھ برس میں یہ ختم نہیں ہو سکتے۔ یہ مسلمان سے صرف نسبتوں اور
آیتوں کی وجہ سے گھبراتے ہیں۔ لہٰذا حفاظت کے لئے آیاتِ قرآنی کی طرف متوجہ رہیں۔

۲۶۔ ارواح کے ربط کا فائدہ

بعض کو عالمِ جنات سے طبعی مناسبت ہوتی ہے۔ ان پر وہ عالم کھلتا ہے

بچوں وغیرہ کو معلومات دینا چاہیئے کہ انسانوں کے ساتھ اکثر ملائکہ، جن، شیاطین
اور اولیاء اللہ کی روحیں رہتی ہیں۔ وہ متمثل بھی ہوتی ہیں لیکن عام طور پر نظر نہیں آتیں۔
اس طرح خیر و شر، جمال و جلال ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ جن و شیاطین نظر
پڑیں تو ڈرنا نہ چاہیئے نسبتیں اکثر حفاظت کرتی ہیں۔ اگر وہ جمالی روحیں ہیں
تو خوشی کی بات ہے۔ لوگ تو ان کی تسخیر کے لئے کیا کچھ کوشش کرتے ہیں۔
بے مانگے ملیں تو کتنی خوش قسمتی ہے۔ البتہ پہلے پہلے اُن کے نئے پن کی وجہ
سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ ہمارے اصلاحِ خیال سے اور ان کے بار بار آنے
جانے سے اجنبیت دور ہو جاتی ہے۔
قرآن میں اولیاء اللہ کی حُسنِ رفاقت کی بشارت ہے حَسُنَ اُولٰٓئِکَ
رَفِیْقًا (۵/۶) خصوصاً شہدا کی روحیں بہت مدد کرتی ہیں۔ گھبرائیں نہیں۔ یہاں
لفظِ رفاقت مطلق ہے۔ اس کے معنے کو دوسرے عالم کی حد تک محدود
کرنا غلط ہے مطلق کو مقید کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔ انبیاء اولیاء رفیقِ
سفر ہیں۔ دنیا کی زندگی بھی سفر ہے۔ اس کے برخلاف اگر جلالی روحیں
شیاطین کی ہیں تو بھی نہ ڈریں۔ کیونکہ ہمارے پاس آیتوں کی توپیں اور ایٹم بم
ہیں۔ نیک جنوں کی آمد پر حرارت کا احساس ہوتا ہے۔ شیاطین کے آنے
پر بدکیفی اور بد شکلیں نمایاں ہوتی ہیں۔ انسان سے جن و شیاطین گھبراتے
ہیں بھاگتے ہیں۔ ان سے تعارض نہ کریں۔ جن لوگوں میں ان سے تعلق پیدا
کرنے کی صلاحیت ہے اُن سے وہ بآسانی مل سکتے ہیں۔ ایک بات سمجھ کی یہ
ہے کہ جس طرح چیتے، کتے، سانپ وغیرہ ہمارے کمپونڈ میں کبھی گھس آتے
ہیں اور پھر نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی آکر گذر جاتے ہیں اکثر منزل نہیں
بناتے۔ اس لئے ان کے پیچھے نہ پڑیں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ جمالی روحوں کے لئے جلالی آیات نہ پڑھیں اور جلالی روحوں کے لئے جمالی آیات نہ پڑھیں۔ ارواحِ طیبہ کو بھگانے کے لئے تعویذ وغیرہ کرنا بے وقوفی ہے۔ انھیں تکلیف ہوتی ہے۔ اور کہتے ہیں ہم تو اِن کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں اور یہ ہم کو خراب سمجھ کر نکلوانا چاہتے ہیں۔ سمجھ سے کام لیں۔

میرے ایک دوست سے ایک بزرگ جن بہت بے تکلف تھے، تہجد کے وقت آکر اُن کی جانماز پر اُن کا قرآن پڑھتے تھے۔ اُن کی بچی کے سر پر ہاتھ رکھتے تھے۔ میری ایک عزیزہ ایک جن سے بچوں کو بہلانے کی خدمت خوب لیتی تھیں۔ تقسیم ہند کے ہنگاموں کے وقت انھوں نے ایک شہید مرد سے رفاقت و حفاظت طلب کی۔ نیاز دی۔ اُن کو رتی برابر نقصان کسی نے نہیں پہنچایا۔ ایک دفعہ حضرت کے نظر آنے پر سب گھبرائے تو نیاز دی اور عرض کیا۔ آپ کا آنا مبارک ہے لیکن بچے ڈرتے ہیں۔ اس لئے آپ براہ کرم نظر نہ آئیں اور مدد فرمائیں۔ چنانچہ پھر نظر نہ آئے۔

۲۷۔ نسبت اور شیطان

شیطان کا مقابلہ اللہ کے ربط (ایمان) اور نسبتوں کی قوت سے ہوا کرتا ہے۔ حزبُ اللہ ہمیشہ کامیاب اور حزبُ الشیطٰن ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں۔ شیطان کی توجہ اُن لوگوں پر بہت ہوتی ہے جو آگے چل کر بڑے اولیاء اللہ بننے والے ہوں۔ وہ اُن کا تعاقب کرتا ہے۔ جال میں پھنسانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ نسبتوں کی برکت سے جال میں پھنستے نہیں۔ یا اگر پھنسیں بھی تو اس کے جال کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں اور باہر نکل آتے ہیں۔ اس طرح ان کا عملی تجربہ اُن کے مریدین کے لئے بہت مفید ہوتا ہے اور شیطان اُن کے نام سے کانپتا ہے۔

اگر کسی مکان کے متعلق اثرات کا علم ہو اور دل متاثر ہو تو مکان چھوڑ دیں

اگر دل متاثر نہ ہو تو ڈٹ کر رہیں یا صلحِ کل پالیسی رکھیں اور آیات کے ساتھ لپٹے رہیں۔ انشاء اللہ کچھ نہ ہوگا۔ ارادہ و تخیّل کی کمزوری کی وجہ سے اکثر خیالی صورتیں بھی نظر آتی ہیں جن میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ تمیز ضروری ہے۔

۲۸۔ باطن میں جلال کی جنگ

جب ہم عالمِ اسلام کے اجتماعی یا انفرادی مقاصد کے لیئے جلالی آیات کا وِرد کرتے ہیں تو باطن میں شیطانی قوتوں کو اعلانِ جنگ ہو جاتا ہے۔ اور وہ باطن میں حملے شروع کر دیتے ہیں جو خواب وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جسے قلب محسوس کرتا ہے۔ بعض وقت وہ مغلوب ہوتے ہیں۔ اور بعض وقت سنبھالنے والی قوت نہ ہو تو ہم مغلوب ہو سکتے ہیں۔ اگر اسلحہ زوردار، ہم تربیت یافتہ، اعضا (دل، دماغ، جسم) اچھے ہوں اور اُستاد بھی خطرے کے موقع پر فوراً مدد کرے تو کامیابی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے بغیر اجازت جلالی وظائف نہ پڑھنا چاہیئے۔ بتانے والے کو بھی بروقت مدد کرنی پڑتی ہے۔ بروقت متوجہ ہونے پر حضورِ انورؐ، حضرت علیؓ اور حضرت غوثِ اعظمؓ مدد فرماتے ہیں۔ جن وغیرہ کے حملوں سے ہمیں یہیں پناہ ملتی ہے۔ ایک جرمن محقق نے نفسی تحقیق کی کتاب میں لکھا ہے۔ کتنا ہی اچھا عامل ہو خطرناک موقعوں پر اُسے کسی کی نسبت (اعلیٰ روحانی ربط) بچا لیتی ہے۔ یہی اسلامی اصول ہے۔ قرآن کے لحاظ سے بھی شیاطین توحید سے بھاگتے ہیں۔ فَاِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحْدَہُ اشْمَأَزَّتْ الآیۃ یا نسبت قوی ہو تو قریب نہیں آتے۔

بعض وقت عالمِ مثال کے مقابلے ختم ہو جاتے ہیں اور جنگ عالمِ شہادت میں شروع ہوتی ہے۔ تلواریں کھنچ جاتی ہیں۔ جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ بفضلہ نسبت ٹھیک ہو اور منشائے الٰہی ہو تو کامیابی ہو جاتی ہے۔ ابھی چار پانچ روز

قبل مجھے عالمِ شہادت کی جنگ میں بفضلہ کامیابی ہوئی۔ اور نئی زندگی حاصل ہے
ہوئی ورنہ ختم ہونا یقینی تھا۔ میری زندگی میں اس قسم کا دسواں گیارہواں واقعہ
عاملین و عوام میں ایک غلط فہمی یہ رہتی ہے کہ جب ہم اللہ کے لئے پڑھتے
ہیں تو ہماری حفاظت و نصرت ضروری ہے۔ یہ تصوّر غلط ہے۔ اُصولاً عبد کو
بے ارادہ، بے مطالبہ ہونا چاہیئے۔ شہادت تک مطلوب نہ رہے کام میں لگے رہیں
اللہ غازی بنائیگا یا شہید۔ یَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِیَاءَ بِغَیْرِ حَقٍّ (۱۲/۳) کے بعد
کیا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

۲۹۔ عاملین کے خطرات

عاملین چونکہ جنّات و شیاطین کو سزا دیا
کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی وفات کے
بعد جن و شیاطین ان کی اولاد سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ستاتے ہیں۔
علاوہ ازیں وفات کے بعد اُس عالم میں بھی عاملین سے خوب مقابلے چلتے ہیں۔
اللہ رحم فرمائے۔ سیدھے سادھے نماز، روزے والوں سے یہ چھیڑ چھاڑ نہیں
کرتے۔ اِلّا ماشاءَ اللہ۔ اولاد والوں کو عملیات سے بچنا چاہیئے۔
کاملین چونکہ مامور ہوتے ہیں اس لئے محفوظ رہتے ہیں۔ ورنہ مبتدی، متوسط
دونوں نقصان اٹھاتے ہیں۔

۳۰۔ غیب و شہادت کا علم

بعض دفعہ بیماری موجود ہوتی ہے
لیکن حکیم ڈاکٹر فنی تشخیص کر کے کہتے
ہیں کہ بیماری چلی گئی۔ ہر مرتبہ میں غلطی کا امکان باقی رہتا ہے۔ قطعیت کا علم سوائے
اللہ کے کسی کو نہیں ہو سکتا۔ انبیاء سے لیکر عوام تک یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (۱/۲)
میں رہتے ہیں۔ لاکھ شہادت ہو جسم اور بال تک کی شہادت میں کئی غیب داخل ہیں۔ آج تک کوئی
شخص ایک بال کا علم بھی قطعیت کے ساتھ نہ دے سکا تو جن بھوت کا علم کیا دے گا جو غیبی مخلوق ہے

فصل ہشتم

اصلاحِ مُعاشرت

۱۔ معاشیات و اصلاحِ مُعاشرت

(عنوانات ۱ تا ۱۶)

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ، جشن پنجاہ سالہ منعقدہ
مارچ ۱۹۳۷ء میں حضرت نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا جس کا اقتباس حسبِ ذیل ہے
حضرات! الحمد للہ کہ اس تاریخی موقع پر مجھ کو شعبۂ معاشیات و اصلاحِ

۱۔ آثارِ عشق

معاشرت کی جو صدارت عطا ہوئی، یہ بڑی قدردانی ہے۔ میں
تہہ دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس کو ملک و ملت کی خدمت کے وسیع موقعے عطا فرمائے۔ (آمین)
سب کو معلوم ہے کہ سر سیّد احمد خانؒ نے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی
بنیاد رکھی (اور ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قایم کی) جو ۱۹۲۰ء
میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بن گیا۔ یہ کارنامہ تاریخِ ہند اور تاریخِ اسلام میں یادگار رہیگا
اس کارنامہ کی باطنی قوت کیا تھی۔ ملک و ملت کی محبت، قومی غیرت، دینی حمیت، اور اس
کے لوازم، ذاتی ایثار، ذاتی انہماک، اور ذاتی استقامت تھے۔ اور یہ سب کرشمے ہیں
حضرتِ عشق کے، جن کے مظاہر سے کائنات، کائنات بنی ہے۔ بقول میر تقی میرؔ ؎

اوّل آخر ظاہر باطن چاروں اور بھرا ہے عشق
ہم ہیں جنابِ عشق کے بندے نزدیک اپنے خدا ہے عشق

یہی عشق، یہی محبت، یہی لگن، یہی دھن۔ جب اعلیٰ رُخ پر آتی ہے تو نفسانیت کی کثافت مٹا کر انسانیت کے جوہر دکھاتی ہے۔ یہی عشق جب افراد سے گذر کر جماعت کی طرف رُخ کرتا ہے تو قومی ترقی کی روحِ رواں بن جاتا ہے۔ اگر یہ ہو اور کچھ نہ ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور اگر سب کچھ ہو اور یہ نہ ہو پھر کچھ بھی نہیں۔ روح آتی ہے تو جسم ساتھ لاتی ہے۔ جاتی ہے تو مُردہ جسم چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی بڑے سے بڑے ادارے کی روح نکل جائے تو خود غرضی، بے وفائی اور نفاق کے جراثیم اس جسم میں اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ تاریخ عالم میں بقا و فنا کے سلسلہ میں یہی قانون کارفرما نظر آتا ہے۔

۲- قانونِ بقا

پھر بقا میں بھی دو حالت ممکن ہیں۔ صحت اور علالت۔ اور پھر علالت کی بھی دو شکلیں ہیں۔ عضوی اور فعلی یعنی آرگینک اور فنکشنل۔ عضوی مرض زیادہ سخت مانے جاتے ہیں کہ وہ کسی عضو کے نقص سے پیدا ہوتے ہیں اور خود عضو کی اصلاح دُشوار ہوتی ہے۔ اِن کے مقابل فعلی امراض کا علاج نسبتاً کم دشوار ہوتا ہے۔ خود عضو میں تو کوئی نقص نہیں ہوتا۔ صرف اس کا فعل خراب ہو جاتا ہے۔ اور فعل کی اصلاح چنداں دشوار نہیں۔ یہی کیفیت اداروں کی بھی سمجھنا چاہیئے۔ کبھی تو خود کارکن جماعتیں ناقص اور ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی طریقۂ کار میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بہر صورت اصلاح و ترمیم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ قدرتی اشخاص کے جسم میں تو کسی عضو کا ردوبدل دشوار بلکہ تقریباً محال ہے۔ مثلاً کسی جسم میں ناقص آنکھ یا دل بدلنا۔ لیکن قانونی شخصیتوں کو لیجیئے اور سب باضابطہ ادارے قانونی شخصیتیں مانے جاتے ہیں۔ تو ان کے اجسام میں اعضاء کا ردّوبدل فی الجملہ آسان ہے۔ رہا طریقِ کار سو اس کی اصلاح و ترمیم تو کوئی بات ہی نہیں۔ قوانین و ضوابط میں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اِن داخلی کے سوا کچھ خارجی اسباب بھی توجہ کے طالب ہیں۔ خاص کر معاش اور آب و ہوا۔ معاش بقدرِ ضرورت میسر ہو۔ اور اس سے بطریقِ مناسب کام لیا جائے تو صحت و قوت قائم رہتی ہے۔ بلکہ ترقی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ اچھی آب و ہوا بھی ضروری ہے۔ اچھی آب و ہوا ہو تو بیمار تندرست ہوتے ہیں۔ خراب آب و ہوا ہو تو اچھے آدمی بیمار پڑ جاتے ہیں۔ جامعہ ہو یا کانفرنس۔ اِن کی آمدنی کافی۔ مصارف معقول ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اِن اِداروں میں اخلاق و عادات، خیالات و جذبات، معقولات و روایات، مشاغل و معمولات ایسے ہوں کہ ادارہ ترقی کرے۔ مختصر یہ کہ انسانی اداروں کی حالت زندہ اجسام کی سی ہے۔ یہ پیدا ہوتے ہیں۔ مرتے ہیں۔ تندرست رہتے ہیں۔ بیمار پڑتے ہیں۔ پھلتے پھولتے ہیں۔ عمرِ طبعی پاتے ہیں یا قبل ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ بغداد و قرطبہ۔ نلندا اور ٹیکسلا کے کارنامے تو ہنوز مسلّم ہیں۔ آج برطانیہ کو آکسفورڈ اور کیمبرج پر جو ناز ہے وہ ہاؤس آف کامنس اور ہاؤس آف لارڈس سے کم نہیں۔ اِن کا فیضان حکومت، سیاست، معاشیات، صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن میں نمایاں ہے۔

اغراض و مقاصد کے اعتبار سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلم یونیورسٹی کی دمساز ہے۔ بعض لوگوں کا شاید خیال ہو کہ اب اس دمسازی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اگر تعلیم کی انتہا ہو چکی۔ اگر بیداری کی انتہا ہو چکی ہے۔ اگر ترقی کی انتہا ہو چکی۔ اور اگر واقعی ان چیزوں کی انتہا ہو سکتی ہے تو ممکن ہے کانفرنس کا کام بھی ختم ہو گیا ہو یا ختم ہو سکے۔ لیکن اگر ابتداء کو انتہا سمجھ لیں۔ اگر پہلے قدم کو منزل بنا لیں تو انجام معلوم۔ اگر قوم کو کام کرنا ہے تو یونیورسٹی کے علاوہ ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی ضرورت ہے۔

۳- انسانیت

تمدن، معاش و معاشرت انسان کی سرشت میں داخل ہے،

ان ہی جھمیلوں میں پڑکر انسان بنتا ہے۔ بے تعلقی و گوشہ نشینی۔ ریاضت و عبادت۔ یہ بھی بڑے کام ہیں۔ روحانی ترقی کے مقام ہیں۔ لیکن ان سے ملکوتی صفات ابھرتے ہیں۔ انسانی کمالات نمودار نہیں ہوتے۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

رہبانیت میں انسان دنیوی حقوق و فرائض سے گھبراتا ہے اور پرسکون عبادت کی محویت چاہتا ہے۔ حالانکہ انسان کی دنیوی زندگی حقوق و فرائض سے لبریز ہے۔ رہبانیت میں بھی نفس چاہے تو اپنی راحت و تقویت کے سامان پیدا کرسکتا ہے۔ چنانچہ بہتوں نے اسے ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق بنالیا۔ گرچہ عبادت کا فیضان ولزوم مسلّم ہے۔ تاہم بعض نے رہبانیت کے خوف سے انسانیت کے پہلو کو اس درجہ مقدّم رکھا کہ گویا عبادت کو بھی اس میں ضم کر دیا۔

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

بہرحال انسان مدنی الطبع مخلوق ہے۔ مل جل کر رہنا اس کی فطرت میں داخل ہے میل جول سے حقوق و فرائض کے بے شمار تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ تعلقات بخوبی سنبھالے جائیں تو ترقی ہی ترقی ہے۔ اور اگر ان تعلقات میں فتور پڑ جائے تو تباہی افراد و قوم پر آتی ہے۔

۴۔ اِجتماع و تعاون انسان کو بحیثیت فرد دیکھو تو بہت کمزور نظر آتا ہے۔ ادنیٰ جانوروں کا دوڑ، اڑان، پیراکی میں مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لیکن جب تعاون سے اور دل و دماغ سے کام کرتا ہے تو کوئی اس کا مخلوقات میں مقابلہ نہیں کرسکتا۔ خالق کے سوا کوئی نہیں جس کے سامنے یہ سر جھکائے۔ پھر وہی عاجز کا عاجز بندہ کا بندہ۔

خلاصہ یہ کہ انسان کی ترقی اجتماع و تعاون میں مضمر ہے۔ تن تنہا انسان انفرادی طور پر ادنیٰ وحشیانہ زندگی کی ضروریات مہیا نہیں کرسکتا لیکن اجتماع و

تعاون کی برکت سے اعلیٰ تمدّن کے سامان مہیّا کر رہا ہے کہ عقل حیران ہے۔

چنانچہ دورِ جدید کے دو ہی بڑے امتیازات ہیں۔ ایک تو وسیع پیمانہ پر انسان کا اجتماع و تعاون۔ دوسرے تمدّن کی ترقی اور لوازم تمدن کی فراوانی و ارزانی۔ جو تکلفات کبھی امیروں کو نصیب نہ تھے وہ آج غریبوں کی ضروریات شمار ہوتے ہیں۔

۵۔ زمان و مکان پر تصرّف زمان و مکان ہی دو اعتبار ہیں جو انسان کے تعلقات میں بُعد و فصل پیدا کرتے ہیں۔

سُرعتِ رفتار سے مکان اس درجہ قابو میں آگیا ہے کہ دنیا کے ممالک عنقریب قدیم بڑے شہر کے محلے معلوم ہونگے۔ بات چیت کے لحاظ سے تو دنیا کے ممالک بذریعہ ریڈیو، ٹیلی ویژن ایک مکان کے کمرے معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ عجب نہیں کہ عنقریب ایک ہی دیوان خانہ بن جائیں۔ صرف ہاتھ ملانے کی کسر رہ جائے اور شاید وہ بھی کبھی پوری ہو جائے۔ مکان سے بڑھکر زمان پر تصرف بڑھ رہا ہے۔ برسوں کے کام منٹوں میں بمقدار کثیر انجام پاتے ہیں۔ اگر کام کی انجام دہی کے اعتبار سے ہماری عمر کا حساب لگایا جائے تو آج کل کام کرنے والوں کی عمریں پہلے لوگوں کی عمروں سے ہزار درجے بڑی ثابت ہونگی۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ آج کل مادّی پہلو غالب ہے۔ اخلاقی و روحانی پہلو مغلوب ہے۔ جس سے توازن بگڑ رہا ہے۔ اور عدمِ توازن حد سے گذرا تو پھر تمدّن کی خیر نہیں۔

۶۔ علومِ عمرانی میں تمیز معاشیات و معاشرت کے علمی اعتبارات و تعلقات اول عام فہم کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ زیرِ بحث مسائل بہتر سمجھ میں آئیں۔ انسان کی زندگی میں اجتماع و تعاون کی بدولت بیشمار گوناگوں تعلقات وسیع پیمانے پر پیدا ہو گئے اور بہت پیچیدہ ہو گئے۔ اس لئے ضروریات تمدّن کی بدولت چند علوم باقاعدہ مرتب

ہو گئے جو انسان کے تعلقات سے بحث کرتے ہیں۔ اور سوشیل سائنس یا عمرانی علوم کہلاتے ہیں۔ گرچہ متمدن زندگی میں انسانی تعلقات اس درجہ ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں کہ ان کو جدا کرنا محال ہے۔ تاہم ان میں تمیز کر سکتے ہیں۔ ایسی ہی مثال ہے کہ زمان و مکان، نور، حرارت، ہوا، آواز یہ سب یکجا ملے جلے رہتے ہیں۔ پھر بھی تمیز میں آتے ہیں مثلاً کسی کمرہ میں بیٹھ کر ہم دیکھتے ہیں کہ بارہ بجے ہیں۔ کمرہ وسیع، روشن، گرم ہے۔ ہوا چل رہی ہے۔ آواز آرہی ہے۔ یہی حال انسان کے تمدنی تعلقات کا ہے کہ یکجا موجود اور جدا ملحوظ رہتے ہیں مثلاً حصولِ معاش کے ضمن میں جو گوناگوں تعلقات پیدا ہوں وہ معاشی تعلقات کہلاتے ہیں جن سے علمِ معاشیات بحث کرتا ہے۔ بنک اور بازار میں ان تعلقات کا خاص مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح علمِ سیاسیات، حاکم، محکوم اور حکومتوں کے درمیان تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ پارلیمنٹ، سنیٹ، کونسل اور اسمبلی میں اس کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ علمِ قانون انسانوں کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے۔ سرکاری عدالتوں میں اس کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ اور وہی تعلقات سوسائٹی کے زیرِ نگرانی اخلاقی تعلقات کہلاتے ہیں۔ علمِ اخلاق ان ہی تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ اور برادری کی پنچایتوں میں اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہی تعلقات ایک اعلیٰ ہستی یعنی خالق کے زیرِ نگرانی دینی تعلقات کہلاتے ہیں۔ مسجد، مندر، گرجا، اس کے مظاہرے ہیں۔ ان سب تعلقات کے سوا جو رہے سہے معاشرتی تعلقات پیدا ہوتے ہیں وہ عمرانی تعلقات کہلاتے ہیں۔ گھروں میں ان کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس طرح معاشیات، سیاسیات، قانون، اخلاقیات، دینیات اور عمرانیات متعدد علوم عمرانی قرار پائے۔ آج کل ان میں بھی بالخصوص معاشیات اور سیاسیات بہت فروغ پا رہے ہیں کہ یہی بجلی کے دو مثبت و منفی رَو یعنے کرنٹ ہیں جو مل جل کر جدید تمدن کی مشین چلاتے ہیں۔ اور مادی علوم ریاضی، طبعیات و کیمیا وغیرہ ان ہی دو علوم کی

فرمائشات کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ سچ پوچھو تو سیاسیات بھی معاشیات کے اشارہ پر چلتی ہے۔

۷۔ حقوق و فرائض کی بے اعتدالی

جس طرح علوم طب کی مدد سے جسم انسان کے امراض کی تشخیص کی جاتی ہے، علومِ عمرانی کی مدد سے تمدن کی خرابیوں کی بھی تشخیص و اصلاح کرنی ضرور ہے۔ جس بندش نے تمدن کو کس رکھا ہے وہ حقوق و فرائض کا تعلق ہے۔ اگر یہ بندش ڈھیلی پڑ جائے تو تمدن میں بھی لازماً ڈھیل پڑ جائے گی۔ اور اگر یہ بندش ٹوٹ جائے تو تمدن کی پراگندگی لازم ہے۔ ہر حق کا دوسرا رُخ فرض ہوتا ہے۔ اور ہر فرض کا دوسرا رُخ حق۔ یہ دونوں رُخ لازم و ملزوم ہیں۔ حقوق و فرائض کے متعلق عہدِ جدید کا مسلک قابلِ غور ہے۔ اول تو بالعموم حقوق و فرائض کے آثار و ثمرات چند روزہ زندگی تک محدود قرار دیئے گئے جس سے اُن کی اہمیت کم ہو گئی۔ دوسرے ان کی نگرانی بھی انسانی عدالتوں تک محدود کر دی گئی جس سے گریز کی کافی گنجائش نکل آئی۔ تیسرے حقوق کے مطالبہ کو مقدم رکھا گیا اور فرائض کی تعمیل کو مؤخر جس سے لازماً کشمکش بڑھ گئی۔ حالانکہ اگر فرائض کی تعمیل کو مقدم کر دیا جائے تو حقوق کی تکمیل خود بخود ہو جائے۔ چوتھے حقوق قوی جماعتوں کے اجارے میں آ گئے اور فرائض کمزور جماعتوں کے گلے پڑے۔ حالانکہ فلاحِ تمدن کے لئے اس کی تقسیم برعکس ہونی چاہیئے یعنی کمزور جماعتوں کی طرف حقوق کا پلّہ بھاری رہے اور قوی جماعتیں فرائض کا بار اپنی طرف زیادہ رکھیں تاکہ تمدن میں صحیح توازن قائم رہے۔ موجودہ تمدن میں انتشار کی وجہ یہی حقوق و فرائض کی بے اعتدالی ہے۔

۸۔ اصلاحِ معاشیات و معاشرت

سب انسان مہد سے لے کر لحد تک بلکہ مہد کے

قبل اور لحد کے بعد بھی معاشی تعلقات میں بندھے ہوئے ہیں۔ بزرگوں کے دم سے تو بوجہ نیاز نذر وغیرہ، زیارت گاہیں معاشی تعلقات کا مرکز بن جاتی ہیں۔ بہر حال تمدنی تعلقات میں معاشی تعلقات کو بہت وسعت، عمومیت اور لزوم حاصل ہے۔ حتیٰ کہ تارک الدنیا جوگی بھی کھانے، پینے، روشنی، ستر پوشی کی حد تک لامحالہ معاشی تعلقات سے کام لیتا ہے۔ جدید تمدن کا نصب العین تو معاشی ترقی ہی ہے۔ نت نئے ضروریات تجویز کرنا، اُن کے لئے نت نئے سامان ایجاد کرنا۔ گویا راحت و آسائش کے ساز و سامان سے دنیا کو جنت بنا دینا لیکن چونکہ فی الحقیقت مسرت و اطمینان کا منبع باطن میں ہے۔ باہمہ ساز و سامان مسرت و اطمینان کا فقدان ہے عقل حیران و دل پریشان ہے

معاشیات کے تحت اصلاح معاشرت مقصود ہو تو ایک ہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آمدنی و خرچ میں کیا تناسب کس طرح قائم کیا جائے کہ زندگی ایمانداری اور خود داری سے بسر ہو۔ اصل اصول تو سب کو معلوم ہے کہ آمدنی خرچ سے بڑھی رہے۔ اگر خرچ بڑھانے کی خواہش ہو تو آمدنی بڑھانے کا حوصلہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ کمتر خرچ پر قانع رہنا چاہیئے۔

۹۔ مدّاتِ آمدنی آمدنی کے چار مدّات ہیں۔ اول سب سے بہتر معاشی کمائی ہے۔ جس کی تین شکلیں ہیں۔ زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت (اُجرت اور ملازمت کی سب میں مشارکت رہتی ہے) آمدنی کی دوسری مد چوری، غبن، رشوت خواہ دوستانہ تحفوں کی مہذب شکل میں وصول کی جائے اور قرض جس کا مقصد ادائی نہ ہو۔ تیسری مد بھیک، خیرات، جس میں کافی حد تک قومی چندے اور مذہبی نذریں داخل ہو سکتی ہیں۔ چوتھی مد دستِ غیب سمجھی جاتی ہے لیکن وہ غیب ہی کیا جس کا پتہ چل جائے۔

۱۰۔ پیشے اور عزت ملک کی تین چوتھائی آبادی زراعت پر گذر کر رہی ہے۔

خستہ حال ہے۔ اصلاح کی کوشش ہے۔ ممکن ہے کچھ سدھر جائے۔ کاشت کار، زمیندار، ساہوکار اور سرکار میں جو گڑا پیچ پڑا ہوا ہے۔ اس کشمکش میں زمیندار کی حالت روز بروز نازک تر ہوتی جا رہی ہے۔ ساہوکار کی بھی روک ٹوک ہو رہی ہے لیکن لین دین جاری رہیگا۔ کاشت کار کا ایک ہاتھ سرکار کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا ہاتھ سیاسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے۔ کمائی کا دوسرا ذریعہ صنعت و حرفت ہے۔ کارخانوں کی وجہ سے گھریلو صنعتیں پامال ہو گئیں۔ مروجہ پیشوں میں اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے۔ مثلاً سنگ تراش، معمار، بڑھائی، لوہار، رنگ ریز، درزی، دھوبی، سُنار، حجام، موچی، باورچی۔ یہ سب بالعموم جاہل ہیں۔ یہ سب پیشے رسماً ذلیل سمجھے جاتے ہیں۔ ہندو تعلیم کے زیر اثر پیشے ذات شمار ہوتے ہیں۔ لیکن اسلامی تعلیم نے حلال و حرام کا معیار قرار دے کر اکلِ حلال کو باعثِ عزت اور اکلِ حرام کو باعثِ ذلت قرار دیا۔ پیشہ کا ذات سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ تعظیم و تکریم کا مدار تقویٰ پر رکھا۔ جس سے مراد علمِ صحیح اور عملِ صالح کا اجتماع ہے۔ غرض کہ عام مفید پیشوں سے جو ذلت وابستہ ہو گئی تھی۔ اسلام نے اس کو رفع کر دیا۔ چنانچہ بزرگانِ دین نے مختلف پیشے اختیار کر کے عملی طور پر پیشوں کی توقیر قائم کی۔ اور بنی نوعِ انسان کے لئے حصولِ معاش کے ذریعے پاک اور وسیع کر دئیے۔

مسلمانوں کے میل ملاپ سے ہندوؤں میں ذات، پات اور پیشوں کی بندشیں ڈھیلی پڑ گئیں لیکن مسلمانوں میں نئے سرے سے داخل ہو گئیں۔ تنگدستی گوارا لیکن پیشے اختیار کرتے جھجکتے ہیں۔ غرض مسلمان شریف نوجوان پیشوں میں لگ جائیں۔ ذات بگڑنے کا خوف دل میں نہ لائیں۔ ملازمت کا دائرہ محدود ہے۔ پھر بھی حکومت میں ان کی شرکت بہر صورت ضروری ہے۔ کام سلیقہ سے کریں تو معمار، بڑھائی، دھوبی، حجام، موچی بھی گریجویٹ سے بڑھ کر کما سکتے ہیں۔ تجارت اتنی آسان نہیں جتنی

ناتجربہ کاری سے سمجھی جاتی ہے۔ سرمایہ کے علاوہ اس میں وسیع معلومات اور کثیر تجربہ کی ضرورت ہے۔ پھر بھی موجودہ حالات میں ایجنسی اور خردہ فروش تجارت میں تعلیم یافتہ نوجوان اپنی جگہ نکال سکتے ہیں۔

۱۱۔ مسئلہ سود

آمدنی کے ان معاشی ذرائع کے ساتھ رقمی لین دین بھی کاروبار کی ایک خاص صورت ہے۔ عہدِ جدید میں اسے اتنا فروغ ہوا ہے کہ اس کے بغیر کوئی معاشی کاروبار (تجارت، صنعت، زراعت) چلنا محال ہے۔ رقم لینے دینے کے دو طریقے ہیں۔ ایک شرکت۔ دوسرے قرضہ۔ شرکت میں بشرطِ گنجائش غیر معین منافع ملتا ہے۔ قرضہ کی صورت میں لازماً معیّنہ سود ملتا ہے۔ فقہِ اسلام کی رو سے منافع تو ہر طرح جائز ہے۔ البتہ سود میں کلام ہے۔ بڑی جماعت اس کو ربٰوا کے تحت ناجائز قرار دیتی ہے اور چھوٹی جماعت اس کو ربٰوا سے خارج سمجھ کر جائز قرار دینا چاہتی ہے۔ بلکہ داخل مان کر بھی جواز کا فتویٰ دیتی ہے۔ بہرحال سود کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔ اور اکثریت اس کے جواز کے خلاف ہے۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ شرعاً تو سود لینا اور سود دینا دونوں ناجائز قرار دیے جاتے ہیں۔ لیکن تمام تر زور سود نہ لینے پر دیا جاتا ہے۔ سود دینے کی ذرا بھی روک ٹوک نہیں ہے چنانچہ مسلمان سود پر قرض لیتے اور سود دیتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ مسلمان کہیں سود لے بیٹھیں تو مطعون کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ بینکوں میں مسلمان لاکھوں روپیہ سود چھوڑ دیتے ہیں۔ جو بالعموم عیسائی مشنیوں کی تبلیغ میں صرف کیا جاتا ہے۔ اگر یہ عذر کیا جائے کہ قرض دینا حالتِ اختیاری ہے۔ اور قرض لینا حالتِ مجبوری۔ تو اول تو سب قرض بحالتِ مجبوری نہیں لیے جاتے بلکہ اکثر بغرضِ منفعت لیے جاتے ہیں۔ دوم شرع شریف کی تعمیل مقصود ہو تو قرضِ حسنہ کا اہتمام بھی ممکن ہے اور اگر پہلے سے سود کی شرط نہ لگائی جائے تو قرض گیر قرضِ حسنہ کی صورت میں بطور

شکر گذاری اپنی خوشی سے بقدرِ مناسب زائد[1] رقم ادا کر سکتا ہے۔ اور اس طرح رقمی لین دین کی آسان صورت نکل سکتی ہے۔ بہرحال سود کا مسئلہ جلد علمائے دین حل کریں[2] تو مناسب ہے کہ آیا بنک کے کاروباری سود پر ربٰوا کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں۔ ربٰوا اسلام میں صریحاً حرام ہے

---

۱ طبقات ابن سعد میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص سے دو ہزار درہم قرضِ حسنہ لئے۔ واپسی کے وقت دو سو درہم زیادہ دیئے۔ قرض دہندہ نے پس و پیش کیا تو فرمایا۔ یہ تمہارے لئے ہیں۔ (اسوۂ صحابہ جلد اول ص۲۶۹ مرتبہ عبدالسلام ندوی صاحب)

۲ اس سلسلہ میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی سابق صدرِ شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی نے امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے مسلک و اجتہاد کی روشنی میں حسبِ ذیل حل پیش فرمایا ہے۔ (للمؤلف حلیم) ملاحظہ ہو: اسلامی معاشیات۔ از مولانا مناظر احسنؒ طبع اول ص۳۲۲ تا ۳۲۶

”غیر اسلامی حکومتوں کی رعایا کے ساتھ مسلمانوں کے معاشی تعلقات“

(۱)۔ غیر اسلامی ممالک میں سود، قمار وغیرہ کا حکم

غیر اسلامی حکومت کے کسی غیر مسلم باشندے کا روپیہ کسی ایسے ذریعہ سے جو اسلامی قانون کی رو سے لین دین کا قانونی اور شرعی ذریعہ نہیں ہے مثلاً ربٰوا (سود) یا قمار (جوا) یا اسی قبیل کسی غیر شرعی ذریعہ سے کسی مسلمان کے قبضہ میں آجائے تو کیا قانوناً یہ مسلمان اس کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں۔

چونکہ یہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ ہے۔ اور مباح اور جائز مال کے مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے...... اسی لئے امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے کہ اس قسم کے اموال کا مسلمان قانونی طور پر مالک ہو جاتا ہے۔ اور یہی ان کا وہ مشہور نقطۂ نظر ہے جس کی وجہ سے حنفی فقہ کی عام کتابوں میں

خالص علمی نقطۂ نظر سے بھی علمِ معاشیات میں سود کے جواز کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک جماعت مفید جائز سمجھتی ہے تو دوسری ناجائز مُضر قرار دیتی ہے۔ اور منافع کو دونوں سود پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن آج کل سود لابد و ناگزیر ہے۔ اور اس سے نجات دشوار نظر آتی ہے۔

لا رِبوٰا بَینَ الحَربِی (غیر اسلامی حکومت کا باشندہ) وَالمُسلِمِ اور اَلمُسلِم (یعنی اسلامی حکومت کا باشندہ) میں رِبوٰا (سود) نہیں ہے۔ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ گویا یہ بین الاقوامی قانون کی ایک دفعہ ہے۔ عوام چونکہ اس کے اصل منشا سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے اُن کو حیرت ہوتی ہے کہ رِبوٰا (سود) جب اسلام میں حرام ہے تو ہر جگہ ہر شخص سے لینا حرام ہونا چاہیئے حربی یعنی غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ اس کے جائز ہونے کے کیا معنی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ حربی کے ساتھ یہ معاملہ رِبوٰا کا معاملہ ہی نہیں ہے۔

(ب) ہندوستان میں مسئلہ رِبوٰا کا حکم

اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جہاں اس وقت اسلامی حکومت قائم نہیں ہے۔ یہاں کے غیر مسلم باشندوں سے بعض حنفی علماء سودی کاروبار کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں جس میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت شاہ عبدالعزیز مُحدّث دہلویؒ کی ہے۔ شاہ صاحب کے فتاویٰ عزیزیہ میں یہ فتویٰ ایک سے زائد مقام میں موجود ہے۔ یہاں یہ بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ شاہ صاحب نے یہ فتوے اُس وقت صادر کئے تھے۔ جب لال قلعہ میں تیموری (مغل) سلاطین نام نہاد شاہِ ہند کے نام سے موجود تھے لیکن عملاً چونکہ ان کی حکومت ختم ہو چکی تھی اس لئے شاہ صاحب نے حنفی فقہ کے اس معاشی مسئلہ کا عام اعلان سرزمینِ ہند میں کر دیا تھا۔

"رِبوٰ کے معنی مطلب میں بعض لوگوں کو کلام ہے۔ اور اس کا تصفیہ علماء کا کام ہے۔ قدیم تصفیہ تو یہی ہے کہ سود ہر شکل میں حرام ہے ۔۔۔۔۔۔" موجودہ کاروباری شکلیں قدیم زمانہ میں نامعلوم تھیں۔ اس لئے بعض لوگ قومی ہمدردی کے خیال سے کوشاں ہیں کہ مُروجہ سود کے جواز کی کوئی شرعی شکل نکل آئے۔ ورنہ مسلمان لین دین اور بینکوں سے الگ رہیں تو بُرا ہے۔ اور اگر عمداً خلافِ شریعت سود خواری کریں تو بھی بُرا۔ اور فی الحال جو سود دے کر تباہ ہو رہے ہیں وہ سب سے بُرا۔" (مراۃ المجید جلد دوم ص ۲۷ البرقی)

بعض غیر قانونی دماغوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر اس جواز کی بناء اس پر ہے کہ غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کا مال مسلمانوں کے لئے مباح ہے تو پھر اس ملک میں فریب، چوری ڈاکہ وغیرہ جو شرعاً لین دین کے ناجائز ذرائع ہیں کیا ان ذرائع سے بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کا مال لینا جائز ہوگا۔ جہاں یہ مسئلہ فقہ حنفی میں لکھا گیا ہے وہیں دوسرا فقرہ "مِنْ غَیْرِ غَدَرٍ" (یعنے خلافِ معاہدہ لین دین نہ ہو) کی قید بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں جو حکومت قائم ہے۔ اس کے قانون میں فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ کے ذریعہ سے لین دین کو ناجائز ٹھیرایا گیا ہے۔ اور اس ملک میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اس معاہدہ کے ساتھ ہی آباد ہیں کہ حکومتِ وقت کے قانون کی خلاف ورزی نہ کریں گے۔ اب اگر چوری، ڈاکہ یا فریب وغیرہ ذرائع سے ملک کے کسی باشندہ کا روپیہ کوئی لے گا تو وہ غدر (عہد شکنی) کے اسلامی جرم کا مرتکب ہوگا۔ بخلاف رِبوٰا (سود) کے کہ موجودہ حکومت نے اس ذریعہ سے لین دین کو ناجائز نہیں قرار دیا ہے۔ پس یہ حکومتِ وقت کے ساتھ غدر (عہد شکنی) نہیں ہے۔ اور بغیر کسی عہد شکنی کے

۱۲- معیارِ زندگی اور تین گروہ

کسی فرد یا خاندان یا قوم کو جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں وہ مجموعی طور پر معیارِ زندگی کہلاتی ہیں۔ اگر ضروریات قلیل اور ادنیٰ ہیں تو گویا معیارِ زندگی لیست ہے اور اگر ضروریات کثیر اور اعلیٰ ہیں تو گویا معیارِ زندگی بلند ہے اور معاشی ترقی اسی کا نام ہے۔ معیارِ زندگی کے صحیح اصول کے متعلق دو گروہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ ایک گروہ نے دُنیا ہی کو سب کچھ سمجھا، اور اسی میں غرق ہو گیا حتیٰ کہ ایمان و اخلاق کو فراموش کر دیا۔ دوسرے گروہ نے جوگ و رہبانیت کو اختیار کیا، اور دین و عقبیٰ کی خاطر ترکِ دنیا کو لازم قرار دیا۔ گویا دنیا سے کنارہ کش ہو گیا۔ تیسرے گروہ نے معیارِ زندگی کے متعلق ایک اصولی مسلک پیش کیا۔ اس نے علمِ صحیح اور عملِ صالح پر زور دیا۔ اور حصولِ دنیا کی کمی بیشی کو لوگوں کے حوصلے پر چھوڑ دیا۔ گویا خوبی خرابی کا معیار علم و عمل قرار پایا۔ دنیا کی قلت و کثرت سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا۔

چیست دنیا از خدا غافل بُدن　　نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

(بسلسلہ صفحہ ۳۵۹) مسلمان کے قبضہ میں جب اس ملک کے غیر مسلم باشندے کا روپیہ آئے تو مسلمان قبضہ کے ساتھ ہی وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا یہ اتنا مستحکم قانونی نظریہ ہے کہ اس قسم کے اموال کی حرمت کی کوئی دلیل شرعی پیش کرنا مشکل ہے۔ اسی لئے ان لوگوں سے جو اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے مسلک کا انکار کرنا چاہتے ہیں، میرا مطالبہ ہے کہ قرآن و حدیث و اجماع و قیاس، الغرض کسی شرعی دلیل سے "الحربی" کے اموال کے عدمِ اباحت کا ثبوت پیش کر سکتے ہوں تو کریں۔ دوسری اصل چیز قرآن میں لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۳/۹) - (یعنے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے کے دو مختصر لفظوں میں مذکور ہے۔"

۱۳- عبدیت یعنی صحیح توازُن

چونکہ علم و عمل کا ظہور دنیوی تعلقات میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے تحصیلِ دنیا کو ترکِ دنیا پر ترجیح دی کہ علم و عمل کا کمال ظاہر ہو۔ چنانچہ انسانیت کے بہترین نمونے انبیاء اور رسول مانے جاتے ہیں۔ ان میں بادشاہ بھی ہوئے۔ وزیر بھی ہوئے۔ سپہ سالار بھی ہوئے۔ دنیا دار بھی ہوئے۔ یعنے انکے بیوی بچے تھے۔ گھر بار تھے۔ کاروبار تھے۔ اگر دنیا کو ایک دریا مانا جائے تو ان تینوں گروہ کی ایسی مثال ہے کہ ایک دریا میں کودا، مگر تیراک نہ تھا۔ ہاتھ پیر مار کر ڈوب گیا۔ دوسرا ڈوبنے کے خوف سے دریا کے کنارے بیٹھا رہا۔ تیسرے نے پیراکی کا فن سیکھا۔ اور دریا میں اُتر کر خوب کمال دکھایا۔ فی الحقیقت انسان عدمِ توازن سے ڈوبتا ہے۔ خود پانی میں ایک سنبھالنے والی قوت پوشیدہ ہے۔ توازنِ صحیح کے ساتھ جب اس سنبھال کا ربط قائم ہو جاتا ہے تو پھر ڈوبنا اتنا ہی دشوار ہو جاتا ہے جتنا کہ تیرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہی ربط سکھاتی ہے۔ الوہیت و رسالت جن کا خلاصہ کلمۂ توحید ہے۔ جب علم و عمل میں ان کا توازن قائم ہو جائے تو اس حالت کو عبدیت کہتے ہیں۔ گویا عبد دنیا کا تیراک ہے۔ اور تیرتے وقت اس کو جو دنیا میں باطنی سنبھال محسوس اور منکشف ہوتی ہے۔ وہ اصطلاحاً ربوبیت کہلاتی ہے۔ جو رب کی طرف سے آتی ہے۔

اسلام کی تعلیم کا منشاء یہی ہے کہ عبدِ مومن کے علم و عمل میں اُلوہیت و رسالت کا صحیح توازن پیدا کرے۔ رب کی ربوبیت سے اس کا ربط منکشف کر دے کہ پھر وہ بے تکلف دنیا میں تیرے، غوطے لگائے اور صحیح سالم ساحلِ مراد تک پہنچ جائے۔ چنانچہ قرآنی دعا دنیا و آخرت کی بھلائی کے لئے ہے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۹)۔ تیراکی سیکھنے کے بعد اگر کوئی کشتی میں

بیٹھ کر سفر کرے تو مضائقہ نہیں۔ بلکہ مفید ہے۔ لیکن تیراکی سیکھے بغیر کشتی میں سفر کرنا خالی از خطر نہیں۔ یہ معلوم کب اور کہاں کشتی جواب دیدے۔ اسباب سے کام ضرور لینا چاہیئے لیکن مُسبّب سے ربط معلوم کر لینا مقدم ہے کہ بہر صورت اس کی ضرورت ہے۔

مختصر یہ کہ خود معیارِ زندگی کی پستی اور بلندی میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ خوبی یا خرابی اس علم وعمل میں مضمر ہے جس کے تحت دنیا بسر کی جاتی ہے۔ اگر علم وعمل درست ہو تو بادشاہ، وزیر، افسر سب کچھ بنئے۔ اگر علم وعمل درست نہیں تو پھر جوگی، راہب، فقیر بننے سے بھی کچھ فائدہ نہیں بلکہ اُلٹا نقصان ہے۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ (۲۲)

۱۴۔ مجذوب، سالک

بعض مشہور بندگانِ دین نے ایسی زندگی بسر کی کہ گویا دنیا سے الگ رہے۔ اس معاملہ میں چند امور وضاحت طلب ہیں۔

انسانیت کا سب سے بڑا کمال نبوت ورسالت ہے۔ نبی اور رسول بقدرِ امکان خالق اور مخلوق دونوں کی طرف متوجہ رہ سکتے ہیں اور رہتے ہیں۔ نبوت ورسالت کے بعد ولایت ہے اس درجہ میں توجہ نسبتاً خالق کی طرف زیادہ رہتی ہے اور مخلوق کی طرف کم اور بہت کم۔ اگر توجہ مخلوق کی طرف سے بالکل ہٹ جائے تو وہ گویا عشقی یا توحید کا جذب ہے۔ غفلت کی حالت ولایت کے برعکس ہے۔ اس میں توجہ نسبتاً مخلوق کی طرف زیادہ رہتی ہے اور خالق کی طرف کم اور بہت کم۔ اگر توجہ خالق کی طرف سے بالکل ہٹ جائے تو وہ گویا دنیا کا جذب ہے۔ چنانچہ عشقی یا توحید کے مجذوب تو شاذ نظر آتے ہیں۔ لیکن دنیا کے مجذوبوں کی کمی نہیں۔ تہذیبِ جدید کے معیار میں یہی جذب بڑا کمال مانا جاتا ہے

غرض کہ جو بزرگانِ دین نبوت و رسالت کے مقابل، ولایت سے قوی نسبت رکھتے تھے وہ دنیا کی طرف کم ملتفت نظر آتے تھے۔ دوسرے یہ کہ گو اپنی باطنی نسبت کے تحت اپنی ذات کی حد تک وہ دنیا سے کم تعلق رکھتے تھے۔ لیکن تمام عمر دنیاداروں کی اصلاح وفلاح میں بسر کرتے تھے گویا بالواسطہ دنیا

میں مشغول تھے۔ تیسرے یہ کہ ترکِ دنیا کو اعلیٰ مقصد سمجھ کر بعد کے معتقدین نے ان بزرگوں کے حالات و معاملات کو رہبانیت کے رنگ میں پیش کرنا مفید مطلب سمجھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کی رو سے دین و دنیا میں قوی ربط و اتحاد ہے۔ ایک دوسرے کا ممد و معاون ہے۔ جو کچھ خوبی اور خرابی کی تفریق پیدا ہوتی ہے وہ علم وعمل میں مضمر ہے۔ اصلاحِ معاشرت کی بحث کے سلسلے میں زندگی کے نصب العین میں دینیات کو بڑا دخل ہے۔

۱۵۔ ضروریات کے چار درجے

بہر حال معیارِ زندگی جیسا کچھ ہو، انسان کی ضروریات چار درجوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ اوّل ضروریاتِ حیات۔ دوم ضروریاتِ کارکردگی۔ سوم ضروریاتِ راحت۔ چہارم ضروریاتِ عیش۔ ضروریاتِ حیات وہ ہیں جن کے بغیر زندگی دشوار ہے۔ مثلاً ہوا۔ روشنی۔ پانی۔ کھانا۔ ضروریاتِ کارکردگی وہ ہیں جن کے بغیر خوبی سے کام انجام دینا دشوار ہے۔ مثلاً صحت۔ قوت۔ تعلیم وتربیت۔ ضروریاتِ راحت وہ ہیں جو محنت کے بعد آرام پہنچائیں اور صحت وطبیعت کو درست رکھیں۔ مثلاً سیر تفریح۔ ضروریاتِ عیش وہ ہیں جن میں لذتِ نفس کی خاطر دولت اور وقت کو بے دریغ صرف کیا جائے۔ جیسا کہ کوتاہ اندیش امیروں کا حال ہے کہ اوّل دن عید اور رات شب برات ہے۔ پھر ہیہات ہے، ہیہات ہے۔

ہر ملک کے قدرتی حالات مثلاً موسم کی نرمی سختی۔ اور ہر قوم کے تمدنی حالات مثلاً امن بدامنی۔ کام کی کثرت وقلت۔ ان خصوصیات ہی پر ضروریات کی تقسیم کا مدار ہوتا ہے۔ مثلاً سرد ممالک میں لباس ضروریاتِ حیات میں داخل ہے۔ گرم ممالک میں یہ اہمیت نہیں۔ جنگی ممالک میں ہتھیار ضروریاتِ حیات میں شمار ہوتا ہے۔ اور پُرامن ممالک میں سیر وشکار کے لئے ضروریاتِ راحت میں داخل ہے۔ بڑے

کاروباری ممالک میں جسمانی و دماغی تکان دُور کرنے کے لئے سینما، کھیل دیکھنا ضروریاتِ راحت بلکہ ضروریاتِ کارکردگی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں بیکاروں کے لئے یہی چیز کھلی عیش پرستی ہے۔ موٹر ہی کو لیجئے۔ ترقی یافتہ ممالک میں زندگی کی جو مصروفیت ہے اور تموّل کی جو نوبت ہے اُس کے مدِّ نظر ضروریاتِ حیات نہیں تو بلا تکلف ضروریاتِ کارکردگی میں داخل ہے۔ راحت تک بھی کم نوبت آتی ہے تو عیش کا کیا ذکر ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں موٹر عیش یا کم از کم راحت میں داخل ہے۔ موٹر نشینی کی اکثر صورت یہ ہے کہ جسم موٹر پر سوار اور موٹر دل و دماغ پر سوار۔ عجب لطف ہے۔ عجب بے لطفی ہے۔ یہاں تفریحات کا شعبہ عیش کی دعوت عام ہے۔ سینما سے مغربی ممالک بڑے بڑے کام لیتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں کیا کیا نقصان ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر ملک و قوم کی ضروریات اضافی ہیں۔ یکساں آثار مطلوب ہوں تو یکساں حالات پیدا کرنا لازم ہے۔

۱۶۔ اصلاحِ رسوم | شادی غمی وغیرہ کے تباہ کن مصارف۔ رسم و رواج قابلِ ترمیم و تخفیف ہیں۔ قدیم کی طرح جدید طبقوں میں بھی تقریبات کا اسراف بڑھ رہا ہے۔ صرف شکل و محل کا فرق ہے۔ جدید ترین مہذّب تقریب کونسل و اسمبلی وغیرہ کے انتخابات ہیں۔ جن میں خلافِ قاعدہ اور خلافِ دیانت زیر باری کی حد تک زرپاشی کی جاتی ہے۔ اور ضمیر فروشی کی جاتی ہے۔ اخلاق تخریب قابلِ توجہ ہے۔ جسم کی اصلاح و ترقی کے لئے اچھی خوراک، اچھی ورزش۔ دماغ کے لئے اچھی تعلیم، اور دل کے لئے اچھی تربیت اور ان سب کی ترقیوں کے لئے اچھا ماحول، اچھی صحبت ہو۔ اس میں قانونی جبر کا موقع نہیں۔ البتہ عملی مثالوں کے ذریعہ، تحریر تقریر کے ذریعہ اصلاح کی تائید میں رائے عامہ پیدا کی جائے۔ اتفاق ہی بڑی قوت ہے۔ (خطبہ ختم ہوا)

(۲) رہبانیت | اسلام نے حقوق العباد کو مُقدّم قرار دیا۔ رہبانیت کو غیر ضروری بلکہ مضر بتایا۔ دنیا کو دین بنانا سکھایا۔ اور خود انبیاء اولیاء نے نمونہ بن کر دکھایا۔ البتہ اگر قدرۃً کسی طبیعت میں تفرید و تجرید از حد غالب ہو تو وہ خاص بات ہے۔ اس کا خاص مقام ہے۔ انبیاء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہی رنگ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رنگ سے کس قدر مختلف معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ مرتبۂ نبوت میں سب رنگ واحد ہیں۔ اور ان رنگوں کی وحدت حضرت خاتم النبیین صلعم میں ظاہر ہے۔ اولیاء اللہ میں بھی یہی کیفیت رہتی ہے۔ حضرت مخدوم علی احمد صابر کلیریؒ کی وہ شان کہ پرندہ پر نہ مار سکے۔ بس کسی کا سلام ہو جائے تو بڑی بات ہو۔ اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے دربار میں وہ دُھوم دھام کہ بادشاہِ وقت کو رشک ہو۔ اور دونوں اپنے اپنے رنگ میں کامل۔ غرض کہ قدرتی رنگ کے احکام جُدا ہیں۔ مگر تفرید و تجرید میں قدرتی رنگ نادر ہوتا ہے۔ بیشتر یہ رُجحان ماحول سے نمودار ہو کر غالب ہونا چاہتا ہے۔ بطریق تربیت عارضی غلبہ میں بھی مضایقہ نہیں۔ لیکن جب اس کو مسلک بنا کر عادت ڈالی جائے تو یہ رُجحان مضر بلکہ خطرناک ہے۔ خود افراد کے واسطے اور بالآخر قوم کے واسطے۔ دینداری کے پردہ میں جو یہ رجحان پھیلتا ہے تو بالعموم کاہلی اور تن آسانی کا کرشمہ ہوتا ہے۔ اس رُجحان کو روکنے اور دبانے کی ضرورت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس مسئلہ میں تنبیہ لکھی ہے۔

۳۔ حقوق العباد | اسلام کا خاص زور حقوق العباد پر ہے۔ اسلام انسان کو گوناگوں تعلقات کے لئے تیار کرتا ہے یہ رہبانیت و گوشہ نشینی کا مخالف ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ نہ صرف خلوت میں بلکہ جلوت میں بھی توجہ الی الحق رہے۔ اسی لئے نماز با جماعت کا اجر تنہا نماز

سے بدرجہا زیادہ ہے۔ حج و زکوٰۃ اور دیگر ارکان سے بھی یہی امر واضح ہے
اسلام چاہتا ہے کہ انسان نہ صرف اپنے فرائض ادا کرے بلکہ اپنے حقوق سے بھی
لطف اندوز ہو۔ اور معاشرتی زندگی ایسی بسر کرے جو ذمہ دارانہ اور پُرلطف
ہو۔ ساری اسلامی تعلیمات عملیت کی روح سے پُر ہیں۔ اسلام میں تصوریت
اور حقیقت پسندی کا ایسا خوشگوار امتزاج ہے کہ ہر طبقۂ خیال کے انسان کو اپیل
کرتا ہے۔ اس میں ہر ایک کے اقتضا کے اظہار و تسکین کا سامان موجود ہے۔ یہ انسانی
فطرت کی کمزوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ابدی ترقیوں کا راستہ بتاتا ہے۔
جو علم سے عمل تک اور عمل سے سکینت و اطمینان تک پہنچاتا ہے۔ جس طرح لوگ
دنیوی معاملات میں چاق اور عقلمند بننا چاہتے ہیں، اسلام چاہتا ہے کہ اسی
طرح وہ دنیوی معاملات میں دیندار بھی بن جائیں۔

حقوق اللہ (نماز وغیرہ) مختصر ہیں۔ چند منٹ سے زیادہ نہیں۔ باقی
وقت حقوق العباد میں صرف کرنا مقصود ہے جو کثیر ہیں۔ عبادتِ الٰہی کا بڑا
فائدہ یہ ہے کہ حقوق العباد کا ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے، اور اُن کی ادائی سے
رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت صدیقؓ اور حضرت عمرؓ فرض
نمازوں کے بعد حقوق العباد میں مشغول رہتے تھے۔ جن صحابہ کے بال بچے
نہ تھے مثلاً اصحابِ صُفّہ۔ وہ علمی و تبلیغی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔
اس طرح حقوق العباد کا دوسرا رُخ ادا کرتے تھے۔ اسلام نے ماں کی خدمت پر
اتنا زور دیا کہ حضورؐ نے حضرت اُویسِ قرنی جیسے عاشقِ رسولؐ کو والدہ کی
خدمت کی خاطر اپنی ملاقات سے روک دیا۔ اور اِس خدمتِ مادری کا صلہ
یہ عنایت فرمایا کہ اپنا جُبّۂ مبارک حضرت اُویس کے لئے عطا فرمایا۔
اصل میں حقوق العباد ہی انسان کا امتیازی مقام ہے۔ اِسی میں عبدیت

کی رفعت ہے۔ ورنہ ملائکہ ہر وقت ھُوَ الْبَاطِنُ میں لگے ہیں۔ انسان
کو ھُوَ الظَّاهِرُ کے حقوق ادا کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ قرآن سے یہ منشا معلوم
ہوتا ہے اور رسول اللہؐ کی سیرت گواہ ہے کہ اللہ نے انسان کو برائے نام عبادات کی
طرف لگایا ہے۔ انسان عبادات میں ملائکہ کا کیا مقابلہ کریگا جو رات دن سُبُّوحٌ
قُدُّوسٌ کر رہے ہیں۔ اِسے حوائجِ ضروری سے فرصت ہی کتنی ملتی ہے۔ دو چار
دفعہ اللہ اللہ کیا تو کیا کمال کیا۔ البتہ انسان اخلاص و ایمان کے تحت سعیٔ کسب
بال بچوں، غریبوں، یتیموں کی خدمت اور جہاد پر مکلّف ہے۔ اور یہی اس کا وہ امتیاز
و کرامت ہے، جو ملائکہ کو حاصل نہیں۔ اسی میں مومن کی بزرگی ہے۔ لیکن لوگ
اس کو بزرگی کی علامت نہیں سمجھتے۔ عبادتیں کرتے جاتے ہیں اور ظلم کرتے رہتے
ہیں۔ حالانکہ ظلم و حق تلفی کے بعد سارے اعمال تلف ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے
ھُوَ الْبَاطِن کی طرف کم رجوع کیا ہے۔ اور ھُوَ الظَّاهِر کے احکام زیادہ دیئے ہیں۔
سورۂ مزمل میں إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۔۔۔۔ وَتَبَتَّلْ
إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ملاحظہ ہو۔ یعنی اے نبیؐ تم کو دن میں بہت کام (حقوق
العباد) ادا کرنے میں کم جاگو، سو بھی جاؤ۔ جب ھُوَ الظَّاهِر سے فارغ ہو جاؤ تو ھُوَ الْبَاطِن
کی طرف رجوع کرو۔ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ الخ (٣٠/١٩) لیکن اس تعلیم کے برخلاف
دین کو بہانہ بنا کر تساہل و تغافل سے محض اپنے آرام کی خاطر بعض لوگ کسبِ حلال
و خدمتِ اہل و عیال چھوڑ کر ھُوَ الْبَاطِن کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

۴۔ **حکمران اور حکومت**

قرآن، قائد، حاکم اور حکومتی جماعت میں وہ خصوصیات دیکھنا چاہتا ہے جو بنی نوعِ انسان کی خوش
حالی اور فارغ البالی کے ضامن ہوں۔ حکمران میں کچھ ہلکا وقار و شان اور مقناطیسی
شخصیت ضروری ہیں۔ اس کو مشورت کے ذریعہ عوام کا کامل اعتماد حاصل ہونا

چاہیئے۔ اور فیصلوں اور رودادوں کی عمل آوری کے لئے پختہ مستحکم عزم ضروری ہے۔ اسی طرح حکمران جماعت میں اعلیٰ اخلاق اور اچھے ذاتی خصوصیات ہونے چاہئیں۔ خدا ترسی اور روحانی کلچر ضروری ہیں۔ ان کی حکومت باہمی مشورہ کے ذریعہ ہو اور فیاضی اور رعایا پروری ان کا شعار ہو۔ حکم ہے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۴) أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۲۵/۵)

رہا صدر حکومت کا سوال۔ وہ توارث یا امارت و دولت کی زیادتی پر مبنی نہ ہو۔ بلکہ اُسے اعلیٰ علم، کلچر اور عمدہ صحت و قوت کا مالک ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا ...... وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲/۱۶) (اللہ نے طالوت کو بادشاہ بنایا تو بنی اسرائیل نے کہا۔ اس کو حکمرانی کا حق کیسے مل سکتا ہے۔ حالانکہ ہم اس سے زیادہ مستحق ہیں۔ اس کو تو مالی وسعت بھی نہیں۔ جواب دیا۔ اللہ نے اس کو تمہارے مقابل میں منتخب کیا ہے اور علم اور جسامت میں زیادتی عطا کی ہے)

بعض مذاہب کی خصوصیات کی بناء پر عموماً مذہب کو مادی ترقیات کا مخالف سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اُن کے پیرووں کو دین داری یا دنیا داری، تقویٰ یا خوش حالی میں سے کسی ایک کو انتخاب و اختیار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اسلام اسی دنیوی زندگی کو مذہبی و روحانی ترقیوں کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ دنیا کے ساتھ اسلام کا طرز عمل جھجک اور گریز کا نہیں ہے۔ بلکہ جرأت مندانہ قبولیت کا ہے۔ علاوہ ازیں اسلام اعلیٰ زندگی کی مسرتوں اور نعمتوں کے حصول کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جس سے اکثر لوگ کم علمی و پست ہمتی کی وجہ سے محروم رہتے ہیں۔

اسلام میں بادشاہت اور قرب و ولایت میں تضاد نہیں۔ دینی آسمانی بادشاہت کے حصول کی خاطر دنیوی بادشاہت و حکومت سے دست بردار ہونا ضروری نہیں۔ اسی طرح اس کے برعکس یعنی دنیوی جاہ و حشمت و حکومت کے لئے دین سے کنارہ کشی ضروری نہیں۔ جو شخص بنی نوعِ انسان کی جس قدر زیادہ خدمت کرتا ہے اتنی ہی وہ روحانی و دینی اعتبار میں ترقیاں حاصل کرتا ہے۔ حکومت و بادشاہت سے بڑھ کر خدمات کے مواقع کہاں نصیب ہو سکتے ہیں۔ البتہ صرف ایک نکتہ ملحوظ رہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ حکومتوں کے عروج و زوال کا سلسلہ عالم میں جاری رہا ہے۔ لیکن حقیقت اپنے مقام پر قائم ہے کہ قرآن فرماتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ ...... قَدِيرٌ (۳/۲) (کہہ اے اللہ، تو ملک کا مالک ہے۔ جسے چاہتا ہے تو ملک و حکومت عطا کرتا ہے۔ جس سے چاہتا ہے تو ملک چھین لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے تو ذلیل کرتا ہے۔ تیرے ہاتھ خیر ہے اور تو ہر چیز پر قادر ہے)

۵۔ امن و نظم

حقیقی امن و نظم اس صیانت و حفاظت و سلامتی کے احساس پر موقوف ہوتا ہے، جو بہترین انصاف کے ذریعہ قائم ہو اور ترقی کرے اور وہ انصاف سچی شہادت کی رہنمائی میں عمل میں آئے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل کی معاشرتی بے چینیاں اور پریشانیاں بالواسطہ یا بلاواسطہ ناکافی، نااہل انصاف کی وجہ سے پیدا ہیں۔ جس کی گرفت گونا گوں ملحوظات کی وجہ سے ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ اسلام کے احکام اس بارے میں بہت سخت اور قطعی ہیں۔ قرآن کے لحاظ سے انصاف کے معاملہ میں کسی محبت، ہمدردی، خوف، تائید، رحم و کرم کے عمل دخل کی اجازت نہیں۔ چاہے فریقِ متعلق کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔ پھر حکم ہے کہ گواہ کو سچی شہادت دینے میں پس و

پیش نہ کرنا چاہیئے۔ وَلَا تَکْتُمُوا الشَّهَادَةَ الخ (۲/۳)۔ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ
...... هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵/۶)۔ (کسی قوم کی دشمنی یا نفرت اس کا باعث نہ بنے کہ تم ان کے ساتھ عدل و انصاف نہ کرو۔ عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے) پھر ارشاد ہے۔ اے ایمان والو۔ انصاف کے قائم رکھنے والے اور اللہ کے لئے سچی گواہی دینے والے بنو چاہے یہ شہادت تمہارے ہی خلاف پڑے یا تمہارے والدین کے یا اقرباء کے۔ چاہے فریق امیر ہو یا غریب (۵/۱۲)

لیکن پرہیز علاج سے بہتر ہوتا ہے۔ فساد کا منبع تو بددیانتی اور شر و شرارت ہے۔ یہ دونوں مومن پر حرام ہیں۔ ہمارے خوف و اُمید کا مرجع ذاتِ باری ہو۔ تاکہ ہم اس دنیا کی ترغیبات و تحریصات میں مستقل و متوازن رہیں۔ اور ہماری خیر خواہی اور نیک اندیشی کی ہمت افزائی ہو۔ حکم ہے۔ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (۸/۵۶) اَحْسِنُوْا الخ (۸/۲) یعنی ملک میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ احسان کرو۔

۶۔ جنگ و جہاد

امن کے ساتھ ساتھ ہمیشہ جنگ کا امکان لگا رہتا ہے۔ چونکہ اسلام لازمی طور پر حقیقی عملی اور اثباتی مذہب ہے۔ وہ ناگہانی واقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے مسلمانوں کے لئے فوجی ضبط کے قوانین و قواعد مرتب کئے ہیں۔ قرآن کا حکم ہے کہ مسلمان تبلیغ و اشاعتِ اسلام کریں۔ دشمنوں کے حملہ یا ظلم کی شکل میں سپاہیوں کی طرح مردانہ وار اپنی مدافعت کریں۔ اگر ممکن ہو تو جس حد تک لازمی اور ضروری ہو۔ موثر اقدام بھی کریں۔ لیکن کبھی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ارشاد ہے۔ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (۲/۱۹۳)۔ فتنہ (کسی قسم کے نسلی، وطنی، لسانی، مذہبی اختلاف

کی بناء پر ستانا) قتل سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اُن سے اس حد تک لڑو کہ فتنہ (نسلی، وطنی، لسانی، مذہبی امتیاز کی بناء پر تنگ کرنا) ختم ہو جائے اور دینِ خالص اللہ کے لئے ہو جائے۔

معاشرتی تعلقات میں اسلام ہمیشہ دوستی، خیر خیرات، عفو و کرم پر زور دیتا ہے اور ساتھ ہی انسانی فطرت کے تنوع کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اور انفرادی طبائع کا ضروری پاس لحاظ رکھتا ہے۔ اسلام اعتدال کا قائل ہے۔ وہ فطری جذبات کو فنا کرنے کی اجازت نہیں دیتا یا جذبات کو دبانے کی ہمت افزائی نہیں کرتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ حقیقت پسندی کی روشنی میں تصوریت قائم ہو۔ اور ہم محض خیالی دنیا میں نہ رہیں۔ مطلب یہ کہ زندگی کی مشکلات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو آسان بنایا جائے۔ ارشاد ہے۔ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو تو دشمن دلی دوست بن جائے گا۔ (۲۴/۱۹)۔ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ الخ (۳/۱۳۴) یعنی جو اپنے غصہ پر قابو رکھتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں۔ ایسے محسنین سے اللہ محبت رکھتا ہے۔ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ... مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۲۵/۵) (برائی کا بدلہ اس جیسی برائی (سزا) ہے۔ پس جو معاف کرے اور صلح کرے تو اللہ کے پاس اس کا بڑا اجر ہے) مظلوم ہونے کے بعد جو اپنی مدافعت کرتا ہے اس پر کوئی الزام نہیں۔ پھر ارشاد ہے۔ جو صبر کرے اور معاف کرے یہ ہمت و عزیمت کے کاموں سے ہے (۲۵/۱۵)

محولہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتنی نرمی اور پھر قوت و اثر سے اسلام انسان کو وسیع القلبی، عفو و کرم کا شوق دلاتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ اگر انسان سے ان صفات کا اظہار ممکن نہ ہو تو بھی انتقام کو مناسب حدود میں رکھتے ہوئے پورے کنٹرول کی کوشش جاری رکھنا لازم ہے اور غصہ کی حالت میں یہ چیز کوئی معمولی بات نہیں۔ اس قسم کے فوری انصاف و سلوک کی قدر صرف کھلاڑی

بہادر لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

مزید ارشاد ہے: وَاِنْ عَاقَبْتُمْ ...... لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ (۱۲۶/۱۶)

(اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی لو جتنا نقصان تم کو پہنچایا گیا۔ لیکن اگر صبر کرو تو صابرین کے لئے یہ بہت بہتر ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صبر کا مقام، انتقام کی قوت اور محل کی مناسبت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کو بزدلی یا بے بسی سے ہتھیار ڈالنے کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہیئے۔ صرف وہی لوگ صبر و عفو کی نیکی کا دعویٰ کر سکتے ہیں جنھیں پورے انتقام کی قدرت اور مواقع حاصل ہوں۔ بہرحال ہر شخص کو اپنی مدافعت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ پھر بھی انسان کو چاہیئے کہ وہ کتنا ہی قوی طاقت ور کیوں نہ ہو۔ شر و فساد اور ظلم و زیادتی سے بچے (عنوان ۴ تا ۶ کے مطالب حضرت کی انگریزی کتاب "اسلام" سے ماخوذ ہیں)۔

۷۔ عزیمت و رخصت

قرآن میں عزیمت و رخصت دونوں کی تعلیم ہے۔ عزیمت والے کم ہوتے ہیں جو بنانے سے نہیں بنتے۔ بلکہ اُن کا مضبوط، مستحکم، غیر متزلزل ارادہ اللہ کے فضل کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس کی مکمل جھلک اولوالعزم رُسل، انبیاءؑ، اولیاء میں بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔ محض کسی فارم کی خانہ پُری سے ایسی جماعت بن نہیں سکتی۔ اسلام ایک فطری عملی مذہب ہے۔ ایمان ہی ایسی سپر ہے جو ہر نازک محل پر ہر وار سے محفوظ رکھتی ہے۔ چنانچہ رخصت و اجازت میں اتنی بڑی گنجائش ہے کہ اگر کوئی مسلمان جبر اور ظلم و زیادتی کی وجہ سے احکامِ اسلامی کے خلاف عمل کر لے تو معذوری ہے لیکن کم از کم دل سے اس علم و عمل سے نفرت و کراہت اس کے لئے لازم ہے۔ تاکہ ایمان محفوظ رہے۔ ارشاد ہے: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ

شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (۱۰۶/۱۶) (یعنی ایمان پر قائم رہ کر کراہتِ قلبی کے ساتھ مجبوراً عمل کرنا پڑے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر اس کا سینہ کفر کے لئے کھل جائے اور اس میں مسرت حاصل کرے تو غضبِ الٰہی کا موجب ہوگا) اور اگر کافروں سے دوستی کر کے اُن سے محبتِ قلبی دکھائے اور دین و ایمان میں قلب کو متاثر کرے تو قرآن نے کہہ دیا۔ تم ان کافروں میں شمار ہو جاؤ گے۔ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵۱/۵)۔

عجیب معاملہ ہے کہ آج کل اکثر عوام تو قدرتِ الٰہی اور مُسبّب سے معاملہ کر رہے ہیں لیکن بعض علماء اسباب میں گھِر کر مایوس ہیں کہ اب سر رکھ دینے کے سوا چارہ نہیں۔ اصولاً خواص میں عزیمت ہونی چاہیئے۔ اور عوام میں رخصت کہ وہ مشکلات برداشت نہیں کر سکتے اور رخصت پر عمل کی صورت میں بھی دل سے بدعملی اور ظلم سے نفرت و کراہت لازمی ہے۔ لیکن یہ لوگ تمتّع، ترفّع کے لئے مُداہنت فی الدّین پر اتر آئے ہیں جو ناپسندیدہ ہے۔ کسی صورت میں کوئی کام دین و ایمان کے خلاف نہ ہو۔ اگر دین پر زد پڑے یا ترکِ دین کی فرمائش کی جائے تو مومنین آمادہ نہیں ہو سکتے چاہے جان ہی جائے۔ اہلِ عزیمت آئمہ نے اسلامی سلاطین تک کی ملازمت قبول کرنے سے انکار کیا۔ قید و بند کی تکلیفیں برداشت کیں۔ یہ اپنا اپنا حوصلہ ہے۔ عوام کو عزیمت پر مجبور کرنا مناسب نہیں۔ وہ رخصت کے تحت عمل کر سکتے ہیں۔

۸۔ نوکروں سے سلوک

اسلام نے نوکروں کے ساتھ انصاف کا حکم دیا ہے۔ ان کے معاملہ میں تحکّمانہ انداز مناسب نہیں۔ نوکر سے بقدرِ مناسب کام لیں۔ فضل جانیں کہ ہمیں آقا بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک منٹ میں خادم کو مخدوم بنا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ فلسطین کے سفر میں کچھ دور اپنے غلام کو اونٹ پر بٹھاتے تو کچھ دور خود بیٹھتے۔ یہ تکلف

اور شکر و خشیت کا مقام تھا۔ اس لئے مساوات
نہ تھا۔ بلکہ واقعہ کا اظہار تھا۔
برتتے تھے۔

فرمایا۔ مقبولیت اور ہر دلعزیزی بہت

۹۔ مقبولیت اور ووٹ

بڑی ابتلا ہیں۔ یہ کسی کے اچھے علم و عمل کی
دلیل نہیں۔ نیّت مقدّم ہے۔ نیک نیّت اور بد نیّت دونوں ہر دلعزیز ہو سکتے
ہیں۔ بلکہ نیک نیّت . . . .
بعض وقت زیادہ ہر دل عزیز نہیں ہوتا۔ فراستِ مومن کے معنے یہ ہیں کہ ابتدائی
آثار ہی سے اندازہ کر کے محتاط ہو جائے۔ ورنہ نتائج ظاہر ہونے کے بعد احتیاط
کا سوال کہاں۔ ہر دل عزیزی کی کوشش نیچے مرتبے والوں کے لئے مناسب ہے۔
اونچے مرتبے والوں کے لئے مناسب نہیں۔ اس میں تعینات کی طرف متوجہ ہو کر
خوش خلقیاں دکھانی پڑتی ہیں۔ وہ خلق ہی کیا جو غرض پر مبنی ہو۔ اس میں ذمہ داری
اپنے پر رہتی ہے۔ رضائے حق پر نظر رکھکر مقبولیّت سے بے نیاز رہیں۔ اس
کے باوجود جو ہر دل عزیزی حاصل ہو گی اس میں حفاظتِ الٰہی ہو گی۔ اس علم کی
بناء پر بڑے بڑے موقعوں پر منشائے حق کے تحت میں نے بے رُخی برتی۔ اللہ
نے کامیابی، ہر دلعزیزی عطا فرمائی۔
علی گڈھ یونین کی صدارت بڑا اعزاز تھا۔ میرا نام بھی تجویز ہوا۔ میں خاموش
تماشائی تھا۔ دوسری طرف سے خوب دعوتیں، کوششیں تھیں۔ میں مغرور
سمجھا جانے لگا۔ دو روز قبل بعض نے پوچھا۔ آپ انتخاب کے لئے کوئی کوشش
نہیں کرتے۔ بے تعلقی برتتے ہیں۔ میں نے کہا، صحیح ہے۔ میں نے ایک ہفتے سے
اس لئے ملنا جُلنا چھوڑ دیا ہے کہ کسی کی رائے کو متاثر نہ کروں۔ اسلامی آداب کے
لحاظ سے آزادانہ، دیانت دارانہ، ووٹ (رائے) سے صدر بننا چاہیئے۔

اللہ کی شان ـــــــ! اس کا ایسا
غرض کی خاطر اخلاق دکھانا معیوب ہے۔
ردِّ عمل ہوا کہ سارے مخالفین، موافقین بن گئے۔ اور ہم نوّے فی صد ووٹ سے
کامیاب ہوئے۔ غیرت کے ساتھ اپنے معاملات کو اگر اللہ کے تفویض کر دیں تو
اس کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ دعوت وغیرہ سے رام کرنا نیچے کے علم والوں کا کام
ہے۔ ہر محل کی گفتگو علحدہ ہے۔ مشہور قول ہے کہ ابرار کی نیکیاں مقربین
کی بُرائیاں ہوتی ہیں۔

کسی کے متعلق رائے قائم کرنے کا اُصول یہ ہے

۱۰۔ رائے کا اصول

کہ اپنی حد تک نیک نیّت رہیں۔ بغض و عناد
سے بچیں۔ واقعات کی روشنی میں حُسنِ ظن کے ساتھ رائے قائم کریں۔ اس کے
باوجود اصرار نہ ہو کہ ہماری رائے صحیح ہے یا اجتہادی غلطی ممکن ہے۔ جب کبھی مشورہ
دیں تو للّٰہیت کے تحت دیں۔ اس میں اپنی غرض شامل نہ ہو۔ اچھی رائے قائم
کرنے میں حرج نہیں لیکن خراب رائے قایم کرنے میں احتیاط لازم ہے۔
اپنی رائے یا ارادہ کو کسی پر عائد کرنا مناسب نہیں۔ البتہ اشارہ کر سکتے
ہیں۔ اگر کوئی اپنے اقتضاء کے تحت ہماری رائے کے خلاف کرے تو بھی حفاظتِ
الٰہی حاصل ہو کر خیر ہوتا ہے۔ اچھا نتیجہ دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے۔ کیا
معلوم کہ ہم جیسے علانیہ اچھی رائے سمجھ رہے ہیں، سرّاً (پوشیدہ طور پر) اس
میں کیا پردے پڑے ہیں۔ جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ ماموریت کے
سوا، اصرار مناسب نہیں۔
کسی کی نیت کے علم کا دعویٰ کرنا مناسب نہیں۔ اکابر کے کسی عمل پر ان کو بُرا
نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جب تحقیق ہو تو اس عمل کو خطا یا غلط کہہ سکتے ہیں۔ یعنی
قرینِ صواب اور صحیح نہیں۔

۱۱۔ سلام کا اصول

آج کل اکثر عہدہ دار سلام کے انتظار کے مرض میں مبتلا ہیں۔ سلام کے متوقع رہتے ہیں۔ سلام کا ایک اصول ہے۔ آنے والے کا فرض ہے کہ وہ سلام کرے چاہے وہ افسرِ بالا ہی کیوں نہ ہو۔ اُس عام نیازمندی کو تو چھوڑ ہی دو کہ لوگ سلام تو کیا، جوتے کی پالش تک کر دیتے ہیں۔

وائسرائے لارڈ ویول عثمانیہ یونیورسٹی دیکھنے کے لئے آئے۔ میں جس مقام پر کھڑا تھا وہ اُن کے راستہ سے علٰحدہ اور دور تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو میری طرف آئے خود سلام کیا اور گفتگو کی۔ اگر کوئی افسر ہم سے گھر پر ملنے کے لئے آئے تو اُس کا فرض ہے کہ خود سلام کرے۔ البتہ اگر افسر و ماتحت کی مڈبھیڑ ہو جائے اچانک ملیں تو ماتحت سلام کرے گا۔ ماتحت اگر افسر سے ملنے جائے اور وہ ڈیوٹی پر ہو تو ماتحت کا فرض ہے کہ سلام کرے۔ نہ یہ کہ وہ کہیں بھی بیٹھا ہو تو اس کے پیچھے سلام کو جائے۔ اگر کسی میں غرور ہو اور وہ سلام کا منتظر ہو تو ایسے کو سلام کرنا گویا اس کے نفس کو غذا دینا ہے۔ ایسے کو سلام مناسب نہیں۔ اگر مساوات، بے تکلفی ہو تو کسی کی طرف سے بھی سلام کے اقدام میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر برتری اور خصوصاً جماعتی برتری کا معاملہ آپڑے تو غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی حفاظت کی خاطر سلام میں تقدیم نہ کرے۔

۱۲۔ جذبہ کی تربیت

عام جلسوں میں جہاں ذہن کے مدارج مختلف ہوں تقریر کرنے میں دقّت رہتی ہے۔ عام لوگوں کے ذہن کا لحاظ کر کے تقریر کریں تو کہتے ہیں بچوں کی سی باتیں کر رہے

ہیں۔ خاص لوگوں کے ذہن کے مطابق کریں تو کہتے ہیں۔ بہت اعلیٰ باتیں کر رہے ہیں جو ہمارے کام کی نہیں۔ اللہ کا فضل ہو تو مضمون ایسا آتا ہے کہ سب سمجھتے ہیں اور سب کو فائدہ پہنچتا ہے۔ دوسرا سوال یہ پیش آتا ہے کہ مضمون علمی ہو یا جذباتی۔ اگر مضمون علمی ہو، جذباتی نہ ہو تو بھی مناسب نہیں۔ مُجرّد خشک علم کافی نہیں۔ علم کا عمل سے ارتباط اور عملی زندگی میں اس کی اِفادیت سمجھ میں آنا ضروری ہے۔ مثلاً علم کے دائرہ میں کسی نے فنی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی موٹر کی اسکیم بنا دی لیکن لوگ سڑک پر چلتی دوڑتی موٹر دیکھنا چاہتے ہیں۔ محض علم کافی نہیں۔ قرآن میں آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے کلمات کثرت سے آئے ہیں۔ یعنی علم کے ساتھ عمل پر زور دیا گیا ہے۔ علمی مضمون میں سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن جذباتی میں سوچ کی ضرورت نہیں کیونکہ جذبہ کا تعلق قلب سے ہے۔

حضرت خواجہ نقشبند رحؒ فرماتے ہیں۔ انسان جذبہ کے ذریعہ ایک سکنڈ میں کہیں سے کہیں ترقی کر جاتا ہے۔ لیکن محض جذبہ سے کام نہیں چلتا۔ علم اور جذبہ لازم و ملزوم ہیں۔ جذبہ کا مرتبہ علم کے بعد ہے۔ جذبہ کی مثال انجن کی سی ہے انجن کو اسٹارٹ کر کے چھوڑ دیں تو کہیں گر کر یا ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا۔ راستہ کا علم ہو اور راستہ پر چلا کر کام لیتے رہیں تو کام نکلے گا مقصود پورا ہوگا

نفسیات کا مسئلہ ہے کہ صرف موقع پر جذبہ کا استعمال ہو۔ جذبات کو روکنا نہ چاہیئے۔ ورنہ دل و دماغ اور اعصاب پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ البتہ جذبات کو قابو میں رکھ کر صحیح محل پر استعمال کریں۔ انبیاء کی تعلیم کی خصوصیت یہ رہتی ہے کہ

علم اور جذبہ دونوں سے کام لیتے ہیں یعنی دماغ اور قلب سے ۔ عمدہ زوردار تیز موٹر اچھے شوفر کے قابو میں رہتی ہے ۔ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (پ۴) ۔ (غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے) کے مطابق انبیا ایسے انسان تیار کرتے ہیں جو اچھی طرح جذبات پر قابو رکھتے ہیں۔ لطیف اور اعلیٰ جذبات اگر بیکار رہیں تو نقصان ہوتا ہے ۔ اس لئے موٹر کی بیٹری کو روز چارج کرتے رہیں تاکہ خراب نہ ہو۔ تکبیر، نعت، درود شریف وغیرہ جذبات کی چیزیں ہیں۔ ان کے ذریعہ قلوب کو گرماتے رہیں۔ علمِ صحیح سے جذبات کو جلا دے کر ان سے کام لیں۔

۱۳۔ بچوں کی تربیت

چھوٹے طالب علموں کی ایک پارٹی آئی۔ فرمایا، ہم کو اللہ نے تین چیزیں عطا فرمائی ہیں۔ جسم، دماغ، دل، قدرت کا منشا یہ ہے کہ ہم ان تینوں کو ورزش دے کر قوی کریں۔ جسم کی ورزش ایسی ہو کہ تمام اعضا سڈول قوی ہو جائیں۔ نہ یہ کہ ہاتھ مضبوط لیکن ٹانگیں کمزور۔ ہم بچپن میں ورزش کرتے۔ ہاکی، فٹ بال، کرکٹ کھیلتے تھے۔ علی گڈھ کے جاڑوں میں علی الصباح کورے مٹکوں کے سرد پانی سے نہانے کے مقابلے کرتے۔ شرط یہ کہ چھینک بھی نہ آئے۔ اسی طرح دماغی صحت وصلاحیت کے لئے مفید علمی و فنی کتابوں کا پڑھنا لکھنا ضروری۔ مثلاً ڈاکٹری، انجینیری، معاشیات، اسی طرح قلبی صحت و قوت کے لئے اللہ، رسولؐ کی محبت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ضروری ہیں۔ اللہ کی ناپسندیدہ چیزوں کو چھوڑنا چاہیے۔ اور پسندیدہ چیزوں کو اختیار کرنا چاہیئے۔ بعض وقت سزا نہیں ملتی، ملتوی رہتی ہے۔

تعلیم کے دوران میں طلبہ کو دو چیزوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایک حافظہ،

دوسرے غور وفکر۔ تعلیم کا اصل مقصد غور وفکر کی قوت کو ترقی دینا ہے۔ تاکہ زندگی میں ہر محل پر اس سے کام لیا جاسکے۔ ورنہ محض حافظہ میں سینکڑوں چیزیں بھرنے اور رٹنے سے انسان محافظِ دفتر تو بن سکتا ہے لیکن اچھا جج یا انتظامی عہدہ دار نہیں بن سکتا۔ حافظہ بھی اچھی چیز ہے۔ لیکن اس سے کام لینے کا ڈھنگ ہونا چاہیئے۔ نقالی کے مقابلہ میں اپج اعلیٰ اور اہم ہے۔ علی گڈھ میں انگریزی مضمون نویسی کا مقابلہ تھا۔ ہم نے سیدھی سادی انگریزی لکھی تو انعام اول ملا۔ اسی طرح تاریخی مضمون نگاری کے مقابلہ میں سب نے سو سو صفحے ٹائپ کے پیش کئے۔ میں نے اپنی قلمی موٹی تحریر کے صرف تیس صفحے دیئے۔ ہمیں تین سو روپے کی کتب انعام میں ملیں۔ ممتحنین نے رائے لکھی۔ گو یہ مضمون بہت مختصر ہے۔ لیکن اس میں اپج ہے۔ غور وفکر ہے۔ لکھنے کا طریق خاص ہے۔ اور اپنا ذاتی ہے۔ اس میں نقالی اور رٹو پن نہیں ہے۔ بعض وقت بعض ممتحن صحیح ذوق نہیں رکھتے۔ غور وفکر کی قدر نہیں کرتے۔

۱۴۔ ذاتی اقتضاءات اور تربیت

فرمایا۔ راست نصیحت میرے اصول کے خلاف ہے۔ صرف یارانہ گفتگو رہتی ہے۔ اسی میں کسی کو فائدہ پہنچے تو پہنچے۔ ملاقات میں طبعی رجحان، اقتضا اور اختلافِ ذوق کا لحاظ ضروری ہے۔ محبت کا عنصر غالب ہونا چاہیئے۔ جس سے انسان یا حیوان مانوس بلکہ لٹو بن جاتا ہے۔ شخصیت اسکول میں نہیں بن سکتی۔ کیونکہ ہر ایک کے ساتھ استاد کی انفرادی توجہ ممکن نہیں۔ بڑی شخصیتیں اسکول کے باہر کی مصروفیات میں بنی ہیں۔

استاد میں محبت اور بے تکلفی ضروری ہیں لیکن اس کی ناراضی سے سب ڈرتے رہیں۔ تاکہ نظم وضبط برقرار رہے۔ حضورؐ کی محفل میں ہر شخص اتنا بے تکلف

ہوتا کہ اپنے راز بیان کر دیتا۔ لیکن ساتھ ہی ادب و رعب کا یہ عالم کہ گویا اہلِ مجلس کے
سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ اسی لئے دین کا اصول ہے۔ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ
اَلْخَوْفِ وَالرَّجَا۔ (ایمان، خوف و رجا کے درمیان ہوتا ہے) اولیاء اللہ
کی کامیابی کا بھی یہی راز ہے۔ بچہ کو آزادی اور ذمہ داری ملنی چاہیئے۔ آزادی
نہ ہو تو وہ مُردہ ہو جائیگی۔ اور ذمہ داری نہ ہو تو ضبط غائب۔ استاد میں
حکمت و فراست ہو تو آگ، زہر اور شر سے بھی خیر کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اللہ نے
کوئی صفت کوئی چیز بے کار نہیں پیدا کی۔ البتہ اس کے جا، بے جا استعمال سے
خیر و شر پیدا ہوتے ہیں۔

۱۵۔ صحبت کی اہمیت

کم عمر اور جوان لڑکے لڑکیوں کو بزرگوں کی
صحبت میں بیٹھنے کا عادی بنائیں۔ بزرگوں
کو بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ بچے ان کی صحبتوں سے مانوس ہوں۔
متوحش نہ ہوں۔ جوان لڑکی کا جوان لڑکی کے ساتھ تنہائی میں مل کر بیٹھنا بھی مناسب
نہیں۔ صحبت کی بڑی اہمیت ہے۔ بُری صحبت زہر ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ
ہم سمجھدار ہیں۔ بُرائی سے متاثر نہ ہونگے۔ قرآن میں ہے۔ صادق بندوں کی صحبت
میں رہو۔ اور جاہلوں سے پرہیز کرو۔ بُری صحبت میں عقل نہیں چل سکتی۔ عقل قلب
کے تابع ہے اور قلب کا ایک سکنڈ بھروسہ نہیں۔ اسی لئے رَبَّنَا لَا تُزِغْ
قُلُوْبَنَا کہنا پڑتا ہے۔
صحبت میں اپنا ارادہ، عقل، علم کام نہیں کر سکتے۔ اگر ڈاکٹر متعدی امراض
والوں کی صحبت اختیار کریں تو ان کا علم و فضل و عقل کام نہیں آتے۔ مبتلا ہو جاتے
ہیں۔ اسی طرح بُری صحبت میں لاعلمی میں روحانی، قلبی اور مادی جراثیم داخل ہو جاتے
ہیں جو نکالے نہیں نکلتے۔ اور صحبت بد کا اثر صورت، صحت، دولت اور قلب پر پڑ جاتا

ہے۔ یا تو اپنی نیک فطرت اور استقامت، پر اتنا اطمینان ہو کہ بُری صحبت سے
خود متاثر نہ ہوں۔ خواہ ہم دوسروں کو متاثر کریں یا نہ کریں۔ اگر ہم دوسروں کو متاثر
کر سکیں تو نورٌ علیٰ نور۔ ورنہ صحبت بے فائدہ ہے۔ البتہ جب کبھی واقعی ضرورت
پیش آئے تو اچھوں بُروں سبھی سے مل سکتے ہیں۔ جس طرح ڈاکٹر مریضوں کے علاج
کے لئے ان کے پاس آتے جاتے ہیں۔
مشہور مقولہ ہے۔ دولت گئی تو کچھ نہیں گیا۔ صحت گئی تو کچھ گیا۔ لیکن اخلاق (ایمان)
گیا تو سب کچھ گیا۔ زندگی کا اعلیٰ مقصود ایمان ہے۔ جس میں حقیقی عزت ہے۔ صحت و
دولت کا مقصود بھی مومن کے لئے ایمان ہی ہے۔ لہٰذا مومن کی عزت طلبی حق کے تحت
اور دنیا دار کی نفس کے تحت ہوتی ہے۔

۱۶۔ حضرت خاتونِ جنت رضؓ کا نمونہ

ایک دن میری بچیوں فردوس
و انیس سے حضرت نے فرمایا۔
ہمارے لئے رسول اللہؐ اور ان کی اولاد نمونہ ہیں۔ تمام اولیاء کا متفقہ مقولہ ہے
کہ جو دقتیں کسی دربار میں دور نہ ہوں، وہ صرف حضرت خاتونِ جنتؓ کے در پر حل
ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ یہاں نسبتوں کا ہجوم ہے۔ حضرت خاتونِ جنتؓ عورتوں کی سردار
اور اُن کے لئے بہترین نمونۂ عمل ہیں۔ حتیٰ کہ حضورؐ نے فرمایا۔ فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا
ہے۔ گویا آپؓ نے حضورؐ کی ساری تعلیم کو جذب کیا اور نمونہ بنیں۔
اللہ کے خاص بندے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تحتِ ولایت۔ ایک تحتِ
رسالت۔ تحتِ ولایت کی شان یہ کہ جذب ہو کر بندہ صرف اللہ کے ساتھ مشغول
رہے۔ اس میں کشف و کرامات کا خوب ظہور ہوتا ہے۔ تحتِ رسالت کی شان یہ
کہ نسبت حق کے ساتھ رجوع اِلی الْخلق رہے اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد
کی ادائی میں مشغول رہے۔ عورتوں میں حضرت مریمؑ بھی بڑے مرتبے والی تھیں لیکن

ان میں ولایت کی شان تھی۔ وہ کمرہ میں بیٹھی اللہ اللہ کرتیں۔ وہیں غیب سے کھانا آجاتا۔ بڑے کشف و کرامات تھے۔ احوال تھے۔ لیکن حضرت فاطمہؓ کی ذاتِ مبارک میں نسبتِ رسالتؐ کی جامعیت تھی کہ جذب و صحو ساتھ ساتھ تھے مطلب یہ کہ عبادات کے ساتھ ساتھ صبح سے شام تک میاں کے حقوق، بال بچوں کی خدمت میں لگی رہتیں۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ کے فرمانے پر حضورؐ سے ایک خادمہ مانگی تو وہ بھی دینا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ چونکہ منشاء نسبت الی الخلق اور حقوق العباد کو پورا کرنا تھا۔ اسی جامعیت کی وجہ سے آپ کا مرتبہ بلند ہے۔

لوگوں کو نہیں معلوم کہ حقوق العباد کی ادائی کتنی بڑی نعمت ہے۔ نسبتِ رسالت کے تحت اگر بیبیاں گھر کے کام کاج، میاں کی خدمت اور بچوں کی پرورش کریں تو اسی میں ولایت، غوثیت، قطبیت سب مل سکتی ہے۔ یہ درجات زیادہ عبادات (نماز، روزوں) سے نہیں ملتے، اگرچہ عبادات بھی اپنی جگہ مرتبہ رکھتی ہیں۔ لیکن حقوق العباد کی ادائی کے ساتھ تھوڑی عبادت بھی کی جائے تو بہت بڑا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اسی لئے سورۂ مزمل میں حقوق العباد پر بہت زور دیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ کی زندگی کیا تھی۔ اللہ کے حکم و علم کے تحت مخلوق کے حقوق ادا کرنا۔

بی بی! دیکھو دین دنیا، دن رات دو دو چیزیں ہیں۔ رَبَّنَا آتِنَا کی دعا میں دین دنیا کی بھلائی کی دعا مانگی جاتی ہے۔ ترازو کے دونوں پلڑے برابر رہنا کمال ہے ورنہ نقص رہتا ہے۔ اللہ نے انسان کو دو آنکھ، دو ہاتھ، دو پیر دیئے ہیں۔ اگر صرف ایک ہاتھ، ایک پیر رہے تو کمال نہیں، نقص ہے۔ اسی طرح حقوق اللہ اور حقوق العباد، دین اور دنیا کو ساتھ ساتھ چلانا چاہیئے۔ دن کو دین سمجھو تو رات کو دنیا۔ یا جیسا بھی۔ بہر حال دونوں بھی اپنی جگہ ضروری ہیں ان کا توازن بڑی چیز ہے۔ اللہ نصیب کرے۔

یاد رکھو۔ صبح سے شام تک کہیں بھی رہو لیکن اپنا بسیرا اور مقام حضرت خاتونِ جنتؓ کے قدم پر رہنا چاہیئے۔ یعنی اُن کی دھن بندھی رہے۔ جب کبھی حضرت خاتونِ جنتؓ حضورِ انورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو حضورِ انورؐ آپ کے لئے تکریماً اٹھتے تھے۔ جس سے آپ کا مرتبہ و مقام سمجھ میں آتا ہے۔ تم روزانہ جب جی چاہے سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص و کوثر اور درود پڑھ کر کبھی حضرت خاتونِ جنتؓ، کبھی پنجتن پاکؓ، کبھی حضرت غوث اعظمؒ کو، یا جس سے بھی اپنا ربط ہو، ایصالِ ثواب کیا کرو۔ کتنا ہی بہتر کھاؤ پیو، پہنو، اوڑھو لیکن حضرت سیدہؓ کی محبت میں ان کے فقر و فاقہ کا ذوق ضروری ہے۔ اُن کے خیال سے دل میں تڑپ ہونی چاہیئے۔ اور پیوند کے کپڑوں سے محبت چاہیئے۔ اس کو کبھی بُرا نہ جانیں۔ آج کل لڑکیوں کا کیا حال ہے۔ ساڑی، پاؤڈر، لپ اسٹک میں تباہ ہیں۔ بناؤ سنگھار کے ذریعہ عظمت حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ استغنا بڑی نعمت ہے۔ حضرت سیدہؓ کی باندیاں بنو۔ تو شیرنی بن جاؤ گی۔ شیرنی بننے کے بعد بہت لباس ہوں یا کم، دل تو شیر (غنی) رہے گا۔

بعض لوگ طبعاً ولایت کی طرف زیادہ مائل رہتے ہیں۔ ان کا مقام الگ ہے۔ چنانچہ بعض بزرگوں نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ عبادات میں غرق رہے۔ لیکن محض نماز روزہ کی عبادتوں میں لگے رہنا ترازو کے ایک پلڑے سے غافل رہنا ہے۔ جو نقص ہے اور منشائے الٰہی کے خلاف ہے۔ ہمارے لئے پناہ نسبتِ رسالتؐ میں ہے۔ جس کی اتباع کا بہترین نمونہ حضرت خاتونِ جنتؓ، حضرت خدیجہؓ، اور حضرت عائشہؓ ہیں۔ دوسرے بھی ہمارے سر آنکھوں پر ہیں۔ واجب التعظیم ہیں۔ حضرت خاتونِ جنتؓ کا اُسوۂ حسنہ عورتوں کے لئے خاص طور پر واجب التعمیل ہے۔

(۱۷) جماعتِ کنیزانِ فاطمہؓ سنہ ۱۳۷۲ ہجری میں بتاریخ ۳ر رمضان المبارک جو حضرت سیدہ خاتونِ جنتؓ کے وصال کی تاریخ ہے۔ حضرت کی تحریک پر اس ناچیز کے غریب خانہ، واقع دبیر پورہ، حیدرآباد پر جماعتِ کنیزانِ فاطمہؓ کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس کا افتتاح حضرت کی اہلیہ محترمہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس کی معتمد فردوس فاطمہ اور نائب معتمد انیس فاطمہ بنیں۔ اِس تحریک کا مقصد اللہ، رسول اللہ، اولیاء اللہ کی محبت اور بالخصوص بیبیوں میں حضرت خاتونِ جنتؓ کی محبت اور آپ کی سیرت کی پیروی کرنے کا شوق پیدا کرنا ہے کہ عورتوں کے لئے انتہائی سعادت یہی ہے کہ حضرت خاتونِ جنتؓ کی باندیوں میں ان کا شمار ہو جائے۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ   مادراں را اُسوۂ کامل بتولؓ

اللہ کے فضل سے اس کے جلسے جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس تحریک کو قیامت تک قائم و دائم رکھے۔ عالمِ اسلام کے ہر ہر شہر، ہر ہر قریہ میں اس کی شاخیں قائم ہوں۔ اور نعت و منقبت اور سیرتِ فاطمہؓ کے ذریعہ بیبیاں اپنا ایمان تازہ اور قوی کریں۔ (آمین)

(۱۸) لڑکی کی نسل حضرت کی کوئی اولادِ نرینہ زندہ نہیں رہی۔ صرف تین صاحبزادیاں ہیں۔ اقبال فاطمہ صاحبہ (اہلیہ جناب مسعود الحسن صاحب)۔ کنیز فاطمہ صاحبہ (اہلیہ ڈاکٹر موسیٰ عبدالرحمٰن صاحب)۔ اور رشید فاطمہ صاحبہ (اہلیہ جناب امجد اللہ صدیقی صاحب مجسٹریٹ)۔ ماشاء اللہ تینوں صاحبِ اولاد، خوش حال ہیں۔ ایک روز فرمایا۔ مجھے اپنی لڑکیاں اتنی عزیز ہیں کہ ایک سکنڈ کے لئے اولادِ نرینہ کی حسرت دل میں نہیں آئی۔ بلکہ ہمیشہ شکر کیا کہ مجھے حضورِ انورؐ کی طرح

میری صرف لڑکیاں ہیں۔ اتباعِ نبویؐ کا یہ فیض مجھے قدرۃً عطا ہوا۔ جس طرح حضورِ انورؐ کا فیض عالم میں صرف لڑکی سے پھیلا۔ حضورؐ نے نواسوں کو اپنی اولاد سمجھا اور فرمایا۔ اِسی طرح فیضانِ محمدی کے طفیل میں توقع ہے کہ میری اولاد لڑکیوں کے ذریعہ پھیلے گی۔ یہ ایک جاہلانہ خیال ہے کہ لڑکے کی نسل اپنی سمجھی جاتی ہے۔ اور لڑکی کی نسل اپنی نہیں سمجھتے۔ عوام کا تو کیا ذکر، بعض خواص اب بھی ایامِ جاہلیت کی طرح لڑکیوں کی ولادت پر رنج و افسوس کرتے ہیں۔ بلکہ شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ لڑکیاں بھی غلط خیالی سے ایسا احساس رکھتی ہیں اور رسماً اجنبیت برتتی ہیں۔ حالانکہ لڑکیوں کا حصّہ میراث میں رکھا ہے۔ حدیثِ شریف ہے جس کی تین لڑکیاں ہوں اور اُن کو محبت سے پالے تو اس کے لئے جنت واجب ہے۔

(۱۹) لڑکیوں کی تعلیم تعلیم نسواں کے متعلق فرمایا۔ لڑکیوں کو اور بالخصوص اچھے مذہبی رجحانات رکھنے والی لڑکیوں کو آج کل کی فضا میں اسکول بھیجنا قطعاً نامناسب ہے۔ اسکولوں کی فضا بہت مسموم ہے، سب بھیجنے والے دھوکے میں مبتلا ہیں۔ دیدہ و دانستہ سب برائیوں کو گوارا کر رہے ہیں۔ اسکولوں میں انسانیت و اخلاق کی تعلیم نہیں ملتی۔ نہ پردہ ہے نہ شرم و حیا ہے۔ نہ اسلامی پردہ پوشی ہے۔ بس نمود و نمائش ہے اور زینت و لباس کا مظاہرہ۔ غازہ، پوڈر، لپ اسٹک، ناخن رنگنا، فلمی گانے گانا اور فلم اسٹار کا ذکر بس۔ بڑا گھمنڈ یہ کہ پڑھ لیا۔ اور پڑھنے کی حقیقت معلوم کہ انسانیت و اخلاق ندارد۔ اکثر اِس خیال سے پڑھاتے ہیں کہ بی۔اے ہو جائیں تو لڑکیوں کو اچھے رشتے ملیں گے۔ یا وہ خود بسری کے لئے خود مکتفی ہوں گی لیکن غیرت مند لڑکے ازدواجی زندگی کے لئے اعلیٰ

تعلیم یافتہ لڑکیوں سے نسبت میں تامل کرتے ہیں۔ ملازمت کے سلسلے میں دفتروں میں اخلاق کی جو گت بن رہی ہے۔ ناقابلِ بیان ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔ لہٰذا گھر پر بقدرِ ضرورت انگریزی، اردو، حساب اور مذہبی لٹریچر پڑھانا۔ امورِ خانہ داری پکوان سینا پرونا وغیرہ سکھانا زیادہ مناسب ہے۔ گھر کی اسلامی تربیت کی حفاظت ضروری ہے کہ حکم ہے:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (۲۲)

(یعنی گھروں پر وقار سے رہو اور پہلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو)۔ موجودہ زمانہ میں گھریلو زندگی کا امن و سکون تباہ ہوگیا ہے۔ میں نے اپنی لڑکیوں کو اسکول نہیں بھیجا۔ لیکن کئی یوروپین لیڈیز نے حیرت سے کہا۔ یہ لڑکیاں، امریکن، یوروپین پکوان اور سینے پرونے اور اسپورٹس میں اسکول کی لڑکیوں سے بہتر ہیں۔

(۲۰) شادی فرمایا۔ شادی کے معاملہ میں صحت و اخلاق (دین) دو چیزیں دیکھنی چاہئیں، نہ کہ دولت و جہیز۔ حضور کا علم و عمل حضرت خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کی شادی میں کیا تھا۔ بڑے بڑے سرداروں کے پیام تھے۔ اس کے مقابل حضرت علیؓ کے پاس فقر و فاقہ تھا۔ حضرت نے فرمایا۔ اگرچہ کہ امیر پیام دے رہے ہیں لیکن علیؓ بہتر انسان ہے۔ آج کل لوگ دولھا دلہن کو اُن کے اوصافِ ذاتی اور اقدارِ انسانی کے لحاظ سے نہیں چاہتے۔ حالانکہ انسانی نقطۂ نظر والا لڑکا لڑکی ملیں تو معاشرتی گھریلو زندگی جنت بن جاتی ہے ہاں اگر انسانیت کے ساتھ عمدہ، دولت بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہے۔ ورنہ انسانیت اور دین و اخلاق رکھنے والا غریب بد اخلاق امیر سے بہتر ہے۔

(۲۱) تعددِ ازدواج ایک صاحب نے کہا۔ قرآن میں تعددِ ازدواج کی

اجازت ہے۔ فرمایا۔ اصول یاد رکھئے۔ اسلام تقویٰ کا مذہب ہے۔ نفسانیت و عیاشی کا نہیں۔ اس میں شک نہیں، اسلام نے عدل کی خاص شرائط کے ساتھ چار شادیوں تک کی اجازت دی ہے لیکن حکم نہیں کیا ہے۔ اجازت اور حکم میں بہت فرق ہے۔ اسلام دنیا کے سب انسانوں کے لئے بشیر و نذیر ہے۔ اس لئے ہر ملک کے حالات کا لحاظ ضروری تھا مثلاً عرب، عراق، شام وغیرہ میں خالص کھجور کھانے سے خون بہت بنتا ہے۔ اور جنسی تقاضے بہت قوی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہاں بھی لوگ عموماً ایک سے زیادہ شادیاں نہیں کرتے۔ شاذ و نادر ہی زیادہ کرتے ہیں ہندوستان میں تو خون نہیں۔ کمزوری بلا کی۔ ایک عورت کے حقوق ادا کرنا مشکل اس کے باوجود محض عیاشی کی خاطر لوگ دو دو، چار چار بیویاں کرنا چاہتے ہیں اور قرآن سے جواز نکالنا چاہتے ہیں۔ اپنی نفسانیت کے تحت قرآن سے سند لینے کی بے جا کوشش بڑا گناہ ہے۔ گویا مسجد میں بیٹھ کر شراب پینا ہے۔ ایسوں کو قرآن سے ہدایت نہیں ہوتی۔ قرآن سے صحیح فیض و انکشاف کثرتِ معلومات پر موقوف نہیں۔ بلکہ حضورِ انور کی محبت اور جوتیوں کا صدقہ ہوتا ہے ورنہ سر پٹک لو۔ ایک بات نہیں کھلتی۔ ہر محل کا ایک اقتضاء ہوتا ہے۔ وہ محل تو پیدا نہیں ہوا۔ اور نفسانیت کو مقصود بنا کر قرآن سے سند لینے چلے۔ ایسے لوگوں پر لعنت آئی ہے

مختصر یہ کہ اسلام تعددِ ازدواج کی ہمت افزائی نہیں کرتا۔ حیدرآباد کے مسلمان امراء کثرتِ ازدواج کی بناء پر تباہ و برباد ہوئے۔ دلّی تباہ ہوئی۔ اسپین تباہ ہوا۔ ہر جگہ یہی ناگفتہ بہ حالات تھے۔ بادشاہ، امراء عورتوں میں لگ گئے تھے۔ جسم و دماغ تباہ ہوگئے تھے اخلاق برباد ہوگئے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ملک گئے۔ غیرت گئی۔ اسلام نے غیر معمولی قوتِ مردمی اور جنسی تقاضوں کی شدت، بیویوں کی صحت کی خرابی، اولاد کا نہ ہونا اور دیگر خاص مصالح کی صورتوں میں، عدل کی لازمی شرط کے

ساتھ تعددِ ازدواج کی اجازت دی۔ ایسی صورتوں کے بغیر، محض بوالہوسی کی خاطر کئی کئی شادیاں کرنا اور قرآنی اجازت کو سند میں پیش کرنا سخت ناپسندیدگی کی بات ہے۔ کام کریں شیطانی اور سند لیں رحمانی۔ کیسے ممکن ہے۔

(۲۲) عورت کا مرتبہ اسلام میں

(ا) مردوں کا ظلم اور مالکی فیصلہ

شرعاً، قانوناً، عرفاً، اخلاقاً گھر کے جملہ امور کی ذمہ داری شوہر پر ہے۔ آج کل دینداری کا ادّعا کرنے والوں کے بڑے طبقہ کا سلوک، عورتوں کے ساتھ بدترین، ظالمانہ اور بہیمانہ ہے۔ عورت کو حیوان کی طرح سمجھا اور برتا جا رہا ہے۔ اِس کی صحت، عافیت کی مطلق پروا نہیں۔ ایک عام بے حسی و شقاوت طاری ہے۔ اپنے فرائض سے کوتاہی ہے۔ اور عورت کے فرائض کا مطالبہ ہے۔ ایسے حیوانی عمل کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ایسا ہی نازک اور خطرناک دور آ گیا ہے جیسا اسلام سے پہلے ایامِ جاہلیت میں آیا تھا۔ یہ شرع کو بہانہ بنا کر عورت کو تختۂ مشق بناتے ہیں جس کا نتیجہ ہندوستان میں عورتوں کا ارتداد ہو رہا ہے۔ وہ آریہ اور عیسائی بن رہی ہیں۔ میرے کہنے پر علامہ عبدالقدیر صاحب حسرت نے مطالعہ و تحقیق کے بعد اس نازک مسئلہ خلع پر ایسا اچھا نوٹ لکھا کہ عورتوں کے حق میں رحمت ہے۔ جسے اُس زمانہ کی بھوپال گورنمنٹ نے بھی پسند کیا یعنی حضرت مالک رحمہم کے فیصلہ کے لحاظ سے عورت کو حق حاصل ہے کہ مرد کی طرف سے مظالم کی صورت میں خلع لے اور حکومت کا قانون زن و شوہر میں تفریق کرا دے۔

(ب) نسوانی جذبات کا لحاظ

اسلام اور دینداری کے معنی انسانیت کے ہیں۔ قرآن انسانیت سکھاتا ہے۔ اگر اسلام اختیار کرنے کے بعد انسانیت کا ادراک و احساس تیز نہ ہو تو لاکھ وظیفے

پڑھو۔ قرآن سے کوئی تعلق و فیض نہیں ملا۔ اس کا امتحان معاملات اور حقوق العباد کی ادائی میں ہے۔ اسلام نے فرائض پر زور دیا ہے۔ دو فرض کے برابر دو ہزار سنت و نفل نہیں ہو سکتے۔ اسلام کا زیادہ زور حقوق العباد پر ہے، نہ کہ نماز، روزوں، وظیفوں کی کثرت پر۔ یہ چیز اسوۂ حسنہؐ اور اسوۂ صحابہؓ سے ثابت ہے۔ حضرت صدیقؓ اور حضرت عمرؓ فرض نمازوں کے بعد دن رات زیادہ تر حقوق العباد، جہاد، تیمارداری، سماجی خدمت میں لگے رہتے تھے، نہ کہ وظیفوں میں۔ اگر نماز کے بعد کوئی شخص دیر تک وظیفے پڑھنا چاہتا تو حضرت عمرؓ مسجد سے بڑھا دیتے تھے۔ بصیرتِ فاروقی جانتی تھی کہ آئندہ چل کر ایسے وظیفے پڑھنے والوں سے بڑے فتنے پیدا ہونگے اور وہ اوراد و نوافل کو بہانہ بنا کر حقوق العباد اور کسبِ حلال کے فرائض سے غافل ہو جائیں گے۔ حضرت عمرؓ راتوں میں بھی خدمتِ خلق کے لئے گھوما کرتے تھے۔ ایک رات ایک عورت کو جس کا شوہر باہر جہاد پر گیا ہوا تھا۔ دردناک فراقیہ اشعار پڑھتے سنا۔ تڑپ اٹھے۔ فوراً حضرت حفصہؓ اور اپنی بی بی سے مشورہ فرمایا کہ ایک عورت شوہر کے بغیر کتنے عرصے تک صبر کر سکتی ہے۔ دوسرے دن کمانڈروں کے نام فوری احکام جاری فرمائے کہ جہاد جیسے فرض سے بھی ہر چھٹے مہینے مجاہدین کو رخصت دیکر وطن واپس بھیج دیا جائے۔ حقوق العباد کا کتنا پاس تھا۔ انسانی جذبات کا کیا لحاظ تھا۔ دراصل انسانیت اسی کا نام ہے۔

(ج) امنِ عالم اور نمونۂ صدیقیؓ

اس وقت سارے عالم کی بدامنیاں ختم ہو جائیں اور امن کانفرنسوں کی ضرورت باقی نہ رہے اگر حضرت صدیق اکبرؓ کے اس خطبہ کے اصول کو امن کانفرنس میں قبول کر لیا جائے اور اُس پر دنیا میں عمل ہو جائے۔

- صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ جو تم میں کمزور ہے وہ میرے لئے قوی ہے۔ انشاء اللہ اُس کا حق دلوا کر رہونگا اور تم میں جو قوی ہے وہ میری نظر میں

میں کمزور ہے۔ اُس سے انشاء اللہ حق لے کر چھوڑونگا۔

(سیرۃ الصدیق ص۴۴، صدر یار جنگ شروانی صاحب)

آج کل افراد، طبقوں، قوموں اور حکومتوں کا عمل اِس کے خلاف ہے۔ جس کی وجہ سے مصیبتیں طاری ہیں۔ دنیا میں ہر شخص کمزوروں کے مقابل اپنی مردانگی اور زور کا اظہار کر رہا ہے اور زور آوروں سے دبتا ہے۔ حالانکہ مردانگی ہے تو عورتوں اور بچوں سے نہ لڑے بلکہ ان کے حق کے لئے بڑوں سے ٹکر لے۔ اگر نامرد ہے تو کمزوروں سے لڑیگا۔ شیر چوہوں پر ہاتھ نہیں ڈالا کرتا۔ اسلام کا حکم ہے۔ جہاد میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں کو ہاتھ نہ لگائیں۔ بلکہ کھیت اور درخت تک نہ کاٹیں۔

(د) عورتوں کی مرتبت

حج کے موقع پر ایک بزرگ نے مجھ سے فرمایا۔ دیگر قومیں ہماری نمازوں، روزوں سے متاثر نہیں ہوتیں۔ اُن پر اثر جس چیز کا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان معاملات اور انسانی خدمات میں اُن سے افضل ہیں"۔ فرنگی اقوام کے پاس انسانی خدمات اور عورتوں کی اعلیٰ مرتبت کے تخیلات تک نہ تھے۔ انھوں نے مسلمانانِ اسپین میں عورتوں کی عزت و تکریم دیکھ کر اور سیکھ کر یوروپ میں شوولری (عورتوں کی تکریم۔ کمزوروں کی مدد) کا تخیل پیش کیا۔ اور اُس پر عمل کر کے عورت کو کہاں تک بلند کیا۔ طبّی خدمات کے ذریعہ اپنا پیامِ عیسائیت پہنچا کر خدمتِ خلق کی اہمیت و عظمت قائم کر دی۔ عورتوں کی عزت، میراث میں اُن کا حصّہ۔ بچوں کی تعلیم، دوا درمن، حفظانِ صحت اور خدمتِ خلق وغیرہ تو دراصل مسلمانوں کی قرآنی تعلیمات ہیں۔ لیکن ہم نے ایسی غفلت برتی کہ گویا یہ ہماری چیز نہیں۔ بلکہ ہمارا کام صرف نماز، روزہ، وظیفہ ہی ہے۔ لہٰذا اب ہمیں اپنے صحیح مسلکِ حقوق العباد کی طرف آنا لازمی ہے جس میں دین و ایمان کا اصلی امتحان ہے۔ حضورِ انورؐ کے فرمان کے لحاظ سے ایک ایک معاملہ کا اجر ہزاروں برس کی عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔

(۵۵) حضور کا عورتوں کے حقوق پر زور

حضورِ انورؐ نے حجۃ الوداع میں عورتوں اور غلاموں کے حقوق پر بہت زور دیا اور اُن سے عمدہ سلوک کا حکم فرمایا۔ رسول اللہؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والی، سب سے پہلے سب سے زیادہ اسلام پر جان مال سے فدا ہونے والی حضرت خدیجہؓ عورت تھیں۔ حضور نے جان بھی دی تو حضرت عائشہؓ کے زانو پر جن کے علم سے نصف دین محفوظ ہوا۔ اس طرح عورت کا اسلام پر عظیم الشان احسان ہے۔ حضرت عمرؓ اتنے شدید تھے کہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ بلکہ سلاطین تک آپ سے مرعوب رہتے۔ لیکن آپ کی بی بی خفا ہوتیں تو مسکرا دیتے اور فرماتے کہ آخر یہ کمزور عورتیں ہیں۔ حضورؐ بیمار یہودی کی عیادت کو کئی بار تشریف لے جاتے۔ لیکن یہاں گھروں میں خود اپنے بیوی بچے بیمار تڑپتے رہتے ہیں تو بعض مولوی، مشائخ کو جنبش نہیں ہوتی۔ قوالی اور وجد و حال میں مشغول رہتے ہیں۔ افسوس ہے

(۲۳) شیعہ، سُنّی کا تصفیہ

فرمایا۔ شیعوں کے مُقررین اپنے خاص خاص مسائل میں تحقیق کر کے ذہانت سے بات میں بات نکالتے ہیں۔ اداکاری اور اشاروں کی سال بھر مشق کر کے بہتر سے بہتر شکل میں، محرّم میں اپنی تقریروں کو پیش کرتے ہیں، کمال دکھاتے ہیں۔ لیکن ہمارے سُنّی مولوی صاحبان اعلیٰ سے اعلیٰ مسائل رکھتے ہوئے اکثر بلا تیاری تقریر کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

شیعہ حضرات کا دعویٰ ہے کہ اِن کے مذہب کی خصوصیت حُبِّ اہلِ بیت ہے لیکن اُن کے نزدیک حُبِّ اہلِ بیت بغیر بُغضِ صحابہ متحقق نہیں۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اِن کی خاص خصوصیات تبرّیٰ۔ تقیّہ۔ متعہ اور عیدِ غدیر ہیں۔

ایک بہت بڑے سُنّی عالم جن کی بیش قیمت کتابیں مسوّدات کی شکل میں موجود

ہیں شیعہ سنی مسئلہ پر ان کی صرف ایک جلد چھپی ہے۔ اُن سے ایک دفعہ سالار جنگ اوّل نے کہا مولانا! آپ سُنّی شیعہ مسئلہ کے متعلق کوئی ایسی بات بتائیے کہ آسانی سے تصفیہ ہو جائے۔ فرمایا! بہت آسان ہے بشرطیکہ ایک بات تسلیم ہو جائے۔ وہ یہ کہ حضرت علیؓ صادق القول اور صادق العمل تھے تو سُنّیوں کا مسلک صحیح ہے۔ اور اگر حضرت علیؓ صادق القول، صادق العمل نہیں تھے بلکہ تقیہ کرتے تھے تو شیعوں کا مسلک صحیح ہے۔

عجیب بات ہے کہ شیعہ صاحبان حضرت علیؓ کی رفعت وشان کو خطرہ میں ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے حضرت صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ساتھ تقیہ کیا اور مجبوراً ان کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ اس کے برخلاف سُنّی کہتے ہیں جو امر واقعہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ شجیع اور اسد اللہ الغالب تھے۔ آپ نے خلفاء راشدین کو حق پر جان کر اُن کا ساتھ دیا اور تعاونِ عمل فرمایا۔ البتہ جس مسئلہ میں اختلافِ رائے ہوتا، آپ بلا تامل قوت وجرأت سے صاف صاف ظاہر فرما دیتے تھے لیکن مخاصمت ومخالفت ہرگز نہ تھی۔

(۲۴) اعصاب کی خرابی کا نتیجہ

فرمایا۔ اس زمانہ میں صحت کی خرابی کا ایک خاص سبب اعصاب کی خرابی ہے۔ اعصاب کس طرح اچھے رہیں گے۔ جب اچھا کھانا، خالص دودھ مسکہ نہیں ملتا۔ گرم جنگ اور سرد جنگ کی وجہ سے ذہنی پریشانیاں الگ ہیں۔ معاشی مشکلات اور گرانی مزید برآں ہیں۔ اور اخلاقی خرابیاں اس پر مستزاد ہیں۔ اعصاب کی صحت ودرستی کے لئے روحانی اقدار، صبر، تسلیم، رضا کا علم ضروری ہے۔ جس کی طرف آج کل توجہ نہیں۔ دین مُسکّن ہے۔ اور روحانی قوت ہی اعصابی امراض کو اچھا کر سکتی ہے۔ اس وقت دنیا کی مملکتوں کے باہمی مناقشے، جنگیں، ہڑتالیں، اعصاب ہی کی خرابی کا نتیجہ ہیں۔ ایک بڑے ماہرِ نفسیات کی رائے ہے کہ اعصاب کی خرابی کے نتیجہ میں موجودہ تہذیب وتمدن کا جنازہ نکل جائے گا۔

آج کل دنیا کے طاقتی بلاک باہمی بے اعتمادی اور غصہ کی وجہ سے ہائیڈروجن بم جیسے خطرناک اسلحہ کی تیاری کی مجنونانہ مسابقت میں مبتلا ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت خودکشی پر تلی ہوئی ہے۔ نہ معلوم کس گھڑی کیا ہو جائے۔ اعصاب کی خرابی کی پہچان یہ ہے کہ وہ اچھے تعمیری رُخ پر کام نہیں کرتے بلکہ انسان تخریبی اعمال پر اُتر آتا ہے۔ حتیٰ کہ خودکشی کر لیتا ہے۔ فرد ہو یا خاندان، قوم ہو یا ملک بلکہ ممالک سب کا یہی حشر ہوگا۔ اب پہلے کی سی اچھی اعصابی حالت واپس لانے کے لئے ایک سے زیادہ نسل درکار ہے۔ اعصابی خرابی کی وجہ سے نوبت یہ ہے کہ دنیا کے اربابِ حکومت اور عہدہ داروں میں اصابتِ رائے اور عزمِ صمیم کا فقدان ہوتا جارہا ہے۔ آئے دن اپنے فیصلے بدلتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ذہنی انتشار برپا ہے۔ حیرانی بڑھ رہی ہے۔ کارکردگی متاثر ہو رہی ہے۔ اگر ان کو اپنے اعصاب کی خرابی کا علم ہو جائے تو ان کے فیصلے ٹھیک ہونگے۔ خود اعتمادی توازن کا نام ہے۔ اسی لئے اسلام میں غصہ یا رنج کی حالت میں فیصلہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

(۲۵) امراض کی اصل اور علاج

بیماریوں میں دل بڑا کام کرتا ہے۔ بیماری اور پریشانی اول دل کو متاثر کرتی ہے۔ اور اس کا ردِ عمل تمام اعصاب وعضلات پر ہوتا ہے۔ لیکن موجودہ ڈاکٹر صرف عوارض وعلامات پر نظر رکھ کر علاج کرتے ہیں۔ اور قلب، دماغ، اعصاب کے ردِ عمل کو بیماری سے جو تعلق ہے اس کا تدارک نہیں کرتے۔ چنانچہ ماہرینِ نفسیات واعصاب کی جدید تحقیق یہ ہے کہ موجودہ ڈاکٹر چند سال میں بیکار ہو جائیں گے۔ آج کل اس علم کی طرف زیادہ توجہ کی جارہی ہے اور بڑے بڑے لا علاج مریضوں کا نفسیاتی طریق پر علاج کیا جارہا ہے۔

قلب کا اثر اعصاب پر، اور اعصاب کا اثر جسم پر ہوتا ہے۔ عمدہ سے عمدہ

غذا کھائے، اگر دل پریشان ہو تو فائدہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ زہر ثابت ہوتی ہے۔ غصہ اور پریشانی میں صاف خون بھی زہر بن جاتا ہے۔ ایک روز کی پریشانی ایک سال کا بیمار بنا دیتی ہے۔ اور ایک روز کی حقیقی مسرت مدتوں کی گئی ہوئی صحت کو واپس لا سکتی ہے۔ دل و دماغ کے سکون کے لئے یورپ والے شراب پی کر سو جاتے ہیں اور دماغ کو آرام دیتے ہیں یا حیوانی افعال ناچ گانے کے ذریعہ سکون حاصل کرتے ہیں، لیکن اصلی اطمینان قلب کو مسلمان اعلیٰ مرتبہ میں ذکر اللہ کے ذریعہ حاصل کرتا اور بیروزگاری کی پریشانی میں رزاقیت کے علم اور بیماریوں میں یا شافی کافی کے اسماء سے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

قلب کا اثر جسم پر کتنا پڑتا ہے اس کی وضاحت میں ایک کتاب میں یورپ کا ایک مشہور مستند واقعہ درج ہے۔ ایک نوجوان سترہ سالہ لڑکی بد اخلاقی کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ پولیس نے اسے رات بھر حراست میں رکھا معلوم ہوتا ہے وہ اچھے اخلاق کی شریف لڑکی تھی اور غیر معمولی حساس تھی۔ اس کے قلب پر اس کا ایسا اثر پڑا کہ وہ صبح تک ستر سال کی بوڑھی معلوم ہونے لگی۔ چہرہ پر جھریاں پڑ گئیں اور بال سفید ہو گئے۔ صبح کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ بعد کو طبی رائے لی گئی کہ کیا اس طرح کوئی بارہ گھنٹے میں پچاس سال کی عمر طے کر سکتا ہے تو ماہرین طب نے فیصلہ دیا کہ یہ چیز غیر معمولی قلبی تکلیف میں ممکن ہے۔

یہ دراصل ہمارے قرآنی دعویٰ کی ایک تصدیق ہے۔ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا (۲۹/۱۳)۔ (سو اگر تم کفر کرو گے تو اس روز (قیامت) سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا)۔ اعصابی صدمہ سے بعض لوگ منٹوں میں لنگڑے، کوڑھے ہو جاتے ہیں۔

(۲۶) کھانے کے اثرات قرآن و حدیث کی رو سے اہلِ کتاب کے پاس کا ذبیحہ اور کھانا جائز ہے۔ مشرکین

کا ذبیحہ جائز نہیں۔ البتہ مشرکین کے پاس کا کھانا کھانے کی دین میں اجازت ہے۔ اس رخصت و اجازت سے استفادہ بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن رخصت اور ہے، عزیمت اور ہے۔ اس لئے بعض اہل دل جن کی نظر باطن پر ہوتی ہے ایسے کھانوں کے ناموافق آثار دیکھتے ہیں تو کھانے سے احتراز کرتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے بچپن سے مجذوب تھے۔ ان پر بعض وقت جذب کا ایسا غلبہ ہوتا کہ برداشت نہ کر سکتے۔ ایسے موقعوں پر حضرت کسی غیر مسلم کی دوکان سے مٹھائی منگوا کر کھلا دیتے تو کیفیت کم ہو جاتی تھی۔

(۲۷) موت۔ بیماری ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے ساری عمر کے تجربوں کا خلاصہ یوں بیان کیا کہ کوئی شخص مرض سے نہیں مرتا۔ اور دوا سے اچھا نہیں ہوتا۔ موت آتی ہے تو مرتا ہے۔ البتہ دوا وغیرہ کرنا چاہیئے، اس سے انکار نہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ دوا سے اچھا ہو جائے۔ اس ڈاکٹر نے اپنی اس بصیرت کا بھی اعلان کیا کہ موت کا مرض سے برائے نام بھی تعلق نہیں۔

ڈاکٹروں کا تجربہ ہے اور اعتراف ہے کہ اللہ تعالیٰ بے اسبابی اور مایوسی میں کام بناتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی ظاہری امید نہ ہو اور نہ دوا ہو تو مریض کو مایوس کن منزل میں اللہ صحت و حیات بخشتا ہے، عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب حیات کے سب سامان ہوں، اچھا خاصا ہو، عمدہ دوائیں، ماہر ڈاکٹر موجود ہوں اور یہ خیال ہو کہ وجود سے تو وجود کا فیضان آنا چاہیئے، ان کو کالعدم کر دیتا ہے اور موت آجاتی ہے۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ۔ (۳/۱۱)

(۲۸) مسلمانوں کی بدگوئی کا مرض فرمایا۔ آج کل مقررین کا

ایک طبقہ نکلا ہے۔ جو تقریروں میں ہمیشہ مسلمانوں کی برائیاں گنتا رہتا ہے۔ انھیں مسلمانوں کی خوبیاں نظر نہیں آتیں۔ ہر وقت برائیوں کا واویلا ہے کہ تم برے، تم ذلیل، تم خراب۔ یہ لوگ قابلِ بازپرس ہیں۔ جہالت کی وجہ سے وہ نہیں جانتے کہ عوام پر اس کا کتنا برا نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ قدیم اطباء مریض کے سامنے کبھی مرض کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ البتہ علاج کرتے تھے لیکن جدید ڈاکٹر مریض کے سامنے ہی کہتے ہیں۔ چوبیس ۲۴ گھنٹے مریض خطرہ میں ہے۔ مریض کہتا ہے۔ جب ہم خراب ہیں، مایوس العلاج ہیں تو دوا، پرہیز کی کیا ضرورت ہے۔ مایوس ہو کر لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ اصلاح کے بجائے فساد بڑھتا جاتا ہے۔ اگر بیماری سخت نہ بھی ہو تو مریض کی نفسیات اور اعصاب پر اس کا بہت برا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اور وہ وہمی ہو کر واقعی سخت بیماری کی ذہنیت پیدا کر لیتا ہے۔

ان مقررین کو کافر، عاصی اور صالح کا فرق معلوم نہیں۔ قرآن نے کافر کو مردہ کہا اور عاصی کو بیمار اور صالح کو صحت مند۔ بے شمار مسلمان بیمار ہیں۔ لیکن بیمار مردوں کے مقابل ہزار درجہ بہتر ہیں۔ مردے کو دفن کرتے ہیں، بیمار سے آس بندھی رہتی ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیمار صحت مندوں سے خراب ہے، نہ کہ مردوں سے۔ مردہ چاہے کتنے ہی قیمتی ریشمی کفن میں ملبوس ہو۔ مردہ مردہ ہے۔ اور بیمار زندہ ہے۔ مسلمانوں کو کبھی اس طرح ذلیل، حقیر، پست ہمت نہ کریں۔ البتہ تندرست بننے کی ہدایت کریں۔ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا۔ اگر رائی برابر ایمان والے کا نور اس عالم میں کھل جائے تو زمین آسمان اس نور کی تاب نہ لا سکیں۔ حضورؐ والا سے ادنیٰ نسبتِ غلامی رکھنے والا، دوسری قوموں کے لاکھ اچھوں سے بہتر ہے۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے آج بھی مسلمان، اخلاقی برائیوں

میں دیگر اقوام سے ہر طرح کم ہیں۔

اسلام کا مستقبل بہت امید افزا ہے۔ نوجوانوں کی غلطیوں سے مایوس نہ ہوں۔ انہیں میں اللہ، رسولؐ کے فدائی موجود ہیں۔ میں معترضین کی ایسی لڑکیوں، لڑکوں کو جانتا ہوں جو چھپا چھپا کر دن رات تحفۂ محمدیؐ کی نعتیں پڑھتے رہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک نوجوان ابو محجن ثقفی کو جنگ کی چھاؤنی میں امیرِ لشکر نے شراب نوشی کے الزام میں قید کر دیا تھا۔ جب جنگ کا معرکہ شروع ہوا تو اس نے بے چین ہو کر نگران سے اجازت لی اور جہاد میں غیر معمولی کارنامے انجام دیئے اور پھر قید خانہ میں آکر بیڑیاں پہن کر بیٹھ گیا۔ اِس سے متاثر ہو کر امیرِ لشکر نے اُسے رہا کر دیا۔ تو اُس نے از خود شراب سے توبہ کر لی۔

افسوس ہے کہ آج کل مسلمانوں میں احساسِ کمتری پیدا کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ خرابیاں ایک حد تک صحیح ہیں لیکن طریقِ علاج غلط ہے جس سے مرض گھٹنے کے بجائے بڑھ رہا ہے۔ ان کو قرآن سے بتایا جائے کہ اسلام امید کا مذہب ہے۔ نا امیدی کفر ہے۔ اللہ شافی، کافی، قدیر ہے تو دل کو ڈھارس بندھے گی۔ توبہ سے مرہم پٹی ہو۔ درود سے سکون ہو۔ توبہ میں حُب کی تجلّی ہے۔ دنیا میں مرض کی دھوم نہ ہو۔ صرف چند مخلص، ہمدرد کارکن مطلع رہیں۔

مومن کا پوزیشن بہت اعلیٰ ہے۔ ارشاد ہے۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۴/۴)۔ یہاں مجرد ایمان کی نسبت سے مومن کی رفعت بتائی گئی ہے۔ دوسری جگہ غیر مومنین کے متعلق ارشاد ہے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۹/۱۲)۔ یہاں مجرد کفر کی بناء پر کفار کی انتہائی پستی بیان کی گئی ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان انسانوں سے معاملہ کرنے میں ایمان کی عظمت اور کفر کی پستی کی نسبتوں کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ اور دنیوی وسائل و اسباب کی کمی زیادتی سے انسانی

قدر و قیمت کا تعین نہیں کرتے تھے۔ اسلام کے بعد غریب عرب، قیصر و کسریٰ کے درباروں کی شان و شکوہ سے ذرّہ برابر مرعوب نہ ہوتے۔ بلکہ دربار کے قالینوں پر گھوڑوں کو لے جاتے۔ یہ سب اللہ کی ربوبیت پر ایمان و توکّل اور حضورؐ کی محبت کا اثر تھا لیکن آج مسلمان امریکہ و روس سے مرعوب ہو رہے ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ اگر اُن کے پاس دماغی علوم ہیں تو ہمارے پاس اعلیٰ روحانی علوم ہیں۔ جو ان سے بدرجہا بہتر ہیں۔ پھر کمتری کیوں محسوس ہو۔ اگر ایک شخص پھٹے کپڑوں میں جھونپڑے میں رہتا ہو لیکن بنک میں اس کا کروڑ روپیہ ہو تو اس کا دل مطمئن رہتا ہے۔ وہ بڑی کوٹھی والوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ تو پھر مومن حُبِّ اللہ اور حُبِّ رسولؐ کے بعد جنّتِ نعیم کے وعدوں پر کیوں مطمئن نہ ہو۔ حکم ہے۔ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ .... وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (۳۰) دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ الخ (۲۰/۱۳۱) یعنے کافروں کی دُنیوی نعمتوں پر نظر نہ کرو۔ مومن کافروں تک کے لئے رحمت ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا میں عذاب نہیں آتا۔ استغفار کرنے والا ایک مومن بھی جب تک دنیا میں موجود ہے، قیامت قائم نہ ہوگی۔

فصل نہم

حضرت کے تعلقات

فرمایا۔ ہماری زندگی بے ہمہ اور باہمہ کا عجیب نمونہ رہی

(۱) بے ہمہ ۔ باہمہ ہے۔ ایسی زندگی میں امن و عافیت بہت ہے۔ ہر طریقہ سے گہرے تعلقات، اور پھر کوئی تعلق نہیں۔ اپنے علم و عمل میں مکمل آزادی۔ جو چاہیں ہو کریں کوئی پابندیاں نہیں۔ تعلقات کی کثرت کے باوجود بے تعلقی۔ سب میں شامل، سب سے الگ۔ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ رائی برابر قلب پر گرانی نہیں۔ ذمہ داری کی فکر نہیں۔ اللہ کے بھروسے اس قسم کی زندگی اختیار کی ہے۔ اس کی حفاظت پر بھروسہ ہے۔ انشاء اللہ

(۲) معاشرتی تعلقات میں تین باتیں قابلِ لحاظ ہوتی ہیں۔ (۱) بڑے بزرگ ہوں تو نیاز مندی کے تعلقات مناسب ہیں۔ بشرطیکہ وہ مستحق ہوں۔ ورنہ نری نیاز مندی تکلیف دہ ہو جاتی ہے

(۲) اگر وہ مالی اعتبار سے بلند ہوں تو اپنی مختصر آمدنی میں اُن کا ساتھ دینا اور تعلقات نباہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مساوات کی اساس پر ملنا مناسب ہے۔ ورنہ تعلقات کا لطف نہیں۔

(۳) قرآن میں اقربا وغیرہ کے ساتھ حُسنِ سلوک پر زور ہے لیکن احسان نہ جتائیں۔ اخلاقی فرض سمجھ کر خدمت کریں۔ خوشامد، لجاجت مطلوب نہ ہو۔ محبت و ربط کا اقتضا یہی ہے۔

جماعتی سیاسیات بُری بلا ہے۔ اس میں ضمیر کو دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔ ضمیر فروشی کرنی پڑتی ہے۔

(۳) تعلقات اور اخلاص

تعلقات کا معاملہ بہت نازک ہے۔ جمع تفریق کے بعد میزان، باقی پر حکم لگتا ہے اسی میں نفاق، اخلاص، رانگے سونے، کچے پکے کی پہچان ہوتی ہے۔ انجنوں میں فولاد کی چھوٹی چھوٹی پٹیاں ہوتی ہیں جن پر خوب دھچکے پڑتے ہیں۔ اگر وہ فولاد ہے تو جھوک کھا کر ادھ جھک کر پھر اپنی اصلی حالت پر آجائیں گی۔ اور کچا لوہا ہے تو ٹوٹ جائیں گی۔ تعلقات کے سمندر میں اوپری عارضی طوفانی لوٹوں سے غلط رائے نہیں قائم کرنا چاہیئے بلکہ سمندر کی تھاہ میں سکون ہو اور موتی ہوں تو ظاہری لوٹوں کی وجہ سے سمندر سے تعلق نہ توڑنا چاہیئے۔ اخلاص اور فہم صحیح نہ ہو تو توازن بگڑ جاتا ہے۔

ہماری دوستی، دشمنی کا معیار عام لوگوں سے جدا ہے۔ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ہمسایہ جی یم خاں صاحب انجینیر سے چھت کے معاملے میں ہماری خوب نزاع عدالت میں چل رہی تھی۔ اسی دوران میں ایک دن میں نے اُن سے کہا چھت کی لڑائی کا ہمارے صحن سے تعلق نہ ہونا چاہیئے۔ آپ فنی لحاظ سے ہمارے صحن کے ستونوں کے متعلق مشورہ دیں۔ چنانچہ انھوں نے نہایت اچھا مشورہ دیا۔ جنہوں نے دیکھا، سُنا، ہم دونوں کے اس عمل پر دنگ ہو گئے۔

(۴) حکیم سیّد زینُ العابدینؒ

میں نے اپنی زندگی میں بہت تھوڑے آدمی ایسے دیکھے جن کی زندگی اُصولی تھی۔ اور زندگی میں توازن تھا۔ اکثر مُرشدین کے علم و عمل میں کوئی اُصول دیکھنے میں نہیں آتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ پیدا ہوتے ہی اللہ کے پیاروں میں آنکھیں کھولیں۔ میرے بچپن میں قصبۂ خورجہ میں حکیم سیّد زینُ العابدین نامی ایک بزرگ رہتے تھے۔ سنداً صحیحُ النسب سادات سے تھے۔ کسی پر اس کا اظہار پسند نہ فرماتے۔ حکیم صاحب بہادر شاہ ظفر کے ساتھ لال قلعہ میں رہتے تھے۔ غدر میں انگریزوں نے ان کے بہت سے

افرادِ خاندان کو شہید کر دیا۔ صرف حکیم صاحب بچ گئے۔

حکیم صاحب کے ساتھ بیوی اور تین بیٹیاں خورجہ میں رہتی تھیں۔ جن میں منتخب نفاست و صفائی کا اہتمام، لیکن اکثر فقر و فاقہ رہتا۔ میں نے صبر، تسلیم، رضا کے اعلیٰ مقام کا کوئی بندہ اِن سے بہتر نہیں دیکھا۔ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ حکیم صاحب اور اُن کا خاندان تین تین دن تک صرف نمک کی کنکریوں اور پانی پر بسر کر کے روزے رکھا کرتے تھے۔ لطف یہ کہ کبھی زبان پر حرفِ شکایت نہیں۔ بلکہ الحمد للہ رہتا۔ پھر صحت لاجواب تھی۔ اکثر ایک جوڑا کپڑا ہوتا۔ کرتہ پہن کر پاجامہ دھو لیتے اور پاجامہ پہن کر کُرتہ دھو لیتے۔ پھر صاف سُتھرا لباس پہن کر باہر نکلتے۔ لوگوں کو ان کی اِس حالت کا گمان بھی نہ گزر سکتا تھا۔

حکیم صاحب مغرب کے فوراً بعد ہمارے گھر تشریف لاتے اور بارہ ایک بجے واپس تشریف لے جاتے۔ اکثر قلعۂ معلّٰی اور غدر کے چشم دید واقعات بیان فرماتے۔ حضرت بختیار کاکیؒ، حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ اور حضرت چراغ دلّیؒ کے عرس اور قوالیوں کے احوال بیان فرماتے اور بیان کے وقت وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ پنجتنِ پاک کے ذکر سے بے تاب ہو جاتے۔ تھرتھرانے لگتے۔ رِقّت کا وہ زور کہ جھڑی لگ جاتی۔

حضرت کے مقام کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا جو سر افسرُ الملک بہادر نے خود مجھ سے بیان کیا۔ جب مرحوم اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں دلّی دربار گئے تو دلّی میں حضرت شاہ ابوالخیر گنج نشین سے ملنا چاہا۔ حضرت نے انکار فرمایا۔ اس کے باوجود اعلیٰ حضرت آستانہ پر پہنچے۔ تو بھی انکار فرمایا۔ پوزیشن نازک ہو گیا بالآخر بمشکل اندر آنے دیا۔ اعلیٰحضرت نے دُور کھڑے ہو کر سلام کیا اور اشرفیوں کی کشتیاں نذر پیش کیں۔ حضرت نے فرمایا۔ مجھے اُن کی ضرورت نہیں۔ غریبوں میں

تقسیم کردو۔ اس کے بعد نصیحت کے لئے عرض کیا، تو فرمایا۔ تم کو رعایا کی فلاح
وبہبود پر توجہ کرنی چاہیئے۔ لیکن تم ہمیشہ وظیفے پڑھنا چاہتے ہو۔ اگر اللہ کو وظیفے
پڑھوانا ہوتا تو تم کو بادشاہ کے گھر کے بجائے کہیں اور پیدا کرتا۔ اس حکمت کے
شاہ ابوالخیر کے پاس جب حکیم زین العابدین صاحب تشریف لے جاتے، تو وہ ادب
سے اٹھ کر کھڑے ہوجاتے۔ اور کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ سے وضو کراتے۔ اور اپنا
بستر ان کے آرام کے لئے دیتے اور خود نیچے سو جاتے۔

جب حکیم صاحب کا وصال ہونے لگا تو میں علی گڑھ میں ایف۔ اے سال دوم
میں پڑھتا تھا، فرمایا "میں دنیا سے مطمئن جا رہا ہوں۔ البتہ الیاس برنی صاحب کی
عدم موجودگی کو محسوس کرتا ہوں۔ ان کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ مجھے دعاؤں میں یاد
رکھیں اور ان کو میں اپنی دعاؤں میں یاد رکھوں گا"۔ چنانچہ میں روز ان پر فاتحہ پڑھتا
ہوں۔ روز کی ملاقات حاضری رہتی ہے۔

(۵) مولانا خلیل احمد پروفیسر علی گڑھ

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیں ہمیشہ بڑے بڑے اولیاء اللہ
کی رفاقت نصیب رہی۔ علی گڑھ میں مولانا خلیل احمدؒ اور حضرت عبداللہ شاہؒ کی
خاص عنایتیں تھیں۔ ہفتہ میں کم از کم دو تین ملاقاتیں لازم تھیں۔ مولانا خلیل احمد
علم و عرفان میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سادگی کے ساتھ رعب تھا۔ بڑے
فرسی، قیافہ شناس، نفسیات داں، امراضِ ظاہر و باطن کے ماہر تھے۔ عربی، فارسی
اردو میں تبحر حاصل تھا۔ انگریزی پر اچھا عبور تھا۔ ان کے بیان میں تکرار نہیں دیکھی گئی
کوئی مسئلہ ہو، ہر دفعہ نئے انداز میں پیش فرماتے۔ بڑے بڑے انگریزوں جرمنوں
سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ سب ان کے سامنے اپنے کو جاہل محسوس کرتے
تھے۔ ایک بڑے یوروپین پروفیسر نے کہا۔ اتنا فرسی اور اعلیٰ ذہانت اور

دماغ کا انسان میں نے یوروپ میں بھی نہیں دیکھا۔ ایک مشہور انگریز لیڈی نے
اسلام کی مخالفت میں ایک کتاب لکھی اور مولوی صاحب سے بحث کی۔ بڑی ناگن
تھی۔ بچ بچ کر نکل جاتی۔ حضرت نے ایک مہینہ میں اس کی زہر کی پوٹلی نکال دی
جس کے بعد اس نے اس کتاب کی طباعت کا خیال ترک کردیا۔ مولوی عزیز مرزا
صاحب کہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا شبلیؒ کے مقابلے میں دس بیس فی صد
میں بھی لکھ بول سکتا ہوں لیکن خلیل احمد صاحب کے سامنے اپنے کو صفر محسوس
کرتا ہوں۔

نواب سالار جنگ وزیر اعظم ریاستِ حیدرآباد دورانِ درس میں ان کی کلاس
میں پہنچے۔ ان کا درس سن کر ایسے متاثر ہوئے کہ ان کی کرسی کے پایہ کے پاس ادب
سے نیچے بیٹھ گئے۔ یہ عظمت تھی فخرانِ اسلام کی۔ شاہِ افغانستان امیر حبیب اللہ
خاں علی گڑھ آئے تو دینیات میں طلبہ کا امتحان لینا چاہا۔ سب پریشان ہوگئے
حضرت نے فرمایا۔ آنے دو۔ چنانچہ جب وہ آئے حضرت کی جماعت میں داخل ہوئے
اور ایک طالب علم سے کہا۔ تم قرآن سناؤ۔ اتفاق سے وہ بہترین قاری تھا۔
اس نے اس خوبی سے پڑھا کہ امیر صاحب پر رقت طاری ہوگئی۔ اتنا روئے
کہ رومال تر ہوگئے اور کالج کے متعلق اچھی رائے قائم کی۔

ایک دفعہ حضرت (برنی صاحب) نے مولانا سے عرض کیا۔ حضرت۔ آپ اعلیٰ
دینی اعتبارات بیان فرماتے ہیں۔ مناسب ہوگا اگر مفادِ ملت کے لئے ان
حقائق کو قلمبند فرمائیں۔ ایک دن فرمانے لگے۔ تمہارے کہنے پر میں لکھنے بیٹھا۔
لیکن سیاہی خشک ہونے تک اور اعلیٰ اعتبارات آتے ہیں۔ اس لئے لکھ
نہیں سکتا۔ کوئی چاہے تو سن کر نوٹ کرلے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر بیرسٹر آفتاب
احمد خاں کو چھ ماہ پڑھائی اور قلمبند کرادی۔ اور فرمایا۔ تمہاری موٹی مانوفی عقل

کے لئے اتنا کافی ہے۔ ورنہ اس کے حقائق کی حد نہیں۔

(۶) حضرت عبداللہ شاہ - علی گڑھ

قادری تعلیم میں زندگی امر کے تحت رہتی ہے۔ بے ارادتی کے مقام پر رہنے کی وجہ سے من اللہ انتظامات ہوا کرتے ہیں۔ اپنی ارادت سے یا اجازت سے جو کام ہو اس کی ذمہ داری ہم پر رہتی ہے۔

علی گڑھ میں حضرت عبداللہ شاہ صاحب بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ اسکاٹ لینڈ کے ایک بڑے خاندان کے فرد تھے۔ لارڈ ہیگ پہلی جنگِ عظیم کا کمانڈر حضرت کا عزیز تھا۔ ان کے والد ۱۸۶۵ء میں ہندوستان کے پوسٹ ماسٹر جنرل تھے۔ جرمنی سے آپ نے طب کی ڈگری لی۔ اچانک دل میں کیا آئی کہ بغدادِ شریف حاضر ہوئے اور اسلام قبول فرمایا۔ اس کے بعد ہندوستان آئے۔ گلاب سا چہرہ۔ چوڑا چکلا سینہ۔ مردانہ حسن کا بہترین نمونہ تھے۔ مزاج میں بے حد نفاست تھی۔ کمرہ میں ہر وقت عطر، گلاب، پھول مہکتے تھے۔ خوش مزاج تھے۔ بچے بہت مانوس تھے۔ عمر بھر تجرید میں بسر کی۔ تکلّف، تمتّع، ترفّع، شہرت طلبی، جاہ طلبی نام کو نہ تھی۔

نسبتِ غوثیہ کے فرد تھے۔ توجہ زبردست تھی۔ سلوک سے فراغت ہو چکی تھی۔ صاحبِ خدمت تھے۔ باطنی حکومت کا مظہر تھے۔ آپ کا کشفِ کونی نہایت صاف اور قوی تھا۔ آن کی آن میں بتا دیتے کہ عالم میں کیا ہو رہا ہے۔ ریڈیو سینما کا سا تماشا معلوم ہوتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں بہت دنوں بعد ہونے والے واقعات پہلے ہی بیان فرما دیا کرتے تھے۔ ایک دن کلکٹر ضلع نے کہلایا۔ آپ سیاسی معاملات میں دخل نہ دیں ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ جلال میں آگئے اور جواب میں کہلایا۔ تیری ماں اس وقت لندن کی فلاں

گلی میں ترکاری بیچ رہی ہے۔ اور تیرا باپ دھوبی ہے۔ تو قسمت سے کلکٹر بن گیا تو دماغ خراب ہوگیا۔ ہم برٹش گورنمنٹ کی تباہی چاہیں گے تو کیا وہ ٹھہر سکتی ہے۔ وہ کانپ گیا اور معافی کے لئے حاضر ہونا چاہا لیکن آپ نے آنے کی اجازت نہیں دی۔

جنات سے قوی ربط تھا۔ جنات تو گویا آپ کے گھر کی بلیاں تھے۔ جب کہو لا دیتے۔ جن، بھوت، جادو کے مایوس العلاج مریض بفضلہ حضرت کے حکم یا تعویذ سے فوراً صحت یاب ہوتے میں نے دیکھے۔ حضرت ہم پر بے انتہا مہربان تھے۔ ایک شبِ قدر میں فرمایا۔ میں تم کو اسمِ اعظم اور 'کن' دینا چاہتا ہوں کہ جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل تمہارے موکل بن جائیں گے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ تمہیں ملائکہ اور جنات کی تسخیر حاصل ہوگی۔ تمہاری پیشانی میں غیر معمولی نور ہے۔ میں تمہیں کشفِ کونی دینا چاہتا ہوں کہ سارا عالم کھل جائے گا۔ کمالات حاصل ہوں گے۔ یہ صفت تم میں مضمر ہے۔ خاص خاص اشغالِ مقیدہ بہ سہولت طے کرانا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت! آپ ان کمالات کو حکم کے تحت دینا چاہتے ہیں یا اجازت کے تحت۔ فرمایا۔ اجازت کے تحت۔ میں نے کہا۔ قادری تعلیم کی رو سے حکم کے بغیر میں لینا نہیں چاہتا۔ بے کمالی تحقیق ہو جائے تو انسان کا سب سے بڑا کمال ہے۔ اس پر گلے لگا لیا۔ اور فرمایا۔ "تمہاری استعداد و طلب بہت بلند ہے، میں نے محبت کا حق ادا کرنا چاہا تھا۔"

ہزار کمالات ہوں، عبدیت ہی اصلی اور انتہائی مقام ہے علی قدرِ مراتب۔ اور پھر جو کچھ عطا ہوتا ہے اس میں نقصان کا خوف نہیں۔ حفاظت یقینی ہے۔ کسب کئے ہوئے کمالات میں وہ بات کہاں۔ کرامت اور تصرف میں یہی فرق ہے

لیکن بعض بزرگ کسبِ کمال کے راستے سے بھی عبدیت تک پہنچتے ہیں۔ اپنا
اپنا سلوک ہے۔

(۷) فضیلت جنگ حضرت انوار اللہ شاہ صاحب

اللہ شکر خورے کو شکر کھلاتا ہے۔ خورجہ اور علی گڑھ کے اولیاء اللہ کی صحبتوں سے نکلے تو یہاں
حیدرآباد میں دادا پیر حضرت کمال اللہ شاہؒ، پیر و مرشد حضرت مولانا محمد حسینؒ
ناظم عدالت، مولانا عبد القدیر صدیقی حسرتؔ صدر شعبہ دینیات، مولوی صفی الدینؒ
صاحب مدراسیؒ ناظرِ دار الترجمہ، اور نواب فضیلت جنگ انوار اللہ شاہؒ صدر المہام
امور مذہبی سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ مولوی صفی الدین صاحب کہتے۔ میں نے
حرمین شریفین کے اسرار آپ کے سوائے کسی پر ظاہر نہیں کئے۔ حتیٰ کہ میری اولاد
بھی اس میں شریک نہیں۔

مولانا انوار اللہ شاہ صاحب اعلیٰحضرت حضور نظام نواب میر عثمان علی خان
کے اُستادِ خاص تھے۔ بڑے ذی اثر، بارعب اور حکومت میں بے حد دخیل۔
عجب شخصیت کہ اس کے رسوخ سے حکومت کا پلڑا جھک جائے، اکابرِ ملت
کی شان نظر آئے۔ تبحرِ علمی کا یہ عالم کہ تقریباً سو تصانیف چھوڑیں۔ میں نے ایک
جرمن عالم کو ان کی چند کتابیں بھیجیں تو اس نے تین یونیورسٹیوں کو دیں اور مجھے
لکھا کہ ہندوستان میں صحیح معنی میں مجھے یہی عالم معلوم ہوتے ہیں۔ میں ان سے
ملنے حیدرآباد آنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ جنگِ عظیم میں گرفتار ہو گیا۔

حضرت ہم پر بہت مہربان تھے۔ کبھی کبھی ہمارے ساتھ ایسی خصوصیت
ظہور میں آتی کہ حضرت کے اچھے اچھے مقربین حیران رہ جاتے۔ میرے حیدرآباد
آنے کے بعد حضرت کا بہت جلد وصال ہو گیا۔ ورنہ وہ جامعہ نظامیہ اور محکمۂ

امورِ مذہبی کے اُمور مجھے سپرد کرنے کے لئے فرمان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ گلانسی
وزیر فینانس حضرت کے اثر کو بہت مانتا تھا۔ اور نازک مشکل موقعوں پر مجھے
حضرت کو سمجھانے کے لئے بھیجتا تھا۔

۸ نواب عماد الملک مرحوم

حضرت کے ایک دوسرے ذی اثر اُستاد نواب عماد الملک معتمد تھے۔ ان سے بھی
بے حد محبت اور ربط ضبط رہا۔ اعلیٰ سطح کی اہم مراسلت میں نواب صاحب میری
رائے اور ڈرافٹ کے بغیر کوئی کام نہ کرتے جس پر بڑے بڑوں کو رشک تھا۔
میں عبد المجید صاحب مددگار سوم سکریٹری کے مکان پر اُن کی خواہش و اصرار پر
رہتا تھا۔ حیدری صاحب (جو بعد کو سر اکبر حیدر نواز جنگ وزیر اعظم بنے) نے
نواب مسعود جنگ کے ذریعے مجھے کہلایا کہ میں ان کے مکان پر نہ رہوں۔ اور نواب
عماد الملک اور گلانسی وزیر فینانس سے نہ ملا کروں۔ وہ میرے معاملات خود
طے کر دیں گے۔ میں نے پروانہ کی تو میری برطرفی کا نوٹ لکھا۔ اس پر نواب خدیو
جنگ نے نواب عماد الملک سے کہا۔ آپ کی محبت کی وجہ سے حیدری صاحب
برنی صاحب پر ستم ڈھا رہے ہیں۔ نواب صاحب نے مجھ سے فرمایا۔ اب تک
آپ نے مجھ سے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ میری محبت کی قدر نہ کی۔ میں نے
کہا۔ مجھے آپ کی محبت کی قدر ہے اور اسی محبت نے مجھے کہنے سے روکا۔
جس دن میں سمجھونگا حیدری صاحب قوی ہیں اُس دن کہونگا۔ اس کے
بعد میں نے کہا۔ کیا دوستی محبت کا یہی ایک مقصد رہ گیا ہے کہ میں آپ سے
اپنے مسائل حل کرنے کے لئے ملتا ہوں۔ کیا شرافت اور وضع داری دُنیا سے
غائب ہو گئی۔ اگر ایسا ہے تو میں آئندہ سے نہیں ملونگا۔ اس پر شرمندہ ہوئے
اور فرمایا۔ اب میں مطمئن ہو گیا لیکن عمر بھر میں اس قسم کی یہ پہلی مثال ہے۔

نواب صاحب میں بلا کا استغنا تھا۔ استغنار تھا۔ امیری کے ساتھ فقیری تھی۔ نوابی میں ولایت کر گئے۔ ان کی انگریز لیڈی حضرت غوثِ اعظمؒ کی گرویدہ تھی۔ اخیر زمانے میں نواب صاحب پر کشف و احوال بہت غالب تھے حضور انور صلعم اور حضرت علیؓ سے اس عالمِ شہادت میں شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ جسم بعض وقت نور میں تبدیل ہو جاتا تو حیرت کرتے۔ مجھ سے ذکر کرتے۔ میں نے حضرت غوث اعظمؓ اور حضرت مجددؒ کے مقالات پڑھ کر ان کے کشفی واقعات کی تصدیق کی تو تعجب کیا اور فرمایا۔ ہم تو جاہل دنیادار ہیں لیکن یہ سرفرازی ہے

نواب صاحب پکے ”سنی“ تھے۔ خلفائے راشدین کی خلافت کے قائل تھے حضرت فاروقِ اعظمؓ سے بے حد عشق تھا۔ ایک دن فرمایا۔ ہمارے شجرۂ نسب میں عمر نام کے بزرگ موجود ہیں۔ امّ المومنین حضرت عائشہ سے خاص عقیدت تھی۔ شیعوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ پروفیسر حسین علی خاں صاحب کی شادی معصومہ بیگم صاحبہ (سابق وزیر آندھرا) سے ہوئی۔ مجتہد صاحب نے نکاح پڑھایا۔ ختم پر میں نے مبارکباد دی۔ فرمایا۔ ذرا ٹھہریئے۔ ابھی نکاح ہوا کہاں۔ ابھی تو مجتہد صاحب نے صیغہ پڑھا ہے۔ اب قاضی صاحب نکاح پڑھائیں گے۔ چنانچہ سنی قاضی صاحب نے نکاح پڑھایا۔ اس کے بعد قاضی صاحب کی دعا میں جب ” کَمَا اَلَّفْتَ بَیْنَ حضرت محمد مصطفٰےؐ صلعم و حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا“ آیا تو زور سے ”آمین“ فرمایا۔

ایک دفعہ انھوں نے خواب میں حضور انور صلعم کو نماز پڑھتے دیکھا۔ حضورؐ نے ختمِ نماز پر سب صحابہؓ سے فرمایا۔ ”یہ میرا بچہ ہے“۔ اس کے بعد سے نواب صاحب اپنے نام کے ساتھ سیّد لکھنے لگے۔ حالانکہ پہلے بھی شجرہ محفوظ تھا۔ اسی طرح ہمارے والد صاحب بھی شجرہ محفوظ ہونے کے باوجود اپنے نام کے

ساتھ فاروقی نہ لکھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے ہمارے فاروقی ہونے کی توثیق فرمائی۔ اس کے بعد فاروقی لکھنے لگے

(۹) دوستی کے لوازم

دوستی، محبت میں کسی کے پیچھے پڑنا اور اپنے کام بنانے کی حکمتیں اور تدبیر بازیاں بُری چیز ہیں۔ شروع میں کام چلتا ہے۔ بعد کو بے وقعتی اور ذلت ہوتی ہے۔ خود غرضی ظاہر ہوتی ہے جو وضعداری کے خلاف ہے۔ ایسے مطالبوں پر انھیں کراہت ہوتی ہے۔ اور کراہت میں خیر و برکت نہیں۔ اس لئے غیروں سے معاملہ کرنا دوستوں سے معاملہ کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ بعض وقت دوست مدد کرنا چاہے بھی تو اُسے رُوکنا پڑتا ہے تاکہ دوستی کا مقصد ادنیٰ ذاتی اغراض کی تکمیل نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ یہی صورت نواب عماد الملک اور نواب مہدی یار جنگ وزیر تعلیمات سے تعلقاتِ دوستی میں مجھے پیش آئی۔ میں نے صاف طور پر انہیں کہہ رکھا تھا ”حق ہو یا ناحق۔ میری ترقی وغیرہ کے معاملے میں آپ ایک حرف نہ کہیں۔ لوگ حق ناحق تو دیکھتے نہیں۔ اُن کی نظر صرف نتیجہ پر رہتی ہے“۔ انھوں نے اس کا لحاظ رکھا لیکن احباب ہم سے کہتے رہے۔ آپ نے ذاتی تعلقات میں یہ ظاہر داری برتتے ہیں۔

(۱۰) اعلیٰحضرت حضور نظام

دنیا کی کئی بڑی بڑی مملکتوں کے صدور و اربابِ حکومت و مشاہیرِ عالم سے مراسلت کے ذریعہ حضرت کا ربط رہا لیکن شروع سے آخر تک اعلیٰحضرت حضور نظام نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کے ساتھ حضرت کا ربط بہت خاص رہا۔ بہت محبت رکھتے اور بہت دُعائیں دیتے۔ اعلیٰ سطح پر باہمی مراسلت قابلِ دید ہے۔ خاص خاص موقعوں پر مخلصانہ مشوروں سے دریغ نہ فرماتے۔ اور قرآنی

آیات کے ذریعے رہنمائی اور تسکین کے اسباب مہیا فرماتے۔ انقلاب حیدرآباد کے بعد حضور نظام کے اچھے اچھے رفقا نے اُن سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن حضرت نے اخیر وقت تک اپنے مراسمِ اخلاص اور ربط کو جاری رکھا اور وضع داری برقرار رکھی۔ حضور نظام کے برادر نواب بسالت جاہ بہادر بھی حضرت کا بہت احترام فرماتے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ عید کی نذر پیش کرنے کے لئے حضرت کنگ کوٹھی تشریف لے گئے۔ حضور نے حسبِ معمول فوراً بلوایا۔ اُس وقت مشہور شاعر عبداللہ خاں صاحب کامل سے حضور ہم کلام تھے۔ حضرت نے نذر پیش کی اور اجازت لے کر فوراً واپس ہوئے۔ اس کے دو گھنٹے بعد کامل صاحب حضرت کے دولت خانہ آئے۔ اور رُوداد سنائی کہ ہم حضور کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے۔ لیکن آپ کے جاتے ہی تقریباً دو گھنٹے تک حضور آپ کی قصیدہ خوانی کرتے رہے۔ آپ کے متعلق حضور بہت اعلیٰ خیالات رکھتے ہیں۔ آپ کی ملاقات کو بہت غنیمت سمجھتے ہیں۔

(۱۱) پرنس مکرّم جاہ بہادر کی اتالیقی

جب حضور نظام کے ولی عہد پرنس آف برار کے صاحبزادگان پرنس مکرّم جاہ بہادر اور پرنس مفخّم جاہ بہادر کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا سوال پیدا ہوا، تو حضور نظام، ولی عہد بہادر اور شہزادی دُرِّ شہوار کی نظرِ انتخاب نے حضرت ہی کو منتخب فرمایا۔ اور حضرت نے ملّت کی امانت جان کر شہزادوں کی اتالیقی کی خدمت قبول فرمائی۔ چنانچہ ۱۳۶۵ھ میں شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ پرنس آف برار بہت احترام فرماتے، اور فرمایا کرتے مجھے امید ہے کہ آپ کی تربیت سے یہ بچے علومِ ظاہری و باطنی سے آراستہ ہو جائیں گے۔

حضرت کو بچوں کی تعلیمی نفسیات کا خاص ذوق تھا۔ نفسیاتِ اطفال

پر بہت باریک نظر تھی۔ بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم آپ کے تعلیمی خیالات اور نظریات میں اُپج اور نُدرت دیکھ کر متاثر ہوتے حیرت کرتے۔ شہزادوں کی اتالیقی کے سلسلے میں اس ذوق کے اظہار کا بہت اچھا موقع ملا۔ کچھ عرصہ بعد عُلیا حضرت شہزادی دُرِّ شہوار شہزادوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان لے گئیں۔ تعطیلات میں نواب مکرّم جاہ بہادر حیدرآباد واپس تشریف لائے تو ایک سعادت مند شاگرد کی طرح ملاقات کے لئے اُستادِ محترم کی خدمت میں بیت السّلام حاضر ہوئے اور فرمایا۔ ہم ہر سال تعطیلات میں حیدرآباد آیا کریں گے۔ اس زمانے میں ہماری تعلیم و تربیت کے لئے آپ براہِ کرم تشریف لایا کریں یا ہمیں اجازت دیں کہ آپ پاس روزانہ حاضر ہوا کریں۔ حضرت نے شہزادوں کی فرمائش قبول فرمائی اور روزانہ ایک گھنٹہ کے لئے اُن کے پاس جانا طے فرمایا۔ یہ سلسلۂ تربیت اخیر تک جاری رہا۔

(۱۲) مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان

مسٹر غلام محمد مرحوم حضرت کے شاگرد تھے۔ جب بحیثیت وزیرِ فینانس حیدرآباد آئے تو گھر پر حاضری دی۔ صنعتی نمائش حیدرآباد کا ایک بڑا جلسہ حضرت کے زیرِ صدارت منعقد ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر غلام محمد نے ایک شاگردِ رشید کی طرح خراجِ عقیدت پیش کیا اور فرمایا۔ میں نے جو کچھ علمِ معاشیات حاصل کیا ہے اِن ہی قدموں پر حاصل کیا ہے۔

(۱۳) مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم

فرمایا۔ ایک دن مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیرِ اعظم کے پاس شادی کی تقریب میں جانا ہوا۔ میں نواب مہدی یار جنگ کے ساتھ گیا اور اُن سے گیٹ پر ہی کہہ دیا کہ میں اپنے درجہ کے عہدہ داروں میں بیٹھوں گا۔ چنانچہ میں چھوٹے عہدہ داروں میں بیٹھ گیا۔ مہاراجہ نے ایک نواب صاحب کو مجھے بُلانے کے لئے

بھیجا۔ میں نے انکار کیا۔ اور کہلایا کہ یہی میرا مقام ہے۔ لیکن اصرار ہوا تو میں گیا مہاراجہ نے ہٹ کر دولھا کے پاس مجھے مسند پر بٹھایا اور فرمایا۔ ایسے موقع پر آپ کے مبارک قدم کا مقام یہ ہے۔ مہدی یار جنگ بہادر نے کہا۔ اگر میرے ساتھ رہتے تو وزیروں میں بیٹھتے۔ لیکن صدر کی جگہ دولھا کے پاس کہاں ملتی۔ اور بھری مجلس میں ایسا اعزاز کہاں ملتا۔ میں نے کہا عزت طلبی مناسب نہیں۔ اللہ اپنے فضل سے جو عزت دے بہت ہے۔

ایک دن مہاراجہ کے پاس ایک بڑا ایٹ ہوم تھا۔ مہاراجہ خاص تمکنت سے بیٹھے تھے۔ سر ٹرنچ وزیر مال اور سر نظامت جنگ وزیر سیاسیات نے بھی آکر سلام کیا تو اشارہ سے اس کا جواب دیا۔ میں صدر شعبۂ دینیات حضرت مولوی عبدالقدیر صاحب حسرت اور پروفیسر مناظر حسن صاحب گیلانی کے ساتھ پہنچا۔ اور ان سے کہہ دیا۔ آپ لوگ جہاں چاہیں بیٹھیں۔ مجھ دیوانے کے ساتھ شاید نقصان رہے۔ لیکن دونوں نے میرے ساتھ رہنا گوارا کیا۔ مہاراجہ کا غیر معمولی انداز تمکنت دیکھ کر دل میں خطرہ آیا کہ مہاراجہ کے پاس ہی جو خالی جگہ ہے وہاں کرسیاں لے جا کر بیٹھ جاؤ چنانچہ نشستوں کے انتظام کے خلاف خود کرسیاں اٹھا کر لائے اور بیٹھ گئے۔ پھر لطف یہ کہ مہاراجہ کو نہ دعا نہ سلام۔ تھوڑی دیر بعد مہاراجہ اٹھ کر اپنی کرسی ہاتھ میں لئے ہوئے میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ یوں بھی آپ ملتے نہیں۔ آتے بھی ہیں تو بغیر ملے چلے جاتے ہیں۔ پھر نہ دعا نہ سلام۔ میں نے کہا۔ مل تو رہے ہیں جیسے ملنا چاہیئے۔ اس کے بعد خوب باتیں چلیں۔ خوب کھانے آئے۔ اس دوران میں مہاراجہ کے معتمد نے دو دفعہ آکر کہا۔ سر سالار جنگ اور سر ٹرنچ وغیرہ مل کر جانا چاہتے ہیں۔ پھر بھی ٹھہرے رہے اور انہیں ٹھہرائے رکھا۔ میرے کہنے پر بمشکل گئے۔ بہتوں کی نظریں ہماری طرف اٹھیں۔ بعضوں نے مکان کا پتہ پوچھنا شروع کیا۔ میں نے کہا۔ یہ باطل اور مجازی ربوبیت کا اثر یہ ہے کہ مہاراجہ کی توجہ پاکر سب ہم کو معظم سمجھنے لگے۔ اگر رب حقیقی سے ربط ہو تو کیا آثار پیدا ہوں گے۔

نسبت الٰہی سے اولیاء اللہ کو جو مقام اور اکرام حاصل ہوتا ہے اس سے کیوں انکار کیا جائے۔

(۱۴) نواب سر افسر الملک

نواب سر افسر الملک کو حضرت سے غیر معمولی محبت اور عقیدت تھی۔ حضرت کبھی تشریف لے جاتے اور کارڈ بھیجتے، تو وہ زنانے میں بھی ہوتے تو کارڈ ہاتھ میں لئے ہوئے باہر آتے۔ اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اندر لے جاتے اور ایسی خاطر مدارات کرتے کہ سب کو تعجب ہوتا۔ ایک دفعہ حضرت ان کے پاس تشریف رکھتے تھے کہ سر ٹرنچ وزیر مال ملنے کے لئے آئے۔ حضرت کی وجہ سے عذر کہلا دیا۔ اور فرمانے لگے۔ آپ کی ملاقات میں میری خود غرضی مضمر ہے۔ سب آتے ہیں تو قصے کہانیاں لاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں مصیبت آگئی۔ لیکن آپ آتے ہیں تو میرے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہے اور مجھے فائدہ پہنچتا ہے۔

(۱۵) مسٹر میکنزی

سنہ ۱۹۳۵ء میں ایک ذی اثر انگریز مسٹر میکنزی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے پرو وائس چانسلر ہو کر آئے۔ وائسرائے ہند سے ان کے شخصی تعلقات تھے۔ ان کی آمد کی خبر گرم ہوئی تو یونیورسٹی کے بہت سے پروفیسروں نے جو شیروانیاں پہنتے تھے، پر تکلف سوٹ سلوائے۔ بعض نے حضرت سے بھی سوٹ سلوانے کو کہا۔ حضرت نے فرمایا۔ کیا وہ لباس بدلوانے انگریز بنانے کے لئے آرہا ہے۔ ہم کو اپنے طرز پر رہنا چاہیئے شکست خوردہ ذہنیت مناسب نہیں۔ مسٹر میکنزی کی آمد کے بعد ایک موقع پر سر اکبر حیدری وزیر فینانس (جو بعد کو وزیر اعظم بنے) نے ان کے اعزاز میں ڈنر دیا۔ حضرت بھی مدعو تھے۔ سفید شیروانی میں تشریف لے گئے اور سر اکبر سے دور بیٹھے۔ سر اکبر نے پاس بیٹھنے کے لئے بلوایا لیکن حضرت نے انکار فرما دیا کہ

کہ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ اس کے بعد سر اکبر نے اُٹھ کر مسٹر میکنزی کا سے حضرت کا یوں تعارف کرایا۔ یہ حیدرآباد کی بہت بڑی شخصیت ہیں۔ ان کا عوام و خواص پر بہت اثر ہے۔ حضور نظام بھی ان کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ایک دفعہ جب مسٹر میکنزی رخصت سے انگلستان سے واپس ہوئے تو بہت سے عہدہ دار اسٹیشن پر استقبال کے لئے آئے۔ اس موقع پر مسٹر میکنزی نے حضرت کے متعلق مسٹر ہالنس ڈائرکٹر جنرل پولیس سے پوچھا۔ آپ انھیں جانتے ہیں مسٹر ہالنس نے کہا۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ یہ مسٹر برنی ہیں۔ مسٹر میکنزی نے کہا۔ تو آپ انھیں نہیں جانتے۔ یہ تو عثمانیہ یونیورسٹی کا وہ ستون ہیں جس پر میں سہارا لیتا ہوں۔ بعد میں حضرت نے مسٹر میکنزی سے فرمایا کہ دوسرے عہدہ داروں سے میرا ایسے الفاظ میں تعارف مناسب نہیں۔ مسٹر میکنزی نے جواب دیا۔ میں اپنے جذبۂ محبت کو روک نہیں سکتا۔ میں اپنے آپ کو آپ کے ہاتھ میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے دایہ کے ہاتھ میں بچّہ۔

(۱۶) طلبہ اور پولیس

فرمایا۔ طلبہ کو کبھی پولیس کے سپرد نہیں کرنا چاہئیے۔ یہ علی گڈھ کا کلچر ہے۔ اس نکتہ کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے عمدہ کلچر حاصل کیا ہو اور اچھا طالب علم رہا ہو۔ ایک دفعہ علی گڈھ کے کچھ طلبہ بلا ٹکٹ فرسٹ کلاس و سکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ علی گڈھ کا ایک انگریز پروفیسر بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ ریلوے گارڈ نے طلبہ کو اتارنا چاہا تو پروفیسر نے کہا۔ یہ علی گڈھ کے طلباء ہیں تم نہیں اُتار سکتے۔ تم کرایہ کے لئے کالج کو لکھو۔ ان سے تم باز پرس نہیں کر سکتے۔ ہم جو باز پرس مناسب سمجھیں گے کریں گے۔ پرنسپل اور پروفیسروں کو طلبہ کے وقار کی حفاظت کا پاس ہو تو طلبہ کے دلوں میں بھی پرنسپل اور پروفیسروں اور کالج سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اُن پر فخر

کرتے ہیں اور اُن کے مشوروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ طلبہ اور عوام کے بارے میں دنیا کی تمام مہذب حکومتوں نے فرق کیا ہے۔ خاص لحاظ کیا ہے۔ کوئی ماں اپنے بچے کو دوسرے سے پٹنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کی ہڑتال کے موقع پر مسٹر میکنزی جو وائس چانسلر نے میرے خیالات معلوم کئے تو اپنی رائے بدل دی اور طلبہ کا ساتھ دیا اور مجھ سے کہا۔ آپ کا نقطۂ نظر اور خیالات ایٹن کالج والوں کے سے ہیں۔

فصلِ دہم

حضرت کی خصوصیات

(۱) حضرت کے احوال

حضرت کی طبیعت میں بہت استتار تھا۔ ذاتی احوال بہت کم بیان میں آتے تھے، اِلّا یہ کہ تعلیم مقصود ہو۔ عام طور پر اشارے کنایہ سے بڑھ کر اپنے احوال کو زیادہ کھول کر نہیں بیان فرماتے تھے۔ تاہم کبھی کبھی جو احوال بیان میں آئے اس سے اندازہ ہُوا کہ حضرت کے ظاہری، باطنی خاص احوال بعض اکابر سے ملتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود حضرت کا حال یہ کہ الحمدللہ کہہ کر گزر جاتے۔ معلوم ہوتا کہ محض بے نفسی اور مقامِ اخلاص میں حضرت کا قیام ہے۔ عقل، تدبیر، تفاخر کے شائبہ کا اظہار نہ ہوتا۔

ایک دفعہ فرمایا۔ مجھے اپنی زندگی میں ایسے کئی واقعات پیش آئے ہیں کہ گویا اونٹ کو سوئی کے ناکہ سے گزرتے دیکھا ہے۔ اور ہاتھیوں کو کچے دھاگے میں بندھے، تڑپتے دیکھا ہے۔ مجھے بجلیوں پر چلنا پڑا ہے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔ دریافت فرمایا۔ کیا تم آٹھ روز سے مجھ میں کوئی فرق محسوس کر رہے ہو۔ میں نے عرض کیا۔ نہیں۔ فرمایا۔ آٹھ روز سے میرے سر پر ایک پہاڑ (مصیبت کا مثل) لٹک رہا تھا۔ سر سے چھو رہا تھا۔ ہر وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مجھے اب دبا دے گا۔ الحمدللہ کل مصیبت ٹل گئی اور پہاڑ ہٹا لیا گیا۔ لیکن کسی کو پتہ نہیں کیونکہ حسبِ معمول کام کر رہا تھا، ہنس بول رہا تھا۔

کچے دھاگا کا اپنا اعتبارِ عبدیت ہے جس میں کوئی قوت و اہتمام نہیں۔ اور

ہاتھی اپنے شر کی وسعت و اہمیت کا نام ہے۔ شر کا ظہور ہر آن ممکن۔ نہ معلوم ایک لمحہ میں کیا ہو جائے۔ لیکن کچے دھاگے کے باوجود اللہ حفاظت فرماتا ہے۔

(۲) دیدارِ الٰہی

میرے ایک دوست سے فرمایا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تم میں کیا کمال ہے۔ میں نے عرض کیا۔ مفت کا کھاتا ہوں۔ بیکار رہتا ہوں۔ فرمایا۔ یہی تو کمال ہے۔ (مطلب یہ کہ فضل پر زندگی ہے۔ عمل کا دعویٰ نہیں)۔

(۳) نبی کریم صلعم کی مزاج پرسی

فرمایا۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو شہادت میں نظر آتے ہیں۔ کسی کو خواب و مثال میں نظر آتے ہیں۔ کسی کو نظر ہی نہیں آتے، لیکن خود حضورؐ کی آن پر نظر رہتی ہے۔

مدینۂ طیبہ سے آج ۹ر محرم ۱۳۷۴ھ ہمارے دوست سید محمدؐ بادشاہ حسینی صاحب واعظِ مکہ مسجد کا خط وصول ہُوا۔ لکھا ہے۔ عالمِ شہادت میں، مواجہ شریف میں حضورِ انورؐ کا دیدار مجھے نصیب ہُوا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا۔ کَیْفَ حَالُ الْبَرْنِی (برنی کا کیا حال ہے) جواب میں عرض کیا۔ بِالْخَیْرِ وَالْعَافِیَۃِ یَارَسُوْلَ اللّٰہ (خیر و عافیت سے ہیں یارسولَ اللہ) انھوں نے لکھا ہے۔ یہ سرفرازی آپ کے طفیل میں نصیب ہوئی۔ الحمدللہ۔ اِس سے پاشامیاں کے ہمارے ساتھ ربط و نسبت کی توثیق ہوئی۔ اُن کو ہم سے محبت ہے۔ حاضر تو حاضر ہی ہے۔ لیکن غائب کو یاد کرنا بڑی نعمت ہے۔ بڑی سرفرازی ہے کہ حضورؐ نے اپنے غلام کو یاد فرمایا۔ حضورؐ تو ہر حال ہمارے حال سے واقف ہیں۔ لیکن یہاں مقصود غلام نوازی کا اظہار ہے۔

(حضرت بادشاہ حسینی صاحب نے اس سرفرازی کا اظہار اس ناچیز سے بھی فرمایا۔ للمؤلف علیم)

(۴) بارگاہِ نبوی میں واسطہ مغرب کے مشہور عالم و مشائخ حضرت عبدالحی کتانی نے مدینۂ منورہ میں خصوصیت سے فرمایا۔

ہم جب کسی معاملے میں حضورِ انور صلعم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی اس وقت رسول اللہؐ کے دربار میں سب کے لیئے واسطہ ہیں۔ حیدرآباد کے اور باہر کے بعض اولیاء اللہ نے بھی یہی بیان کیا۔ حضرت بڑے سجادہ صاحب گلبرگہ شریف نے جب اپنی ایک خاص مشکل میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی طرف رجوع کیا تو ارشاد ہوا۔ برلی شاہ سے رجوع کرو۔ اسی طرح حضرت سجادہ صاحب درگاہِ یوسفینؒ کو ایک خاص معاملے میں حضرت یوسف صاحبؒ شریف صاحبؒ سے اسی قسم کی ہدایت ہوئی۔ علاوہ ازیں حضرت عبداللہ العمادی صاحب کو ان کی ایک عزیزہ کی مایوس کن علالت کے سلسلے میں ان کے بزرگانِ سلسلہ سے اسی قسم کا ایما ہوا۔ اور بفضلہ تینوں معاملات میں کاربراری ہوئی۔

(۵) حضرت غوثِ اعظمؓ کی خصوصی عنایات بغدادِ شریف میں حضرت نقیب الاشراف پیر حسام الدین قادری نے حضرت سے ایک روز فرمایا۔ ہم کو ارشاد ہوا ہے کہ آپ کی مقبولیت بارگاہِ غوثِ اعظمؓ میں سب سے بڑھ کر ہے۔ ہم دعا کے لیئے آپ کی طرف رجوع ہوں۔ آپ ہمارے لیئے فلاں دعا فرمائیے۔

آپ نے جواب دیا تعمیلِ حکم میں دعا کرتا ہوں۔ ورنہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔ حضرت پیر شرف الدین قبلہ کلید بردار بغدادِ شریف نے ایک روز آپ سے فرمایا حضرت غوثِ اعظمؓ آپ کے متعلق فرماتے ہیں۔ تمہاری اولاد میں مثل اولاد شمار ہوتے ہو۔ حضرت نے اپنی خاص چیز قصیدۂ غوثیہ آپ کو عطا کی ہے۔ اس پر میرے رفیقِ سفر مولوی عبدالقدیر صاحب حسرتؔ نے مبارکباد دی کہ حضرت نے اپنی چیز آپ کو عطا فرمائی جبکہ دیگر رفقاء کو اور چیزیں عنایت ہوئیں۔ حضرت پیر جلال الدین بغدادی

اور حضرت پیر سید یوسف گیلانی بغدادی، پیر آف وانا۔ وزیرستان نے بھی فرمایا کہ اس وقت آپ حضرت غوثِ اعظمؓ کے سب سے بڑے محب اور سب سے بڑے محبوب ہیں۔ آپ کا بڑا مقام ہے۔ لیکن آپ ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔ میں حضرت غوثِ اعظمؓ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔

ان سرفرازیوں پر فرمایا۔ حضرت غوثِ اعظمؓ کی غلام نوازی کی حد ہے۔ غلام کو اتنی ترقی دیتے ہیں کہ اولاد کے برابر کر دیتے ہیں۔ پھر غلام اور اولاد میں کشتی کرا کے غلام کو جِتا کر دکھاتے ہیں۔ لیکن ایاز قدرِ خود بشناس۔ غلام کو اپنا مقام پہچانتا لازم ہے۔

(۶) حضرت غوثِ اعظمؓ پر ناز فرمایا۔ اللہ کی شان! بغدادِ شریف میں صاحبزادوں کے ساتھ ہمارا عجب معاملہ رہا۔ ہمارے قلب میں خطرہ آیا۔ وہ بلائیں گے تو ہم جائیں گے۔ اُدھر یہ انتظار کہ ہم آئیں گے۔ ہمارا یہ اعتبار کہ جن کے پاس آنا تھا آ گئے۔ اس کے بعد اگر بلائیں گے تو آئیں گے۔ بالآخر سجادے صاحب حضرت نقیب الاشراف پیر حسام الدین قبلہ نے ازراہِ عنایت ہمیں دعوت دی اور بے حد خاطر مدارات فرمائی۔ حضرت کی ظاہری و باطنی شانیں خاص ہیں۔ امیر الامراء تسلیم کئے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے حاکم حاضری دیتے ہیں۔ بادشاہ کے سر پر بھی تاج رکھتے ہیں۔ کوئی شخص پانچ دس منٹ سے زیادہ معاضری کی جُرأت نہیں کر سکتا۔ ہم پر شفقت کا یہ عالم کہ دو دو تین تین گھنٹے تخلیہ رہتا اور خلافِ معمول اِس خادم کو "یا اخی" فرماتے۔

اصل نکتہ یہ کہ ہم تو غلامِ محض ہیں۔ ہیچ ہیں۔ صاحبزادے تو صاحبزادے ہیں، سونا ہیں۔ حضرت غوثِ اعظمؓ کی ذرہ نوازی، غلام نوازی پر نظر تھی کہ رانگے کو سونا بنا دیں تو بات ہے۔ سونا تو سونا ہی ہے۔ اُس کا تو کہنا ہی کیا ہماری اس

مطلب میں دراصل حضرت ہی کی نسبت کی عظمت، قوت و استحکام مضمر تھے۔ اسی نسبت پر فخر کے تحت ہمارا یہ عمل تھا۔ البتہ ایسے مقام ناز میں نفس کا شائبہ نہ آنے پائے اور نہ تسمہ باقی نہ رہے گا۔ جتنا اونچے جائیں گے اتنا ہی نیچے گریں گے۔ اللہ نفس سے بچائے (آمین)

(۷) حج میں فضل

مدینہ طیبہ میں حضرت کے ایک اہل دل دوست قمرالدین نواب باب جبرئیل پر متعین تھے۔ حیدر آباد کے فٹ بال کے مشہور کھلاڑی فقیر شاہ صاحب مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ قمرالدین صاحب نے فقیر شاہ صاحب کو دیکھا تو لپٹ گئے اور فرمانے لگے۔ آپ میں تو برنی صاحب کی خوشبو آرہی ہے۔ اس پر وہ حیران ہوئے اور کہا۔ میں ان کا غلام ہوں۔ کالج میں پڑھتا ہے۔

(۸) حضرت کا مقام

ایک دن ناچیز مؤلف اور نواب سعید جنگ بہادر کی گفتگو بڑے حضرت قبلہ کمال اللہ شاہ صاحب، مولانا محمد حسین صاحب قبلہ اور حضرت برنی صاحب قبلہ کی تعلیم کے متعلق حضرت کے بالمواجہ ہوئی۔ ناچیز نے عرض کیا۔ بڑے حضرت قبلہ پر اللہ اللہ اتنا کھلا تھا کہ اسی کو ہر وقت بیان فرماتے۔ حضرت مولانا محمد حسین قبلہ پر لا الٰہ الا اللہ کا ایسا غلبہ تھا کہ ہمیشہ اسی کو ہر رنگ میں بیان فرماتے اور حضرت برنی صاحب قبلہ پر محمد رسول اللہ کا اتنا زبردست انفتاح و انکشاف ہے کہ کل وقت اسی پر گفتگو رہتی ہے۔ حق یہ ہے کہ رسولؐ ملا تو سب ملا۔

(۹) جملہ ما ایم

ایک دن فرمایا۔ "ما ہیچ نیم" تو ہمارا ہر وقت کا حال ہے۔ لیکن کبھی کبھی عالم ظاہر میں میرا حال "جملہ ما ایم" کا ہو جاتا ہے اور مجھے صاف لمحہ پر بتایا بھی جاتا ہے۔

(۱۰) مشکوٰۃ الصلوٰات کا اعجاز

فرمایا۔ حضرت عبدالحی کتانی مراکش (مغرب) کے مشہور عالم بزرگ اور عالم تھے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر حمید اللہ پروفیسر پیرس یونیورسٹی نے بیان کیا کہ ان کا کتب خانہ عالم اسلام کے وسیع ترین کتب خانوں میں سے ہے۔ حضرت عبدالحی کتانی نے میری مؤلفہ درود شریف کی کتاب "مشکوٰۃ الصلوٰات" کو حرمین شریفین میں پڑھ کر فرمایا۔ آپ رسول اللہ کا زندہ معجزہ ہیں کہ عربی نہ جاننے کے باوجود ایسی کتاب لکھی ہے جو ادبیت، معنویت، قرآنیت اور عظمت نبویؐ کی وضاحت کے لحاظ سے غیر معمولی شان رکھتی ہے۔ اور یہ کام آپ کے لیے مقدر تھا۔ کچھ عرصہ بعد لوگ اسے پڑھ کر سمجھیں گے کہ آپ اپنے زمانہ کے عربی کے بہترین ادیب تھے۔ خود مجھ سے مشکوٰۃ الصلوٰات کی اجازت و سند لی اور حرمین میں دوسروں کو بھی دلوائی۔ اس کتاب کے دس نسخے خود لے کر سلطان ابن سعود کے پاس بھجوائے۔ علاوہ ازیں حضرت شیخ الدلائل نے بھی مدینہ منورہ میں مجھ سے مشکوٰۃ الصلوٰات کی اجازت لی۔

(۱۱) حکومت پر حکومت

حیدر آباد کے حضرت پیر سید محمد، جو چھوٹے بغدادی صاحب کے لقب سے مشہور تھے ایک دن حضرت سے فرمانے لگے۔ مجھے جو کرامتیں اور بڑائیاں نصیب ہوئیں اس کا دسواں حصہ حیدر آباد کے کسی مرشد کو ملتا تو وہ قطب عالم برابر بن جاتا۔ میں بھی ان میں شامل ہوں۔ تاریخ اسلام میں اس کی نظیر نہیں کہ جب سلطان بن سعود جیسے سخت جلال والے بادشاہ کے دربار میں وہابیت و نجدیت اور اس کی سیاسیات کے خلاف تیری معرکۃ الآراء تقریر ہوئی وہ بہت متاثر بلکہ مبہوت ہو گیا۔ تاہم لوگوں کو اندیشہ رہا اور افواہ پھیلی کہ برنی صاحب کے خلاف کل حج بدر کے

کے احکام جاری ہوں گے۔ اس پر تمام علماء، مشائخین نے کعبۃ اللہ میں جمع ہو کر حلف لیا کہ اگر برنی صاحب کا حج نہ ہو تو ہم سب حج نہیں کریں گے۔ انھوں نے اس وقت عالمِ اسلام کی طرف سے بطورِ فرضِ کفایہ نیابت و وکالت کی ہے۔ مولانا عبدالحی کتانی بھی اِن میں شریک تھے۔ اس کا اندازہ گورنمنٹ کو ہو گیا۔ دوسرے دن اظہارِ خوشنودی کے لئے حکومت کی طرف سے تجھ کو خصوصی ڈنر دیا گیا۔ اِس کے بعد سلطان نے تجھے اپنا مہمانِ خصوصی بنانا چاہا تو تُو نے انکار کر دیا۔ امیرِ فیصل نے میرے داماد علوی کے ذریعے ملنا چاہا اور تحفے دینے چاہے۔ لیکن تو نے قبول نہیں کیا۔ کس کی ہمت تھی کہ حرمین شریفین میں مشکوٰۃ الصلوات (درودوں کی کتاب) کے پانچ سو نسخے تقسیم کر سکے جہاں دلائل الخیرات کے نسخے جلائے جاتے ہیں۔ جہاں یارسول اللہ کہنا شرک اور فاتحہ بدعت ہے وہاں تو نے محرم کے مہینے میں مسجدِ نبوی کے سامنے نیاز دے کر شربت کی سبیل لگا دی، حالانکہ وہاں اس جُرم میں کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ گزشتہ سال ایک مصری عالم نے سلطان کے سیاسی مسلک کے متعلق ذرا سا اشارا کیا تھا تو حج سے روک دیا گیا۔ تو نے تو اُن کے مسلک و سیاست کے پرخچے اڑا دیے۔ اور واوری فاروقی نسبت کہ ذرا نہیں ڈرا۔ تو نہ اپنی تعریف سنتا اور نہ ذکر کرتا۔ ہر چیز کو اَن سُنی کر دیتا ہے۔ مولوی احسان اللہ صاحب مشہور برٹش کونسل جدہ نے کہا پچیس تیس برس سے کوئی حاجی اس قوت و شان کا یہاں نہیں آیا جس کی حکومت پر حکومت معلوم ہوتی ہے۔ حکومت نے ہر جگہ احکام دے رکھے تھے کہ برنی صاحب کے معاملے میں کوئی تعارض نہ کرے۔

(۱۲) شدید اتقا کی مثالیں

فرمایا۔ نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اور مشیرِ دستوری تھے۔ چھتاری صاحب وزیرِ اعظم (جو حضرت کے شخصی دوست بھی تھے) اُن کو ایک کمیٹی میں دہلی لے جانا چاہتے تھے

میں نے اُن سے کہا۔ آپ کو اس کمیٹی میں بحیثیتِ وزیر شریک ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ کل جانا طے ہے۔ میں نے کہا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کی شان! نہ سان نہ گمان۔ نہ کونسل نہ قرارداد۔ نہ وزیرِ اعظم کے فرشتوں کو خبر۔ اچانک شام میں حضور نظام نے اُن کی وزارت کا فرمان جاری کر دیا۔ سب حیران رہ گئے۔ اور نواب علی یاور جنگ بہت معتقد ہو گئے۔

ایک دن مشہور مشائخ حیدر آباد سید بادشاہ حسینی صاحب کے خلاف حضور نظام نے فرمان جاری کیا۔ وہ بہت پریشان آئے۔ میں نے کہا۔ پریشان نہ ہوں۔ اللہ چاہے تو آپ کے موافق ایسا فرمان آئے گا۔ واپس گھر گئے تو چوبدار فرمان لئے کھڑا تھا، جس میں وہی جملے تھے جو میں نے کہے تھے۔ پاشاہ میاں حیران رہ گئے۔

(۱۳) گورنر اور وائسرائے کی ملاقاتیں

۱۹۰۳ء میں سر جیمس لاٹوش لفٹننٹ گورنر یو۔پی۔ خورجہ آئے۔ ہمارے مدرسے کے معائنہ کا بھی پروگرام تھا۔ میں ہفتم میں تھا۔ میں نے اپنے ماسٹروں سے کہا۔ لاٹ صاحب آج مجھ سے ملیں گے۔ سب ہنسنے لگے۔ جب وہ آئے تو میں بہت دُور کھڑا تھا۔ انھوں نے میرا رُخ کیا اور آ کر مجھ سے ہاتھ ملا کر دیر تک باتیں کیں۔ لوگ حیران ہو گئے۔ قربِ نوافل کی بچپن میں ترنگ تھی کہ ہم بھی کسی کے غلام ہیں۔ مُسلمان کی شان ظاہر ہو۔

وائسرائے لارڈ ویول اور لیڈی ویول جب حیدر آباد آئے تو عثمانیہ یونیورسٹی بھی دیکھنے آئے۔ میں اُن کے مقررہ راستے سے علیحدہ دُور کھڑا تھا۔ وائسرائے کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ وہ اپنا راستہ چھوڑ کر میرے پاس آئے۔ خود سلام کر کے مصافحہ کیا اور دیر تک باتیں کیں۔ پھر جا کر وائسرین سے کچھ کہا۔ وہ بھی

ملنے کے لئے آئیں اور دیر تک گفتگو کرتی رہیں۔ یہ دیکھ کر رزیڈنٹ بھی آیا اور
سلام کرکے واپس چلا گیا۔
ربوبیت کی معمولی تجلی ہوتی ہے تو سب جھک جاتے ہیں فیضِ ربوبیت
کہ ان تماشوں کے باوجود لوگ نسبتوں سے انکار کرتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے

فرمایا۔ علی گڈھ کالج میں بی۔ اے

(۱۴) استغناء اور اصول پسندی میں سب سے اول آنے پر قاعدہ
کے لحاظ سے گورنمنٹ سے ڈپٹی کلکٹری کا پیش کش آیا۔ میں نے علمی مشاغل کے
مقابل اسے قبول نہیں کیا اور ام۔ اے میں شرکت کی۔ ام۔ اے پاس کرنے کے
بعد مسٹر گلانسی وزیر فینانس ریاست حیدر آباد نے مجھے تاریخ کے لئے یوروپین
اسکالرشپ دینا چاہا۔ وجہ یہ کہ معاشیات کے لئے ایک دوسرے صاحب
کے نام وظیفہ منظور ہو چکا تھا۔ میں نے اصولاً انکار لکھ دیا کہ تاریخ میرا مضمون
نہیں۔ اس پر انہوں نے میرے مضمون معاشیات کا لحاظ کرکے خصوصیت سے
دوسرا وظیفہ منظور کیا۔ اس سے بھی میں نے بربنائے علالت والدۂ محترمہ استفادہ
نہیں کیا۔ یہ وظیفہ میرے لئے دس برس تک محفوظ رہا۔ لیکن میں نے اپنے بعض
اصول کی بناء پر استفادہ نہیں کیا۔

فرمایا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی عثمانیہ یونیورسٹی

(۱۵) بے لوثی کی مثال کالج کے پرنسپل تھے اور میں پروفیسر معاشیات۔
ڈاکٹر صاحب کو میرے متعلق کچھ غلط فہمیاں ہو گئیں اور وہ مجھے اپنا مخالف سمجھنے
لگے۔ میں نے حسبِ عادت صفائی کی کوشش و فکر نہ کی۔ نواب ذوالقدر جنگ
مرحوم سکریٹری تعلیمات تھے۔ وہ کسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے خلاف ہو گئے،
اور ایک سوال نبد کے ذریعے کالج اسٹاف سے پرنسپل صاحب کے خلاف مواد مانگا

بہت سوں نے شکایتیں لکھیں۔ ستار صاحب کو مجھ سے بہت اندیشہ تھا
لیکن میں نے دو سطری نوٹ لکھا کہ اول تو مجھ کو پرنسپل صاحب سے کوئی ذاتی شکایت
نہیں۔ اگر بالفرض ہو بھی تو جب تک یہ سوال بند اصولاً پرنسپل صاحب کے توسط سے
نہ آئے جواب لکھنا اصول و قواعد کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اس پر سکریٹری صاحب نے
کارروائی ختم کردی اور ایک ایٹ ہوم دیا۔ اس میں پرنسپل صاحب سے کہا کہ جب تک
آپ کے کالج میں ایک دو ایسے قابل حضرات موجود ہیں جامعہ ناز کرسکتی ہے۔

فرمایا۔ بچپن سے یہ میری طبیعت کا جزو ہے کہ

(۱۶) اپنی طبیعت میں نے ہمیشہ اپنے کو بے سمجھ اور جاہل دیکھا عقل و
علم کا کبھی دعویٰ نہیں رہا۔ حالانکہ بہت سے مجھے بڑا عقل مند اور عالم سمجھتے ہیں۔
البتہ میری زندگی نصرت و حفاظتِ الٰہی میں بسر ہو رہی ہے جس میں عقل کو دخل
نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذہب کا نقطۂ نظر کتنا صحیح ہے۔ بندہ کو اپنے
عدم دخل و اضطرار میں رہنا چاہیئے۔ لادعویٰ رہے اور ایک لمحہ عقل پر توکل نہ کرے
جس کے بعد کھل جائے گا کہ ہماری زندگی میں سوائے فضل و رحمت و حفاظتِ الٰہی کے
کچھ نہیں۔ اس ربط کے بعد حکمت کے گوناگوں نکات کھلتے ہیں، اس میں اپنی ارادت
و کسب کو دخل نہیں۔ اسباب و علل کی حد تک عقل کی رسائی ہے۔ اس سے اوپر
رحیمیت و مسبّب تک صرف قلب (ایمان) کی رسائی ہے جو فضل ہے۔
یہی حال میرے دل کا بھی ہے۔ کسی سے قلب میں کینہ، عداوت، غصہ نہیں رکھتا۔
اگر قلب میں کسی سے کدورت آ بھی جائے تو کوئی نہ کوئی اعتبار لے کر کدورت جلد دور
کردیتا ہوں۔ یعنی دعا، استغفار یا صحتِ علم کے ذریعے پھر قلب کورا رہتا ہے
ایک بات یاد رکھو، ہر وقت کام آئے گی۔ کھلے تو زندگی بن جائے گی۔ دل میں
کسی سے متعلق اچھا یا برا جو خطرہ آئے گا وہ اپنا اثر مخلوق کے دلوں پر ضرور دکھائیگا

اخلاص اور نیک نیتی میں بڑی قوّت ہے۔ اِسی لئے سب سے پہلے دین نے نیّت کی تصحیح پر زور دیا۔

(۱۷) قوّتِ تسخیر

فرمایا۔ مجھے لڑکپن میں دو چیزوں کا شوق تھا۔ ایک تو مناظرہ کا، دوسرے تسخیرِ قلوب کا۔ مناظرے کا یہ حال تھا کہ علی گڈھ کالج میں لوگوں نے "منطقی" نام رکھ دیا تھا۔ تسخیرِ قلوب کا یہ عالم کہ سرکش سے سرکش طلبہ، حتیٰ کہ پروفیسروں، پرنسپلوں کے متعلق فرمائشیں ہوتیں کہ اِن پر تسخیر کا عمل کرکے بتاؤ۔ چنانچہ جب اس کا اثر ظاہر ہوتا تو سب قائل ہوجاتے اور حیران رہ جاتے۔ لیکن میں نے اِن دونوں چیزوں کو اس لئے چھوڑ دیا کہ اس میں اپنی ارادت کو دخل رہتا تھا۔ اب کبھی کبھی ایسی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں تو میری ارادت کو دخل نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر میکنزی کی پرو وائس چانسلری کے زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ نے ہڑتال کی، اور تنازعہ بہت طول کھنچا۔ بالآخر مجھ سے مصالحت کرانے کی خواہش کی گئی۔ مخدوم محی الدین صاحب اس ہڑتال کے لیڈر تھے۔ میں لڑکوں کے مجمع میں گیا اور مخدوم صاحب سے نظریں ملیں۔ وہ آکر لپٹ گئے اور کہنے لگے۔ آپ جو فرمائیں اس کی تعمیل کے لئے ہم حاضر ہیں۔ آپ جو ارشاد فرمانا چاہیں، ارشاد فرمائیں۔ بعض طلبہ نے کہا۔ نہیں، برنی صاحب تقریر کریں گے تو ہمارا جوش ٹھنڈا ہوجائیگا۔ میں نے کہا، پہلے تم اپنی اپنی تقریریں کرلو۔ اخیر میں میری بھی کچھ سُن لو۔ چنانچہ اُن کی تقریروں کے بعد میں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں میں نے کہا میں اُن کمزور لڑکوں کو مخاطب نہیں کرنا چاہتا۔ جن کا جوش تھوڑی دیر میں ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ میرے مخاطب وہی بچے ہیں جو حق کو سمجھکر حق پر رہتے ہیں اور حق کا جوش کبھی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ البتہ صحیح محل پر ظاہر ہوتا ہے۔ نفسانیت کے وقتی جذبہ کا جوش فوری اُبال ہوتا ہے جو

جلد ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ ہڑتال ختم ہوگئی۔ سب ممنون ہوئے۔

ایک اور موقع پر فرمایا۔ مجھے لڑکپن میں قلوب کو مسخر کرنے اور دلوں میں قبولیت حاصل کرنے کے عمل کا شوق تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ بڑی اِبتلا ہے۔ آدمی تعیّنات میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ اب مجھے کسی کی تعریف سے بڑھکر اُس کی بے رُخی میں لطف آتا ہے۔ اِس کیفیت پر مجھے بعض وقت کفرانِ نعمت کا دھوکا ہوا کہ لوگوں کی قدردانی کی کہیں ناقدری نہ ہو۔ لیکن قلائدُالجواہر میں حضرت غوثِ اعظمؓ کا فرمودہ دیکھ کر اطمینان ہوا۔ حضرت کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جامع مسجد میں جانے پر بڑی ہَل چل ہوتی۔ ایک دفعہ جمعہ کے دن روانگی میں دیر ہوئی تو بعضوں نے کہا۔ آج بڑی ہَل چل ہوگی۔ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے محبت و نفرت کو میرے قبضہ میں کردیا ہے۔ دیکھو آج کوئی مجھے سلام نہیں کرے گا۔ اور نہ اُٹھے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ ارادہ بھی تحتِ امر تھا۔ اگر ارادہ میں نفس شامل ہوجائے تو اللہ کی سخت ناراضی کا باعث ہوتا ہے۔ حضرت کے صدقے میں میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کوئی عقیدت مندی دکھائے تو محبت کا دروازہ بند کردوں اور بعض وقت جی چاہتا ہے کہ جاری رہنے دوں۔

اصل راز یہ ہے کہ غلامی پکّی رہے۔ بڑائی مطلوب نہ رہے۔ چھوٹے ہیں یا بڑے آپ کے ہیں تو کافی ہے۔ اس کے بعد جتنا چاہیں دیجئے۔ ہم تو دو کوڑی کے بھی نہیں۔ نسبتِ غلامی محض فضل ہے۔ اس میں حفاظت ہے۔

(۱۸) بغیر آپریشن مایوس شہزادے کی صحت

شہزادی دُرِّ شہوار کے عزیز ترک شہزادے آفندی صاحب، حیدرآباد میں گتہ دار جانشن خاں صاحب کے پاس مہمان ہوئے۔

ایک دن مغرب کو اُن پر اَپنڈی سائٹس کا اچانک دورہ پڑا۔ مشہور پارسی سرجن کورے والا بلایا گیا۔ اس نے کہا حالت مایوس کُن ہے۔ فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔

لیکن میں صبح آپریشن کرونگا۔ جانس خاں صاحب حضرت کے پاس دوڑے آئے۔ آپ نے جاکر دیکھا۔ زندگی کی امید نہ تھی۔ حضرت نے جناب باری میں دعا فرمائی۔ ہمارے محلہ سے یہ مہمان تختے پر نہ جائے گھوڑے پر جائے۔ حضرت نے ڈاکٹر حسن علی خاں کو بلوایا لیکن وہ ایک ڈنر پارٹی میں جاچکے تھے۔ آپ محلہ کے حضرت صدّیق شہیدؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ ہمارے مہمان کا آپریشن نہ ہو صحت ہو جائے۔ اس کے بعد گھر پہنچے اور دیکھا۔ آفندی صاحب بالکل اچھے ہوچکے ہیں اور کھانے کے خواہش مند ہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ بلا تکلّف کھلاؤ۔ صبح ڈاکٹر کورلے والا اور ڈاکٹر حسن علی خاں دونوں آئے اور آفندی صاحب کو بھلا چنگا دیکھ کر دنگ ہوگئے۔ حضرت نے فرمایا۔ قرآن کے لحاظ سے جب بندہ مُردوں کو زندہ کرسکتا ہے تو کیا اللہ بیماروں کو اچھا نہیں کرسکتا جب جسم و جان دونوں موجود ہیں۔ حالانکہ وہ عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ وہ دعا کے لئے کہتا ہے تو یقین نہیں آتا۔ اللہ کی قوت سے اولیاء اللہ کیا کچھ نہیں کرتے۔ ایمان شرط ہے۔

ڈاکٹر بنکٹ چندر حیدرآباد کے مشہور فزیشن نے مجھ (مؤلف) سے ایک دفعہ نواب محمود یار جنگ کے پاس ایک علالت کے سلسلے میں فرمایا۔ برقی صاحب کی قوتِ ارادی بڑی زبردست ہے۔ وہ علاج کیا کرتے ہیں کرامتیں دکھاتے ہیں۔ اسی قسم کی رائے حیدرآباد کے دوسرے مشہور فزیشن ڈاکٹر شاہ نواز نے بھی ظاہر فرمائی۔

(۱۹) دو آنے کا نسخہ

ڈاکٹر عثمان خاں کے فرزند ڈاکٹر عمر خان پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی ایک دفعہ ٹاکسین کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ ہیجانی کیفیت طاری ہوئی۔ ہر ایک کو مارتے۔ گالیاں دیتے۔ بعضوں نے جن بھوت کا اثر بتایا۔ ان کے علاج میں تین ڈاکٹر شریک تھے جن میں ڈاکٹر بنکٹ چندر بھی تھے۔ ایک عامل صاحب نے بھی عمل پڑھا۔ اطلاع پر حضرت بھی مریض کو دیکھنے تشریف

لے گئے۔ ان کے والد صاحب نے کہا لڑکا ہر ایک کو مارنے دوڑتا ہے۔ مناسب ہے کہ آپ نہ ملیں لیکن حضرت تشریف لے گئے۔ مریض نے دیکھتے ہی سلام کیا۔ آپ نے دو آنے کا ایک نسخہ لکھ کر دیا۔ مریض کو استعمال کرایا گیا۔ بالکل آرام ہوگیا۔ ڈاکٹر حیران ہوگئے۔

ایسے واقعات بکثرت ہیں۔ مختصر یہ کہ حضرت کو طب سے طبعی مناسبت تھی طبِ اکبری اپنے والد صاحب سے پڑھی تھی۔ بعض دفعہ یونانی، انگریزی دوائیں تجویز فرماتے اور مریضوں کو جلد فائدہ ہوجاتا۔ بعض وقت دواؤں کے ساتھ دعائیں شریک رہتیں۔ یا کوئی وِرد پڑھنے کو تلقین فرماتے اور حیرت انگیز طور پر فائدہ ہوجاتا۔ بعض دفعہ صرف دُعائیں ہوتیں اور مایوس العلاج مریض صحت مند ہوجاتے۔ یہی حال جن بھوت کے مایوس العلاج مریضوں کا تھا کہ جلد شفا پا جاتے۔

حضرت نے موتی منجن اور اکسیر آئیل بنایا تھا جو بہت چلا۔ علاوہ ازیں اخیر زمانے میں سرطان، جذام، برص اور دِق جیسے مایوس العلاج امراض کے لئے خاص دوائیں تیار فرمائی تھیں اور معالجے جاری تھے۔ لیکن خلقِ خدا کو زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہ مل سکا کہ وصال ہوگیا۔ علاوہ ازیں حضرت کا عام میلان روپیہ بنانے کی طرف نہ تھا۔ ورنہ طبابت یا وکالت کے ذریعے لاکھوں کما سکتے۔ صرف اہم ترین علمی یا دینی مشاغل نصب العین تھے۔

(۲۰) ال۔ ال۔ بی کا ہتھیار

حضرت ام۔ اے، ال۔ ال۔ بی کامیاب تھے۔ اس زمانے میں لیڈری اور پلیڈری میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ بڑی حد تک اب بھی یہی کیفیت ہے۔ نام کا نام اور دام کے دام۔ عرصے تک حضرت عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے فٹ بال اسوسیشن کے صدر تھے۔ آپ کی زیرِ نگرانی حیدرآباد کے فٹ بال کا معیار ہندوستان میں بہت بلند ہوگیا

تھا۔ فٹ بال کے سلسلے میں طلبہ کے دو بڑے مشہور معرکے رہے۔ ایک مشہور کیس ہائی کورٹ میں چلا اور دوسرا چادر گھاٹ ہائی اسکول سے ڈپارٹمنٹ میں۔ ہائی کورٹ کے مقدمہ میں مشہور بیرسٹر کی غیر معمولی جرح حضرت پر ہوئی جسے دیکھنے کے لئے بڑا ہجوم ہوا۔ اس میں آپ کی قانونی قابلیت کا اندازہ کر کے بڑے بڑے بیرسٹر دنگ رہ گئے۔ نواب عسکر یار جنگ جیسے مشہور جج نے کہا۔ آپ جیسا غیر معمولی قانونی دماغ حیدرآباد میں ہے اور بچوں کی تعلیم و تعلّم میں مصروف! اگر آپ آج وکالت شروع کریں تو لاکھوں کمائیں۔ جواباً فرمایا۔ ال۔ ال۔ بی کی سند ایک ہتھیار ہے جس کا لائسنس ہم نے حفاظت کی غرض سے لیا ہے۔ شکار کی غرض سے نہیں۔

(۲۱) پہلوانوں سے مقابلے | حضرت کو بچپن سے ورزشوں سے بے حد دلچسپی رہی عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں اپنے دولت خانے پر ایک کمرے میں دنگل بنایا تھا جس میں زور آزمائیاں ہوتیں۔ بڑے بڑے پہلوان آتے قوت اور فن کے کمالات دکھاتے۔ شہزادگانِ دہلی کے اُستاد پہلوان نبی بخش بھی آ کر کُشتی کا فن سکھاتے تھے شاہی منصب دار پہلوان نصیر الدین کشمیری سے بھی ایک عرصہ تک زور آزمائی کا سلسلہ رہا۔ ان میں سے اکثر کہتے۔ دیکھنے میں آپ کا بدن ورزشی نہیں لیکن قوت اور زور آزمائی بلا کی ہے۔ اس زمانے میں جنبیہ، تلوار، بانک، بنوٹ، کشتی، مُکّا بازی، ورزش، گھوڑا سواری، پیراکی، موٹر رانی وغیرہ کی خوب مشقیں رہتی تھیں۔ بنّوٹ کے مشہور اُستاد محبوب علی صاحب بھی بنوٹ سکھانے کے لئے آتے تھے۔ حضرت نے بنوٹ کے فن پر ایک کتاب بھی لکھی لیکن طباعت کی نوبت نہ آئی۔ حضرت تجربات کے بعد علم و عمل میں اُصولی ربط معلوم کرتے تاکہ فن میں جان پڑ جائے اور کتاب لکھی

جا سکے۔

مہاراجہ بڑودہ کو سپاہیانہ کمالات اور مردانہ ورزشوں سے خاص دلچسپی تھی۔ حضرت کے کمالاتِ فن دیکھنے کے لئے سرکاری مہمان کی حیثیت سے آنے کی دعوت دی، لیکن معروفیتوں کی وجہ سے حضرت نے عذر فرمایا۔

(۲۲) نسبت کا پاس لحاظ | ایک دن اس ناچیز نے حضرت کی نظامتِ دارالترجمہ کے زمانے کا ذکر چھیڑا تو فرمایا۔ میری نظامت کے زمانہ میں بعض بڑے مُقدّس جمع تھے جنہوں نے عہدہ دارانِ بالا بلکہ حضور نظام تک میرے خلاف ریشہ دوانیاں کیں۔ بعض درگاہوں پر بھی حاضریاں دیتے تھے۔ لیکن میں نے جواباً سکوت اختیار کیا۔ اور صرف ضابطہ کی حد تک کارروائی کی اور اپنے اُصول پر قائم رہا۔ اِن سب پر ظاہری و باطنی ماریں پڑیں۔ دفتر میں ایک صاحب قطبِ وقت سمجھے جاتے تھے۔ ہمیشہ اُنگلی گھمایا کرتے تھے۔ اُن کو اپنی ظاہری نسبتوں پر ناز تھا۔ باطنی نسبتیں قوی تھیں۔ انھوں نے اپنے کو ناگزیر سمجھ کر استعفیٰ پیش کیا۔ میں نے منظور کر دیا۔ سبھوں نے کہا۔ اِس پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں۔ بڑا صاحبِ باطن ہے۔ لیکن خیال ہوا کہ ہم کو بھی تو اپنی نسبت غوثیہ کی لاج رکھنی ہے۔ اگر ہر ایک سے دب جائیں تو نسبت کا لحاظ، قوت اور ناز کہاں رہے گا۔ کہیں ہماری گوشمالی نہ ہو۔ اس لئے میں نے کہا۔ دگنی قوت مان کر بھی میں استعفیٰ منظور کر رہا ہوں۔ جس نسبت سے انھوں نے قوت لی ہے۔ میں نے اُسی قوت کا مزید پاس لحاظ کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوشامد پر اتر آئے اور درخواست واپس لینی چاہی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔

(۲۳) ہندو دھرم کا مطالعہ | ہندو مذہب کے متعلق بھی حضرت کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ چنانچہ رِگ وید کا اردو میں ترجمہ بھی کروایا۔ اور اُس کا مقدمہ لکھنے کے لئے مواد بھی

قولِ طیّب

اس کی اشاعت ہو لیکن موقع
مرتب فرمایا۔ ارادہ تھا کہ ترجمے کے ساتھ
بیان فرماتے کر
نہ مل سکا۔ ہندو مذہب کے متعلق بعض ایسی باریک چیزیں
بوڑھے جوگی
اچھے اچھے پنڈت سُن کر قائل ہو جاتے۔ بعض دفعہ بعض مرتاض
سادھو محض صورت
پہلی ہی ملاقات میں گرویدہ ہو گئے۔ چند موقعوں پر تو بعض
دیکھ کر فریفتہ ہو گئے۔ مشتے نمونہ از خروارے یہ کہ:۔
ایک دفعہ پروفیسر نصیر احمد صاحب کے ساتھ منمارٹ کے سامنے کے پہاڑی
قلعہ آنکا کو دیکھنے کے لئے گئے۔ جہاں دو بزرگوں کے مزار ہیں۔ جن میں
ایک جمال کہلاتے ہیں اور دوسرے جلال۔ مرہٹے عقیدت سے عرس مناتے
ہیں۔ اس پہاڑ پر ایک بوڑھا جوگی رہتا تھا۔ اس نے آپ کو دیکھا تو کہا۔ آپ
دو ہفتے میرے مہمان رہنا قبول فرمائیں۔ میں آپ کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔
مجھے ایسی بوٹیوں کا علم ہے جن سے نہ صرف اعلیٰ دوائیں
یہ پہاڑ نِرا سونا ہے۔
بلکہ سونا بن سکتا ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ میرا اور رنگ اور تمہارا اور رنگ۔
میں تو آپ میں سری کرشن جی اور بہت
اس پر اس نے کہا۔ ایسا نہیں ہے
سے دیوتاؤں کا جلوہ دیکھ رہا ہوں۔ اس دعوت میں میری غرض مضمر ہے
شمالی ہند سے جنوبی ہند کے
ایک اور واقعہ یہ کہ ایک بڑے مہاشے
سنتھوں کی زیارت کے سلسلے میں حیدر آباد آئے۔ سر اکبر حیدری وزیر اعظم نے
اُن کو اعزاز کے ساتھ گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا۔ ڈاکٹر عثمان خاں
کے سامنے وہ حضرت سے دار الترجمہ میں ملے۔ ہندو دھرم پر گفتگو چلی۔ کچھ
ہی دیر بعد انھوں نے کہا میں آپ میں وشنو اور شیو دونوں کے درشن کر رہا
ہوں حالانکہ یہ دونوں کسی ایک جگہ نہیں ملا کرتے (یعنی آپ جمال و جلال
دونوں کا مظہر ہیں)

مؤلّفہ عبد الحلیم الیاسی۔
۹۔ قولِ طیّب :۔ یعنی ملفوظاتِ حضرت مولٰنا [illegible] برنی، جس میں انسانی زندگی کے
یہ کتاب دراصل حضرت اور اِس خادم کے درمیان گفتگو کا خلاصہ ہے
تقریباً تمام شعبوں کے علمی و عملی مسائل کا حل قرآنِ کریم کی روشنی میں امتیازی شان کے ساتھ پیش ہے
یہ اپنی نوعیت، ترتیب اور جدّت کے لحاظ سے ملفوظات پر پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے جو دورِ حاضر کا
مقتضا ہے۔ ہر مکتبِ خیال نے اس کی خاص و عام افادیت، ادبیت، معنویت اور کشش کو
سراہا جو اہلِ دل، اہلِ علم حضرات کے تبصروں سے واضح ہے۔ اس میں دس فصلیں اور چار سو عنوانات
ہیں۔ دو مخیّر حضرات کی فرمائش پر طباعتِ سوم عمل میں آئی۔ صفحات ۴۵۰۔ ہدیہ ۱۲ روپے، دو ڈالر۔
۱۰۔ صراط الحمید، جلد اوّل و دوم یعنی سفرنامہ مقاماتِ مقدسہ (عراق، شام، فلسطین و حرمین
شریفین حجاز) مؤلفہ حضرت مولٰنا محمد الیاس برنیؒ کی تلخیص ہے۔ عبد الحلیم الیاسی نے جملہ آیاتِ قرآنی
اور دعاؤں کا مطلب خیز ترجمہ کیا ہے جس کی وجہ سے لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ حجاج اور زائرین میں
بہت مقبول ہے۔ رفیق اور معلّم ہے۔ معلومات میں ہر طرح جامع مستند ہے۔ اس کے پڑھنے میں
ایمان کا اطمینان اور محبت کی کشش محسوس ہوتی ہے۔ اخلاص و عقیدت کا ربط قائم ہوتا ہے۔
دو مخیّر خاتون کی فرمائش پر یہ طباعت ہوئی۔ صفحات تقریباً ۔۔۔ ہدیہ بارہ روپے۔ ڈیڑھ ڈالر۔
(۱۱ تا ۱۴) تحفۂ محمدیؐ (حصہ اوّل، دوم، سوم، چہارم) کا مجموعہ مؤلفہ مولٰنا الیاس برنیؒ۔ عبد الحلیم
الیاسی نے جملہ ۱۶۰ نعتوں پر اعراب لگا کر طلبہ کے لئے صحیح پڑھنا آسان کر دیا ہے۔ عاشقانِ رسولؐ کی
منتخب مقبول پُرکیف نعتوں کا مجموعہ ہے۔ میلاد شریف و قوالی و مدارسِ دینیات میں بہت مقبول ہے۔
طبع ہشتم۔ صفحات ۲۴۰، ہدیہ آٹھ روپیہ، ایک ڈالر۔ زیرِ طبع۔
(۱۵) جواہرِ سخن، فارسی شعراء کی نعتیہ شاعری کا بہترین انتخاب۔ صفحات ۶۰ طباعت طلب۔
(۱۶) اسلام (بزبانِ انگریزی) دین کی خالص قرآنی تفہیم آیات کے تحت۔ بطرزِ جدید جو
یورپ کی نفسیات و نقاطِ نظر کو اپیل کرتی ہے۔ طبع سوم۔ طباعت طلب۔
(۱۷) اسرارِ حق۔ زبان اردو، عربی، فارسی مؤلفہ حضرت برنیؒ۔ صدق (تصوف) پر آیاتِ
قرآنی، مستند احادیث اور اکابر صدیقین کے ارشادات اور مکتوبات کی روشنی میں ایک لحاظ سے
اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے۔ عبد الحلیم الیاسی نے فارسی عبارتوں کا تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کا اردو ترجمہ

کھلتی ہیں۔

حیدرآباد میں دو حضرات بہت ذہین، ذی علم، ماہر تقریر و تحریر ہیں۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں۔ اگر قرآن میں ختم نبوت کا مسئلہ اس قدر واضح نہ ہوتا تو ہم آپ کو ضرور نبی سمجھتے لیکن آپ کے توازن کا یہ عالم ہے کہ ہیچ غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ سے آگے نہیں بڑھتے۔ ماشاء اللہ۔

(۲۵) والدۂ محترمہؒ

حضرت کے والدین عملی عرفان کا بہترین نمونہ تھے۔ حضرت کے والدِ بزرگوار حضرت حافظ محمد ابراہیم برنی صاحب قبلہ کا قیام بسلسلۂ وکالت زیادہ تر حیدرآباد میں رہتا تھا۔ وکالت میں ولایت کی شانیں دکھائیں۔ قابلیت کا یہ عالم کہ ایک دفعہ مشہور جسٹس فضل حسین صاحب نے مثل پر لکھ دیا۔ ان کا احسان ہے کہ ہمارے ہائی کورٹ میں وکالت کرتے ہیں۔ آپ کے تربیتی خطوط کا مجموعہ اور حضرت پیر و مرشد مولانا محمد حسین صاحب قبلہ کے مکاتیبُ المعارف طباعت سے رہ گئے۔

حضرت پر آپ کی والدۂ محترمہ کی تربیت کا خاص اثر تھا۔ آپ کی والدۂ محترمہ بھی اسلامی کلچر کا ایک اعلیٰ نمونہ تھیں۔ جو چیزیں باکمال بزرگوں کے پاس بکمالِ عرفان سمجھی جائیں، وہ اُن کی روزمرّہ کی زندگی تھی۔ بہت دولت مند تھیں۔ ضرورت مندوں کی خوب دل کھول کر مدد کرتیں۔ خوب خیر خیرات کرتیں۔ وصال کے بعد نقدی کے صندوق سے ڈھائی آنے نکلے۔ برادری کی کسی تقریب میں جاتیں تو سادہ لباس پہن کر جاتیں کہ غریبوں کو احساسِ کمتری نہ ہو۔ مخالفین کی مخالفت و مذمت سے متاثر نہ ہوتیں۔ اور جب موقع آتا اُن سے ہمدردی فرماتیں۔ کبھی کوئی چیز چوری گئی اور چور کا پتہ بھی چل گیا تو چور کو پولیس میں دینا گوارا نہ کیا۔ حتیٰ کہ چور کے سامنے اس کا ذکر تک پسند نہ فرماتیں کہ وہ خود ہی شرمندہ ہے۔ کبھی فرماتیں کہ اگر

ہم اس کی ضرورت کا خیال رکھتے تو شاید اسے چوری کی نوبت نہ آتی۔ کوئی چیز خریدتیں تو مول سے زیادہ دام دے دیتیں۔ گویا روپیہ زیادہ، قدر کم، کے معاشی اصول پر عمل تھا۔ غریبوں سے خوب گھل مل کر ملتیں۔ لیکن امیروں سے آن سے ملتیں۔ ملاقات میں سادگی اور مساوات شرط تھی۔ نمائش اور تکلف سے بہت بچتی تھیں۔ اور جہاں غرور و تکبر نظر آتا اس کی سرکوبی فرضِ کفایہ سمجھتی تھیں۔ ہر فرعونے را موسیٰ پر سختی سے عمل تھا اور یہ فاروقی نسبت معلوم ہوتی تھی۔

کبھی ذکر آتا کہ فلاں عورت سے آپ نے اتنا حسنِ سلوک کیا پھر بھی وہ آپ کی برائیاں کرتی ہے، تو فرماتیں۔ اس کو مجھ سے زیادہ حسنِ سلوک کی توقع ہوگی۔ میں اس کے حسنِ ظن کے مطابق سلوک نہ کر سکی۔ اگر زیادہ سلوک کرتی تو شاید وہ ایسا نہ کہتی۔ کسی بیمار کو دیکھنے جاتیں تو ایک دو منٹ سے زیادہ نہ ٹھہرتیں، دعا دیتیں۔ غریب بیمار ہو تو رقمی امداد فرما دیتیں اور چلی آتیں۔ فرماتیں۔ ڈاکٹر یا تیماردار کے سوا دوسرے لوگوں کا مریض کے پاس ہجوم کرنا تیمارداری کے آداب کے خلاف ہے۔ کسی کا بچہ بیمار ہوتا یا کوئی بی بی حاملہ ہوتیں تو شادی بیاہ یا کسی تقریب میں دعوت دینا پسند نہ فرماتیں۔ کبھی کوئی بی بی بیمار بچوں کو لے کر آجاتیں تو اُن کو واپس جانے کا مشورہ دیتیں۔ تاکہ دوسرے بچے متاثر نہ ہوں۔ تعلقات کی ناگواری میں بات بڑھانا پسند نہ فرماتیں اور حسن و خوبی سے علٰحدہ ہو جاتیں تاکہ بدنمائی کی نوبت نہ آئے۔ بچوں کے امتحانات ہوتے تو اُن کو چھوڑ کر کسی تقریب میں نہ جاتیں کہ بچوں کے امتحان کے زمانے میں ان کے اوقات کی نگہداشت ضروری ہے۔ دستر خوان پر کھانے میں نمک مرچ کی کمی بیشی پر کوئی اعتراض کرتا تو پسند نہ فرماتیں۔ اور فرماتیں یہ بھی بڑی نعمت ہے جو نصیب ہوگئی۔ اچھا کھاؤ لیکن موٹا جھوٹا بھی دستر خوان پر آئے تو منھ نہ بناؤ۔ صاف ستھرا پہنو، گھر کو صاف رکھو۔

لیکن اگر کبھی میلے کچیلے ماحول میں بھی گزر کرنا پڑے تو اس کو کسرِ شان مت سمجھو۔ سُنّت کی تعمیل میں کبھی بچوں کو پیوند لگے کپڑے پہناتیں اور موٹا کھلاتیں۔ کبھی ہاتھ سے کام کرنے کو فرماتیں۔ ایک بی بی نے کہا ہم شادیوں میں جاتے ہیں تو چاندی کا جوتا مار کر ملتے ہیں۔ یعنے تحفے تحائف دے کر ممنون کرتے ہیں۔ فرمایا۔ ایسا احسان دھرنا اوچھا پن ہے۔ عزیزوں کا احسان ہے کہ ہمارا تحفہ قبول کریں۔ حضرت نے فرمایا۔ ہمارے گھر میں ایک بڑی بی ملازم تھیں۔ انھوں نے ہم سب بچوں کی بہت خدمت کی تھی۔ آخر عمر میں بیمار پڑیں۔ فرمایا۔ اس نے میرے بچوں کی بہت خدمت کی ہے۔ اس کے احسان کا کچھ بدل یہی ہو سکتا ہے کہ میں خود اپنے ہاتھ سے اس کی تیمارداری کروں۔ غلاظت دھوؤں۔ چنانچہ مرتے دم تک خدمت کی اور کسی کو اس میں شریک نہ کیا۔

ہر وقت حضرت خاتونِ جنّتؓ کے عشق میں مگن رہتیں۔ جب لہر آتی۔ چکّی پیستیں، جَو کی روٹی بناتیں۔ اور کڑوں بیٹھ کر مرچ کے ساتھ کھاتیں۔ حضرت امام حسینؓ کی جناب میں عجیب والہانہ محبت و عقیدت تھی۔ محرم شریف کی فاتحہ بہت اہتمام سے کرتیں۔ ایک دفعہ فرمایا۔ ہم تو لونڈی غلام ہیں۔ ہمارا آقا کو یاد کرنا فطری ہے لیکن آقا یاد فرمائیں تو ہماری سرفرازی ہے۔ چنانچہ عالمِ شہادت میں زیارت سے سرفراز ہوئیں۔ ماشاء اللہ۔

(۲۶) حضرت کا وصال

حضرت نے شبِ دوشنبہ ۱۶ رجب ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء بمقام بلند شہر (یو۔پی) اس عالم سے رحلت فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ قبل ہی حضرت کو اس عالم سے روانگی کے متعلق کچھ اشارے مل چکے تھے۔ چنانچہ کبھی باتوں باتوں میں کچھ فرما دیتے جس پر میں آبدیدہ ہو جاتا لیکن صحت و قوت ماشاء اللہ ایسی تھی کہ بظاہر

وفات ۲۸ شعبان ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۹/۱۱/۱۹۹۹ء

یہ اندازہ ہوتا تھا کہ حضرت قبلہ سَو برس تک تو بآسانی عمر پائیں گے۔ یوں تو عمر بھر حضرت کو خدمتِ دین کے کاموں اور تصنیف و تالیف میں مشغولیت رہی۔ لیکن آخر زمانے میں دین کے جو کام ہاتھ پر تھے اُن کی عجلت سے تکمیل کی طرف خاص توجہ معلوم ہوتی تھی۔

گڈوِل مِشن

حضرت کی انگریزی کتاب "اِسلام" یورپ۔ امریکہ۔ افریقہ میں مفت تقسیم ہوئی۔ بڑے بڑے اہلِ علم اس سے متاثر ہوئے۔ ملاقات کا اِشتیاق بڑھا تو حضرت نے اِسلام کا خیرسگالی وفد (گڈ وِل مِشن) لے جانا طے فرمایا۔ اِس علمی سفر میں ڈاکٹر سید عبد اللطیف پروفیسر
اور اس خادم کو ساتھ لے جانے کا
انگریزی
خیال ظاہر فرمایا۔ افسوس کہ بہت جلد وصال ہو گیا اور یہ منصوبہ عملی شکل اختیار نہ کر سکا

تقریباً چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے سے حضرت کی خدمت میں بہت سے خاص خاص عقیدت مندوں کی مسلسل حاضریاں رہتیں۔ بہتوں کا تقاضا بلکہ اصرار رہا کہ حضرت بیعت میں داخل فرمائیں لیکن حضرت کا رجحان یہ تھا کہ افادۂ تعلیم و تلقین میں عمومیت کا پہلو رہے اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے تعلیم عام رہے لیکن وفات سے دو سال قبل حضرت نے فرمایا۔ اب قلب آمادہ معلوم ہوتا ہے کہ بیعت لے لی جائے۔ چنانچہ
مولوی عبد الخالق خاں صاحب، مولوی غلام دستگیر صاحب رشید، مولوی احمد حسین خاں صاحب اور اس ناچیز کو بفضلہ بیعت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔ الحمد للہ

دسمبر ۱۹۵۸ء کے آخری ہفتہ میں حضرت کو بلند شہر سے اپنی چھوٹی ہمشیرہ صاحبہ کی علالت کا تار ملا۔ موصوفہ جناب مولوی سید حسن برنی ایڈوکیٹ بلند شہر کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ سید صاحب کا اپنے وقت کے ممتاز وکلاء میں شمار ہوتا تھا۔ ذکاوت، ذہانت، علم و فضل کے لحاظ سے علمی حلقوں میں بہت معروف تھے۔ فنِ

تاریخ پر بڑا عبور تھا۔ جب مرکزی حکومتِ ہند میں انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی معتمدی پر تقرر کا سوال پیدا ہوا تو اسی مناسبت کی بناء پر حکومتِ ہند کی نظرِ انتخاب آپ پر پڑی اور آپ کا تقرر بحیثیت سکریٹری عمل میں آیا۔ جب کبھی آپ کا ذکر آتا حضرت خاص محبت سے ذکر فرماتے تھے۔ ہمشیرہ صاحبہ کو دیکھنے کے لئے حضرت ۳۱ر ڈسمبر ۱۹۵۸ء کو شام کی کار ٹی سے بعزمِ بلند شہر حیدرآباد روانہ ہوئے۔ بڑی صاحبزادی صاحبہ سفر میں ساتھ تھیں۔ بلند شہر میں حضرت نے اپنے والدِ بزرگوار اور منجھلے بھائی مولوی محمد اسحٰق برنی مرحوم منصف نظام سرکار کے مزارات پر حاضری دی۔ حضرت کے بڑے بھائی حضرت حافظ محمد اسمٰعیل برنی سابق ناظمِ عدالت حیدرآباد، جو بڑے ذاکر شاغل بزرگ تھے۔ اس وقت خورجہ میں مقیم تھے۔ ممدوح کی علالت کی خبر سن کر عیادت کے لئے حضرت بلند شہر سے اپنے ننہالی وطن خورجہ تشریف لے گئے۔ اپنی والدہ محترمہ کے مزار پر حاضری دی۔ اور پختہ مزار بنوایا۔ وہاں سب بڑے چھوٹے پرانے ملاقاتیوں سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ وہاں حضرت کی طبیعت کچھ ناساز ہوگئی۔ لیکن بلند شہر واپسی پر مزاج رُو بہ صحت ہوگیا۔ اور حیدرآباد واپسی کی تیاری تھی۔ ۲۵ر جنوری کو دن میں حضرت نے اصلاح بنوائی غسل فرمایا۔ نئے کپڑے زیبِ تن فرمائے۔ اور شام میں خاندان کے بچوں، نوجوانوں، بزرگوں کے ساتھ ہنستے بولتے رہے۔ اس کے بعد آرام فرمایا۔ دو بج کر چند منٹ پر بیدار ہوئے جو عموماً تہجد کا وقت تھا۔ بڑی صاحبزادی بیدار تھیں۔ وقت دریافت فرمایا۔ اس کے بعد انگلیوں پر کچھ پڑھتے رہے کہ نظریں ایک طرف لگ گئیں کہ گویا کسی کی دید ہے۔ دو تین ہلکی ہلکی ہچکیاں لیں اور اللہ، رسولؐ کی جناب میں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ تجہیز و تکفین کے بعد جب مزار مبارک میں اُتارا گیا اور رُونمائی کے لئے چادر ہٹائی گئی۔

تو ایک صاحب نے دیکھا کہ کفن پر جو عطر پاشی کی گئی تھی اُس سے سینۂ مبارک کے مقام پر۔ "اللہ محمدؐ" کے کلمات نمایاں ہیں۔ انھوں نے ایک دوسرے صاحب کو اشارہ کیا۔ یہاں تک کہ سب حاضرین نے اس کا مشاہدہ کیا، زیارت کی۔ ناچیز نے جب بشارت و سرفرازی کا یہ واقعہ سُنا تو بے اختیار زبان پر حضرتؒ کا یہ شعر جاری ہوگیا۔

اللہ و رسولؐ اللہ ملنے کی ہے کیا صورت
برنیؔ تو ہے دیوانہ، دیوانے کو کیا کہیئے

سَلَامٌ عَلٰٓی اِلۡ یَاسِیۡنَ (۳۷ ع ۱۳۰) (الیاس پر سلام ہو) ۔ حضرت کا مزار اپنے خاندانی باغ میں ہے جو کلکٹر کے بنگلہ قدیم سے متصل واقع ہے۔

(۲۷) سلسلۂ اِلۡ یَاسِیۡن

برنی نامہ حصۂ اوّل میں حضرت پیر و مرشد مولانا محمد حسین صاحب قبلہؒ کے مکتوب کا اقتباس مورخہ ۱۱ر خورداد ۱۳۴۳ف ملاحظہ ہو۔

"میری دعا ہے کہ آپ کے فیضِ ولایت سے سارا عالم فیض یاب ہو۔ بہ قیام خانوادۂ الیاسیہ، علومِ الٰہیہ کی تبلیغ مقتضائے وقت کے مطابق ہو۔ الحمد للہ کہ اس کے آثار مختلف اعتبارات سے نمایاں ہو رہے ہیں۔"

ایک صاحب نے خواب دیکھا اور حضرت برنی صاحب قبلہ سے بیان کیا۔ اکابر اولیاء اللہ کا ایک بڑا مجمع ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا۔ برنی صاحب کو خاص خاص آیاتِ قرآنی اور اورادِ قرآنی عطا ہوں گے جن کو یہ اپنی صوابدید سے تقسیم کریں گے۔ کسی نے سوال کیا۔ برنی صاحب کے سلسلے کا کیا نام ہوگا۔ جواب ملا۔ یوں تو یہ سلسلہ قادری چشتی رہے گا۔ لیکن سلسلۂ الیاسین شمار ہوگا۔ جماعت کے استفاضہ کا طریق سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلۡ یَاسِیۡن۔ کا وظیفہ ہوگا (یعنی الیاسین پر سلام ہو)۔ وَالسَّلَام۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

سارے عالم کو خطبہ سنایا کریں ؛ سرِ توحید سب کو بتایا کریں

رب تو رب ہے مگر عبد بھی کون ہے ؛ کیا رسالت کی شان ہے سمجھایا کریں

مری آنکھوں کا نور، مرے دل کا سرور

مری روح کی راحت رسولِ کریمؐ

دین کے نام سب کچھ لٹایا کریں ؛ وقت پر دین کے کام آیا کریں

یوں تو دنیا بھی لازم ہے عقبیٰ کے ساتھ ؛ پر جو حکمت کی منشا ہو پایا کریں

مری آنکھوں کا نور، مرے دل کا سرور

مری روح کی راحت رسولِ کریمؐ

نقشِ باطل جہاں سے مٹایا کریں ؛ نعمتِ حق کا سکہ بٹھایا کریں

ہے جو رحمتِ رب اور رءوف رحیم ؛ اُس کی آمد کی خوشیاں منایا کریں

مری آنکھوں کا نور، مرے دل کا سرور

مری روح کی راحت رسولِ کریمؐ

(حضرت مولانا الیاس برنیؒ رحمۃ اللہ علیہ)

سلسلۂ دعوتِ صدق - قرآن منزل - حیدرآباد - انڈیا

پروفیسر حضرت مولانا محمد الیاس برنی رحمۃ اللہ علیہ اور محمد عبدالحلیم الیاسی کے

تصنیفات - تالیفات - تراجم -

۱- **شعبۂ اسلامیات**:- (۱) اشاراتِ علومِ کلمۃ الطیبہ - قرآنی علمِ صدق (تصوف) کا
خلاصہ بیک نظر مرتبہ مولانا محمد الیاس برنیؒ۔ ہدیہ ۴ ڈالر روپیہ ۲۵ سینٹ
(۲) قرآنِ مجید رومن - تین کالم میں (عربی متن - رومن خط - انگریزی ترجمہ محمد پکتھال) عبدالحلیم الیاسی نے
مکمل عربی قرآن کو قرأت و تجوید کے اصول پر ۱۹۷۸ میں نہایت آسان طریقہ پر رومن خط میں لکھا جو لوگ
عربی خط بالکل نہیں پڑھ سکتے یا غلط پڑھتے ہیں اُن کے لئے صحیح پڑھنا آسان کر دیا گیا ہے۔ قرات و تجوید کے
ماہرین (کوالالمپور ملیشیا اور سعودی عرب جدہ کے مقابلۂ قرأت کے جج) اور رابطۂ عالمِ اسلامی سعودی عرب کے
ڈائرکٹر جنرل و نمائندہ برائے اقوامِ متحدہ اور دیگر مشاہیرِ عالم نے اِس خدمت کی داد دی اور اس کو تعلیمی و تبلیغی
نقطۂ نظر سے دورِ حاضر کا قابلِ فخر کارنامہ قرار دیا۔ سعودی عرب کے (WAMY) وامی۔ ریاض نے ہزارہے
زائد قرآن لے کر تمام ممالکِ عالم میں مفت ہدیۃً تقسیم کئے جس کا شکریہ واجب ہے۔ اس کے انٹروڈکشن میں
انسانیت کے تمام مسائل کا حل آیاتِ قرآنی میں قابلِ ملاحظہ ہے تاکہ ہر مذہب کا پیرو ہر عنوان پر قرآن مجید کی
تعلیمات اور اپنی اصلی بنیادی کتاب کی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ کرکے آئندہ مذہب کا فیصلہ کرے۔
ہدیہ: ۷۰ روپیہ ۱۰ ڈالر علاوہ ڈاک و پیک۔

۳- **مشکوٰۃ الصلوات**:- قرآنی صلوٰۃ و سلام (یعنی درودوں) کا تحقیقی نادر مجموعہ۔ مؤلفہ مولانا
الیاس برنیؒ بزبانِ عربی۔ جامع وسیع تالیف۔ بطرزِ خاص جدید جلد سات حزب جن میں تین حزب خاص
قرآنی ہیں۔ چوتھا حزب احادیثِ ماثورہ پر مبنی ہے۔ آخر تین حزب میں حضرت غوثِ اعظمؒ حضرت شیخ اکبر
ابنِ عربیؒ اور دیگر اکابرؒ کے بہترین قرآنی درودوں کا عطر و نچوڑ ہے۔ بفضلہٖ انتہا مقبول کئی تیرہ ۱۳ ایڈیشن
ختم ہو گئے۔ تلاوتِ قرآن کے بعد ربط و محبتِ رسولؐ پیدا کرنے کے لئے درود و سلام و نعت کا شغل
ازروئے قرآن مقبول طریق ہے۔ حسین دیدہ زیب ٹائپ۔ صفحات ۱۷۰۔ طباعت طلب۔

ایک اور واقعہ یہ کہ بیگم بازار۔ حیدرآباد کے سناتنی مٹھ میں آل انڈیا سناتن دھرم کانفرنس ہوئی۔ باہر کے چند پنڈت اور پروفیسر گھر پر حضرت سے ملنے آئے حضرت کی گفتگو سن کر بے حد معتقد ہوگئے اور آپس میں کہا۔ اگر کرشن بھگوان سے ملنا چاہتے ہو تو اِن سے ملا کرو۔ اِس درجے متاثر ہوئے کہ اصرار کرکے پروگرام کے خلاف اچانک حضرت کی تقریر آتما وِدیا کے موضوع پر اسی کانفرنس میں رکھائی۔ آپ نے آتما وِدّیا کے متعلق ہندو مذہب ہی کا نقطۂ نظر بیان فرمایا۔ اِس تقریر سے لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ بعض اٹھ کر حضرت کے قدموں پر گر پڑے۔ صدرِ جلسہ راجہ دھن راج نے اپنی تقریر میں کہا کہ برنی صاحب نے تو آج ہم سب کو اپنا چیلا بنا لیا۔ جے پور کالج کے پرنسپل ایک بڑے مہا تتے بھی اس جلسہ میں شریک تھے انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارا بڑے سے بڑا پنڈت بھی آتما وِدیا اور ہندو دھرم کے متعلق برنی صاحب سے زیادہ معلومات نہیں دے سکتا۔

ایک اور موقع پر انگریزی کے ایک ہندو پروفیسر نے تعجب سے پوچھا کہ جب آپ ہندو دھرم کے متعلق اتنا وسیع علم رکھتے ہیں تو آپ مسلمان کیسے ہیں۔ فرمایا۔ محمّدی (مسلمان) بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس کا علم بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ عبدیت اسلام کی خصوصی تعلیم ہے جس میں انتہائی رفعت ہے، وسعت ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ مطلق میں غرق ہوں اور لاتعیّن کی عبادت کریں، نہ کہ تعیّن کی، تقیّد کی۔

(۲۴) جھوٹی نبوّت

فرمایا۔ معاملہ محض فضل پر ہے کہ ہم محفوظ ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب نے تو مشکوک، غیر یقینی خوابوں پر اپنی نبوّت کی بنیاد رکھی۔ یہ قادیانی اور وہابی اپنی حمایت میں جو دلائل لاتے ہیں، اُن سے کہیں زیادہ قوی دلائل کی آیتیں اُن کے نقطۂ نظر کے لحاظ سے يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا (پ۱) کے تحت رسول اللہ صلعم اور اولیاء اللہ کے خلاف ہم کو ملتی ہیں۔ جن کو اگر ہم پیش کریں تو وہ ہمارے ممنون بلکہ متّبع ہو جائیں گے۔ لیکن معاملہ فضل پر ختم ہوتا ہے اور ہم پر يَهْدِي بِهِ كَثِيرًا (پ۱) کی شان

۴۔ مِشکوٰۃُ الصّلوٰات (تین کالم میں عربی، رومن اور انگریزی ترجمہ) عبدالحلیم الیاسی نے خصوصاً یورپ، امریکہ کے لئے اور عموماً انگریزی دانوں کے لئے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اور عربی متن کو رومن خط میں قرأت کے اُصول پر لکھ دیا تاکہ پڑھ بھی سکیں۔ اب تک یورپ کی کسی زبان میں قرآنی دُرود کی کتاب نہ تھی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی قرآن کے مُفسّر و مُترجم (بزبان انگریزی و اُردو) ایڈیٹر صِدق لکھنؤ نے حقائق و دقائقِ محمّدی کو انگریزی ترجمہ میں دیکھ کر حیرت کی اور مبارکباد دی۔ نیز رابطۂ عالم اسلامی کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر احمد محمّد وغیرہ نے اس خدمت پر قدردانی، پسندیدگی کا اظہار کیا۔
حدیہ دس روپے۔ ڈیڑھ ڈالر۔

۵۔ مِشکوٰۃُ الصّلوٰات (عربی متن کے مقابل انگریزی ترجمہ) از عبدالحلیم الیاسی۔ صفحات ۲۷۰، حدیہ چار روپے۔ آدھا ڈالر۔

۶۔ مشکوٰۃُ الصّلوٰات (عربی کا اُردو ترجمہ) از عبدالحلیم الیاسی۔ صفحات ۲۰۰، حدیہ پانچ روپے، ۶۵ سنٹ جلد طباعت کی اُمید ہے۔

۷۔ حِزبُ اللہ (یعنی بیش خالص قرآنی وظیفوں کا مجموعہ حِزبُ البحر کے نمونہ پر۔ (مؤلّفہ مولانا الیاس برنیؒ بزبانِ عربی۔ مُترجمہ عبدالحلیم الیاسی بزبانِ اُردو) برائے مدافعتِ ذاتی۔ خاتمۂ فساد و فتحِ حق۔ عالمِ اسلام کے انفرادی و اجتماعی مُشکلات کے حل کے لیے وکالت بھی پڑھیں۔ طبع ششم۔ صفحات ۴۰، حدیہ ایک روپیہ۔ سینٹ ۲۵۔

نوٹ:۔ انگریزی میں ترجمہ کرکے اِنشاءاللہ عربی، رومن، انگریزی اُردو کے ساتھ ساتھ رومن خط میں بھی اِسے لکھ دیا گیا ہے۔ عنقریب شائع کیا جائے گا۔

۸۔ تسہیلُ التّرتیل، بزبانِ اُردو عربی۔ مؤلّفہ مولانا الیاس برنیؒ۔ فنِ قرأت پر تفہیم جدید جسے پڑھ کر قرأت آسان معلوم ہوتی ہے اور ذوق شوق پیدا ہوتا ہے۔ صفحات ۲۲۸ طبع سوم۔
دالعرفان لال ٹیکری حیدرآباد سے ملتی ہے۔　　　حدیہ: چھ روپے۔ ایک ڈالر۔

کر کے طبع دوّم شائع کیا تھا جو ختم ہو گیا۔ صفحات ۴۰۰ طبع سوم طباعت طلب۔

(۱۸) مَعْرُوضہ: حضرت کا عرفانی کلام۔ بلاک میں تاج کمپنی لاہور سے شائع ہوا۔ صفحات ۱۳۰ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

(۱۹) فُتوحُ الحِکَمْ: حضرت غوث اعظمؓ کے غیر مطبوعہ ارشادات کو حضرت نے بڑی تحقیق سے جمع فرمایا۔ طبع نہ ہو سکا۔

(۲۰) فتوحاتِ قادریہ: حضرت غوثِ اعظمؓ کے تمام اذکارؔ اَوْرادؔ اَدْعِیہ اور وظائف خاص تحقیق سے فراہم کئے طبع نہ ہو سکی۔

(۲۱) سُلطانُ مُبِیْن۔ حضرت غوث اعظمؓ کی حیاتِ بابرکات خاص تحقیق سے مرتب ہوئی۔ طبع نہ ہو سکی۔

(۲۲) مکاتیبُ المُعارِف: حضرت کے پیر و مُرشِد مولنا شاہ محمد حسینؒ کے عرفانی خطوط کا عجیب مُرقّع۔ طباعت طلب۔

(۲۳) تربیتی خطوط کا مجموعہ: حضرت کے والدِ ماجدرحؒ کے خطوط طباعت طلب

(۲۴) مالِکُ المُلک: بزبانِ اُردو عربی۔ حکمتِ ربّانی کا خاکہ۔ طبع نہ ہو سکا۔

(۲۵) اسپریچوئل کلچر اِن اسلام: بزبان انگریزی۔ طبع نہ ہو سکی۔

(۲۶) ہدایتُ الاِسلام: جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے اسلامی عبادات، تقریبات کے تمام اَدْعیہ مع ترجمہ بترتیب خاص جمع ہیں۔ طبع نہ ہو سکی۔

۲۔ شعبۂ اَدَبیات (اُردو۔ ہندی۔ سنسکرت)

(۲۷ تا ۲۸) مُنتخباتِ نظمِ اُردو۔ بارہ جلد۔ معارِفِ مِلّت چار جلد۔ جذباتِ فِطرت۔ چار جلد۔ مَناظرِ قُدرت چار جلد۔ دو سو شُعرا کا کلام۔ ڈیڑھ ہزار نظمیں۔ یہ انتخاب اُردو زبان کی گولڈن ٹریژری سمجھا جاتا ہے۔ کلام کیا ہے۔ دل کی کہانی، شاعروں کی زبانی۔ ملک میں بے انتہا مقبول۔ صفحات ۱۸۰۰ طبع ہفتم، طباعت طلب۔

(۲۹) اُردو ہندی رَسْمُ الخط: اُردو ہندی رَسْمُ الخط کا مُطالعہ و مُقابلہ علمی و فنّی لحاظ سے اہلِ علم کے لئے قابلِ دید ہے۔ صفحات ۱۰۰ طبع دوم، طباعت طلب۔

(۳۰) بَرَنی نامہ حِصّہ اول و دوّم: حضرت برنیؒ کے حالات، تعلقات، تالیفات و تراجم ضَمیمۂ صِراطُ الحمید کے ساتھ طبع دوّم میں اِنشاءاللہ پیش کئے جائنگے۔

(۳۱) رِگ وید: سنسکرت سے اُردو میں ترجمہ مکمل تیار ہے۔ طباعت نہ ہو سکی۔

۳۔ شعبۂ قادِیانیات:

(۳۲) قادیانی مذہب: مؤلّفہ الیاس برنیؒ۔ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کی قادیانیت کا علمی مُحاسبہ۔ قادیانی تحریک کا مُرقّع۔ قادیانی عقاید و اعمال، مکر و فریب کی عبرت ناک مُستند کتاب جو قادیانیت کی قاموس (اِن سائیکلو پیڈیا) تسلیم کی جاتی ہے۔ طبع ششم، بڑی تقطیع ہزار صفحات۔ محمد اشرف تاجر کتب۔ لاہور سے ملتی ہے۔ اِتنی شہرت کہ طبع ہفتم کی مانگ ہے۔

(۳۳) مُقدّمہ قادیانی مذہب۔ صفحات ۳۰۰ محمد اشرف لاہور سے ملتی ہے۔

(۳۴) تتمّہ قادیانی مذہب۔ طباعت طلب۔

(۳۵، ۳۶) قادیانی قول و فعل حِصّہ اوّل۔ خلاصہ قادیانی مذہب، صفحات ۴۰۰ حِصّہ دوم صفحات ۲۰۰، تاج کمپنی لاہور سے ملتی ہے۔

(۳۷) قادیانی موومنٹ: بزبانِ انگریزی طبع دوم۔ مسٹر مکّی پروپرائیٹر مُسلم ڈائجسٹ، ڈربن جنوبی آفریقہ نے رایل آرٹ پیپر پر بہت حسین مُصوّر دس ہزار نسخے شائع کئے اور تمام دُنیا میں تقسیم کئے تھے۔ طبع سوم طباعت طلب۔

(۳۸) قادیانی اَلبَم: حضرت کے پانچ مضامین کا مجموعہ جو علیحدہ طبع ہو کر مفت تقسیم ہوئے تھے۔ طبع دوم طباعت طلب۔

(۳۹) اَلدِّیانَۃُ القَادِیَانِیَۃ: کِتاب قادیانی مذہب کا بزبان عربی ترجمہ از مولنا عبدُالقدُّوس ہاشمی تیار ہے۔ طباعت طلب۔

(۴۰) آئینہ قادیانیت: مؤلفہ عبدالحلیم الیاسی۔ اس کتاب میں مرزا غلام احمد قادیانی صاحب اور قادیانی تحریک کے خد وخال خود مرزا صاحب اور قادیانی اکابر کی تحریروں کے آئینہ میں دکھائے گئے ہیں۔ گویا دریا کو کوزہ میں بھر دیا ہے۔ طبع دوم۔ طباعت طلب۔

(۴۱) قادیانی چال بازی: مؤلفہ الیاس برنیؒ۔ اِس مختصر میں قادیانی چالاکیوں، چال بازیوں کو نہایت خوبی سے اُنھیں کی تحریرات سے واضح کیا گیا ہے، عبرت ناک ہے۔

(۴۲) قادیانی چکّر حِسن بسوِ تیشوؔ، مؤلفہ حضرت برنیؒ۔ اِس میں چن بیشو یشور تحریک کی قادیانیت کو اُنھیں کی تحریرات سے واضح کیا گیا ہے۔ طبع پنجم طباعت طلب۔

۴۔ شُعبۂ معاشیات (مطبوعاتِ عثمانیہ یونیورسٹی)

(۴۳) عِلمُ المَعِیشَت: معاشیات کے اُصول وضوابط۔ خاص تصنیف۔ بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم۔ یہ اُردو میں پہلی کتاب ہے اور ہر لحاظ سے مکمّل۔ صفحات ۸۰۰۔ بڑی تقطیع۔

(۴۴) مَعِیشَتُ الہِند: تصنیف۔ ہندوستان کے حوالہ سے عملی پہلو پیش کیا گیا ہے۔ صفحات ۹۰۰

(۴۵) اُصولِ معاشیات، صفحات ۶۰۰ (۴۶) مُقَدِّمَۃُ المَعاشِیات: صفحات ۴۵۰

(۴۷) معاشیاتِ ہند، صفحات ۴۰۰ (۴۸) برطانوی حکومتِ ہند: صفحات ۲۵۰

(۴۹) مالیات: صفحات ۵۰۰

(۵۰) تا (۵۵) اِن کے علاوہ ۶ متفرق کتابیں تحریر فرمائیں۔

حضرت نے تمام دُنیا میں شعبۂ اسلامیات اور شعبۂ قادیانیات کی ہزارہا کتب زیادہ تر مُفت تقسیم فرمائیں۔

(ملنے کے پتے)

(۱) قرآن منزل ۸-۱۶۷-۶-۱۷ روبرو مسجد پیر پاشا۔ دبیر پورہ، حیدرآباد ۲۳ انڈیا۔

(۲) چار مینار اور مچھلی کمان، حیدرآباد کے کتب فروش (۳) محمد علی روڈ کے تاج آفس بمبئی اور دیگر کتب فروشوں سے

(۴) نذیر بک سیلر۔ ٹپرپٹ ٹی کین۔ مدراس (۵) جامع مسجد دہلی علاقہ کے کتب فروش۔

فلسطین تا حجاز

معجزہ گر نیست کرامات ہست

بیتُ المُقدَّس سے روانگی کے موقع پر عجب معاملہ پیش آیا۔ گرچہ راست حجاز جانا مقصود تھا تاہم مصر سے گزرنا لازم تھا۔ بندرگاہ پورٹ سوئز سے حجاز جانے کو جہاز ملتا ہے اِس لئے پاسپورٹ کی توثیق کے لئے روانگی سے دو دن قبل مصری کونسل خانہ گئے۔ ہزاکسلنسی کونسل بوجہ علالت دو ہفتہ سے رخصت پر تھے۔ اُن کے نائب آنریبل چانسلر سے ملاقات ہوئی۔ یہ معلوم ہوا کہ قوانینِ نافذہ کے لحاظ سے ہم کو فی کس بیس پونڈ یعنی اندازاً تین سو روپے بطورِ ضمانت جمع کرنے لازم ہیں جو بعد فراغتِ حج واپس مل جائے گی۔ قانون دیکھا تو بے شک صاف و صریح تھا۔ عجب حیرانی ہوئی۔ کوئی سبیل نہ ہو سکی۔ رُکاوٹ سی پیدا ہو گئی۔ دوسرے دن پھر کونسل خانہ گئے اور یہ آخری دن تھا۔ اگر اُس روز معاملہ طے نہ ہوتا تو پھر جہاز ہاتھ سے نکل جاتا۔ ہم مدینہ منورہ جلد از جلد پہنچنے کے واسطے بیتاب تھے۔ ہر وقت وِردِ زبان تھا۔ ع۔ مُولا بجلد بلا لو مدینے ہیں۔ بظاہر قانوناً ضمانت داخل کرنا لازمی تھا لیکن ہم کو ضمانت داخل کرنا منظور نہ تھا۔ اگلے روز ہی روانہ ہونا مقصود تھا۔ ہمارے میزبان حیران متفکر تھے ؎

مَلکُ الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں
سر بسجدہ ہے مسیحا کہ مری بات رہے

جب اُنھوں نے بار بار تردّد ظاہر کیا تو بیساختہ زبان سے نکل گیا کہ ہم بعد لوٹ شریف مدینہ منورہ جا رہے ہیں۔ ہم کو کیا فکر ہے۔ بھیجنے والا جا بجا یا بلانے والا جانے۔ ہر صورت دوسرے روز اوّل وقت کونسل خانہ پہنچے۔ سُبحان اللہ عجب آثار نمودار ہوئے۔ بلا کسی توقع کے اچانک ہزاکسلنسی پہنچے کہ کونسل خانے والے بھی حیران ہو گئے۔ تشریف لاتے ہی ہماری یاد ہوئی۔ خود بخود بہت توجہ و عنایت ہوئی بلکہ خاطر مدارات بھی ہوئی۔ تخلیہ ہوا۔ ہزاکسلنسی اور آنریبل دو نوبت فکرمند تھے کہ کیا کریں۔ کافی غور و خوض کے بعد یہ قرار پایا کہ اسی وقت بصیغۂ راز کونسل بذریعہ ٹیلیفون خود حکومتِ مصر سے مشورہ کریں۔ چنانچہ بیتُ المقدس سے قاہرہ کو ٹیلیفون لگا۔ کونسل اور وزیر داخلہ دیر تک بحث کرتے رہے۔ کونسل نے ہماری حد درجہ تائید اور حمایت کی۔ نتیجہ یہ کہ بطورِ خاص ہمارے واسطے استثنیٰ کے احکام بصیغۂ ضروری ٹیلیفون کے ذریعہ حاصل ہو گئے۔ اور اِس شرط کے ساتھ کہ استثنیٰ کسی کے واسطے نظیر نہ ہو گا۔ ہزاکسلنسی کونسل صاحب اور آنریبل چانسلر نے اپنی کامیابی پر ازحد شاداں و نازاں تھے۔ اور چونکہ سراسر بعید از توقع تھی اِس کو حسنِ نصیبی بتاتے تھے۔ بہرحال اُس وقت بلا ضمانت ہمارے پاسپورٹوں کی توثیق ہو گئی۔ جونہی ہماری کارروائی سے فراغت ہوئی ہزاکسلنسی کونسل ناسازیِ مزاج کا عذر کر کے تشریف لے گئے اور آنریبل چانسلر متحیر رہ گئے بلکہ اظہارِ عقیدت کرنے لگے۔ حضرت نے بھی مبارکباد دی کہ جو صورت ناممکن نظر آتی تھی ممکن ہو گئی۔ اب تک کوئی نظیر ایسی نہ تھی۔ ہمارے میزبان مولوی ناظر الحسن انصاری، شیخ ہندی زاویہ، بیتُ المقدس تو سراپا غرقِ حیرت تھے۔ گرچہ بہت ذی اثر اور واقفکار تھے۔ تاہم جو کچھ اُنھوں نے آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا اُس کو سراسر کرامت کہتے تھے۔ چنانچہ دوسرے ہی روز خدا کے فضل سے وہ سلسلۂ قادریہ میں داخل بھی ہو گئے۔ والحمدُللہ۔

مصری کونسل خانہ میں جو آثار ظاہر ہوئے وہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا۔ اور کُل سفر میں جا بجا و قتاً فوقتاً حسبِ موقع فضل کے آثار برابر ظاہر ہوتے رہے اور ہمارے ایمان کو تقویت پہنچاتے رہے۔ وَالحَمدُ لِلّٰہِ حَمداً کَثِیراً۔ تاہم انجام ظاہر ہے ہزاکسلنسی کونسل اور آنریبل چانسلر کا شکریہ ہر طرح واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ آمین۔